عملیات کی دنیا

عمران ناگی بی-اے

فہرستِ عنوانات

تابوت کا قیدی 04

زمیدار جو عامل بن گیا 14

حسین چمارن اور ٹھاکر 23

جنگلی جنات اور باباجی 29

مندر، شکتی اور مسان 36

بہن کا بیوپاری 48

جانگلی وال کی چڑیلیں 59

ہانڈی وار 71

مال پور کے سیوک 77

شاہ نیپال کے دربار میں 86

وہ شاہ نلوہ کی بیوہ تھی 90

شاہ نیپال پر جادو 94

کالے کبوتروں کا ایک من خون 101

حصار 105

پدمنی کا پیار 108

پدمنی کا پہلا وار 117

گاؤں کے وارث مہاجر بن گئے 124

لڑکیاں جو مندروں میں لیجائی گئیں 130

آیت کریمہ کی برکت 135

دریائے راوی کے کنارے گناہ 138

میاں جی کی کرامات 145

میں باغی ہوں 150

اندھیری منگل 154

شاہ ایران کا عامل 159

بھولو پہلوان کے کہا تھا 161

جہاں عامل چلہ کاٹتے ہیں 165

استاد مراد کا راز 171

ماش کر گڑیا 174
جادو کی گڑیا نے ڈس لیا 180
سندھ میں کالے عاملوں کی مجلس 186
بچے جو کالے جادو سے پیدا کئے گئے 191
سفلی عامل ننگے ہو جاتے ہیں 194
کالی ناتھ شیرازی کے طلسمات 198
باپ نے بیٹی جن کے حوالے کر دی 209
عملیات کی دنیا میں پہلا قدم 214
ہمزاد کی تلاش 218
دھن کی تپسیا عمل 220
بندر عباس کا پراسرار سادھو 223
جوان بدن کی مہک 225
شیطانوں کا استھان 229
قرآنی وظائف 238

تابوت کا قیدی

چلتے چلتے میاں جی نے گھمبیر لہجے میں مجھے ایک بار پھر سمجھایا تھا۔

"ناگی پتر! تیرا علم ابھی کچا ہے۔ تو ضد کر کے جا تو رہا ہے لیکن میرے بچے ذرا پائوں جما کر رہنا۔ حرامزادی بچھل پیری ہے۔ وہ کسی روپ میں تمہارے سامنے اور پیچھے سے تجھے دھوکہ دے سکتی ہے۔ اس کا بھروسہ نہ کرنا......اور ہاں۔ میں نے تجھے جس جگہ پر بیٹھنے کو کہا ہے وہیں پر بیٹھنا۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ تیرے دادا بھی وہاں بیٹھ کر چلہ کاٹا کرتے تھے "......

استاد مراد نے بھی مجھے کہا تھا۔

"مجھے ساتھ لے چلو۔ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔"

مگر میں نے دونوں کی نہیں سنی تھی۔

یہ رات بڑی قہرناک تھی۔ پورا شہر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ رات آخری پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ میں ابھی میانی صاحب سے ایک کوس دور ہی تھا جب رات کے سناٹے میں میرے دل و دماغ پر خوف کے پہرے بیٹھنے لگے تھے۔ مگر میں زیر لب وظائف کی گردان کئے آگے ہی آگے اس سیل رواں کی طرح بڑھ رہا تھا۔ جو اپنی آتش سے بپھرا ہوا ہو تو راستے میں حائل ساری رکاوٹیں بہا لے جاتا ہے۔ قبرستان سے جھینگروں اور کتوں کے شور سے ماحول میں کہرام سا مچا ہوا تھا...... اور کچھ یہی عالم میرے اندر بھی برپا تھا۔ میں آج جس غرض سے میانی صاحب میں چوکی لگانے جا رہا تھا اس پر میری زندگی کا دارومدار تھا۔ اپنے انتقام کی آگ بجھانے اور اس خرافہ بدروح سے معصوم جانوں کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اپنے جیون کا ایک نیا کھیل کھیلنے کے لئے آگ کے اس دریا میں کودنے جا رہا تھا جس نے میرے ہنستے بستے آشیانے کی خوشیوں کو اپنی ظالم لہروں میں لے کر غرق کر دیا تھا۔

میری زبان پر وظائف تھے اور دل و دماغ میں کہرام سا برپا تھا۔ یادوں کی ایک یورش تھی جو میرے اندر کے جوالا مکھی کو باہر اگلنے کے لئے بے تاب تھی۔ میں خدا سے اس توفیق کی دعا مانگ رہا تھا کہ جس کی مدد سے میں اس ظالم بدروح کو جہنم واصل کر سکتا تھا۔ میں جین مندر سے بہت آگے نکل گیا۔ اس زمانے میں لاہور کی یہ آبادی اتنی گنجان نہیں تھی۔ چوبرجی کشادہ اور ویران علاقہ تھا۔ میرے بائیں طرف مزنگ کی آبادی تھی۔ میں جوں جوں وہاں سے گزر رہا تھا' رات کے مہیب سیاہ اندھیروں میں بہت سے نادیدہ وجود لہراتے ہوئے' ناچتے ہوئے دکھائی دینے لگے تھے۔ مجھے لگا جیسے وہ خرافہ میرے استقبال کے لئے جشن کا اہتمام کر رہی ہے۔ فضا میں منحوس جانوروں کی کربناک چیخیں گونج رہی تھیں تو اندھیروں میں لپٹے بہیمانہ وجود بھوکی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے اپنا خیال فوراً وظائف پر مرکوز کر دیا اور دل و دماغ کو یکسوئی کے ساتھ وظائف کے زیر اثر کر دیا۔

میں جب میانی صاحب کی خستہ حال قبروں کے پاس پہنچا تو میرا پورا بدن پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ میں نے صبح ہی اس جگہ کا تعین کر لیا تھا جہاں مجھے بیٹھنا تھا۔ میں چوبرجی اور مزنگ کے درمیان واقع میانی صاحب کی گھاٹی پر پہنچ کر برگد کے اس صدیوں پرانے شجر ظلمت کے نیچے بیٹھ گیا یہاں نہ جانے کتنے عاملوں نے چوکیاں لگا کر خانماں برباد بدروحوں کو جہنم واصل کیا تھا۔ یہ جوگیوں کا استھان بھی تھا۔ عیسائی اور ہندو عامل عموماً یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ میاں جی نے مجھے اس برگد کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا کہ اس پر عیسائی جنات کی ایک پکھی (قبیلہ) بھی رہتی ہے اور کئی بدروحوں کو جلا کر ان کی راکھ اس کہنہ سال آسیبی درخت کے تنے میں دفن ہے۔

برگد کے پاس سرسوں کا ایک بڑا سا دیا روشن تھا جس کی ملگجی روشنی نے مہیب گھنے آسیبی درخت کا ماحول انتہائی پراسرار بنا دیا تھا۔ برگد کی شاخیں ناگوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ میں نے چٹائی اس دیئے کے پاس بچھائی اور انگیٹھی نکال کر سامنے رکھ لی۔ پھر میں نے چٹائی اور انگیٹھی کے گرد حصار باندھا اور پورے اطمینان کے بعد چوکی کا سامان نکالنے لگا۔

میں نے 125 منکوں والی سیاہ تسبیح نکالی اور انگیٹھی کے سلگتے خوشبودار سحر سوز دھوئیں پر نظریں جما کر پڑھائی کرنے لگا۔ ابھی میں نے پہلی تسبیح مکمل نہ کی تھی کہ برگد کے درخت پر جیسے بھونچال آ گیا۔ مجھے لگا جیسے بہت سارے پرندے درخت کے پتوں میں جان کنی کے عالم میں پھڑ پھڑا رہے ہیں اور برگد کی آسیبی دنیا ان پرندوں کو نگل رہی ہے اور ہر ذی حس پر موت کمندیں ڈال رہی ہے۔

شاخیں جہنمی شعلوں کی طرح دیوانہ وار میرے ارد گرد لہرانے لگی تھیں اور عیسائی جنات کی پوری پکھی پر مرگ ناگہانی طاری ہو گئی تھی۔ میرے سر کے اوپر اس قدر قیامت خیز شور تھا کہ برگد کا پورا استھان اس پہاڑ کی طرح لرزنے لگا تھا جس کی پاتال میں آتش فشاں ابلنے لگتا ہے تو اس پر کپکپاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اگر یہی عالم رہا تو یہ استھان پھٹے گا اور میں اپنے حصار سمیت اس میں غرق ہو جاؤں گا۔ ایک لمحہ کے لئے میری رگ رگ میں خوف اتر گیا۔ اگرچہ میں اس سے پہلے بھی کچھ خطرناک چلے کاٹ چکا تھا اور خوف مجھ پر کبھی غالب نہیں آیا تھا مگر وہ لمحے بڑے پر آشوب اور جاں گسل تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے اندر آرا چل رہا ہے اور اعضائے قلب کو اپنے کھرنڈ دندانوں سے کاٹ رہا ہے۔ بے حد اذیت اور خوف کی صلیب پر میرا بدن لٹکا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں اپنے ذہن کو خوف کی دہلیز پار نہیں کرنے دے رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ذرا سی لغزش مجھے تباہ کر دے گا۔ جلالی عملیات کی آگ مجھے روئی کی مانند جلا کر راکھ کر دے گا اور میں اک شعلہ بے آسرا کی طرح بجھ جاؤں گا یہ میرے مضبوط اعصاب کی آزمائش کا وقت تھا اور مجھے بہت سے خوفناک قاتل لمحوں کو سرنگوں کرنا تھا۔ مجھے اس خرافہ بدروح کو تسخیر کر کے عبرتناک موت سے ہمکنار کرنا تھا۔ جو میری خوشیوں کی قاتل تھی۔ جس نے میرے ارمانوں کا خون کیا تھا۔ میرے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دیا تھا۔ اور جو میرے بچوں کی قاتل تھی..... پس مجھے اس امتحان سے سرخرو ہونا تھا۔

برگد کے استھان پر کپکپاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد برگد کے مکینوں کا شور کم ہونے لگا تھا۔ جوں جوں میرا عمل تیز ہو رہا تھا۔ استھان کا لرزہ بڑھتا جا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے احساس ہوا جیسے کوئی بھاری بھر کم وجود دھپ دھپ کرتا ہوا میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پورے ماحول میں کافور کی ملی جلی ناگوار سی بو پھیل گئی اور پوری فضا پر بوجھل پن سا طاری ہو گیا۔ مجھے جیسے انہی لمحات کا انتظار تھا۔ میری پڑھائی کا تیر ٹھیک بیٹھا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں تو اس کے ساتھ ہی استھان کی کپکپاہٹ بھی رک گئی۔ انگیٹھی کا دھواں ایک دبیز سی چادر کی طرح میرے ارد گرد پھیل گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں سماعت کی راہنمائی میں اس جانب مرکوز کر کے پڑھائی شروع کر دی جدھر سے وہ وجود ناگہاں آ رہا تھا۔

"حاضر ہو جا..... آ جا..... آگے اور آگے....." میری بوجھل اور قہر میں غرقاں آواز گونجی۔ مجھے لگا جیسے میرے اندر سے کوئی اور ہی بول رہا ہے۔ مجھے اپنا آپ اجنبی سا لگا۔ میں نے پڑھائی کے دوران دوبارہ یہ جملہ بولا تھا۔ پھر ایک دو ثانیے بعد ہی دبیز دھوئیں میں کفن بردار ایک طویل القامت وجود سر پر تابوت اٹھائے ہوئے میری طرف بڑھ آیا۔ وہ جیسے بہت لمبی مسافتیں طے کر کے آیا تھا' بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کی بوجھل اور گھمبیر آواز سے استھان کے ماحول پر سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ حصار سے باہر انگیٹھی کے سامنے آ کے رک گیا۔ تابوت حصار کے باہر رکھ کر اور دونوں ہاتھ باندھ کر بڑبڑایا۔

"آقا میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"اپنا حصہ لے اور چلا جا".....

میں نے سخت لہجے میں کہااور پھر تھیلے میں سے سات دالوں سے بناہوا پتلا اس کی جانب پھینک دیا۔ وہ ندیدوں کی جھپٹااور غائب ہو گیا۔

میں جلدی سے اٹھااور آسمان کی طرف دیکھا۔ نوچندی رات اپنے جوبن پر تھی۔ میری سماعتوں اور بصارتوں کی بندشیں کھل گئی تھیں۔ میں اب کائنات اسرار میں سرگرداں مخفی مخلوق کو دیکھ سکتا تھا۔ ہوائی مخلوق آسمان پر چہلیں کرتی گھوم پھر رہی تھی۔ میں نے مخصوص عمل پڑھااور پھر تابوت کو حصار کے اندر کھینچ کر تابوت کا ڈھکن کھول دیا پھر میں نے تابوت میں دفن ہونے سے پہلے آخری بار پڑھائی کی اور وظیفہ پڑھتے ہوئے ماش کے دانے تابوت کے چاروں طرف پھیلا دیئے تھے۔ مشک بور کا چھڑکاؤ بھی کر دیا تھا۔ تابوت والی جگہ کو اگر کی خوشبو سے مہکا دیا اور میں دم بخود سا خود سپردگی کے انداز میں موت کے تابوت میں لیٹ گیا اور زیر لب اس قاتلہ کی حاضری کے لئے وظیفہ پڑھنے لگا۔ تابوت میں موت کا سکون اور گھپ اندھیرا تھا۔ ہوا کا ایک جھونکا بھی داخل نہیں ہو رہا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ مجھے آکسیجن کی کمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی مسرور کن خوشبو میرے ذہن پر مسلط ہو رہی تھی اور رگ وپے میں لذت آمیز سنسنی پھیل رہی تھی۔ میری سماعت اور ذہن میں انتظار کی گھڑیاں بج رہی تھیں۔

"ٹھک... ٹھک... ٹھک....." دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ مجھے لگا کہ میں جہان اسرار میں کھو گیا ہوں۔ میری آنکھیں تو پہلے ہی بند تھیں۔ لیکن اعصاب کی ساری حسیات بیدار تھیں اور کسی متوقع خطرے کے گلے ملنے کے لئے مجھے تیار کیا جا رہا تھا۔ مشک بو کی مہک تیز رفتار ہوا کے جھونکوں کی مانند تابوت میں گردش کر رہی تھی۔ لمحے سرک رہے تھے۔ دل کی دھڑکن کی صدا آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آواز معدوم ہو رہی ہے اور میرا بدن خوشبوؤں کا غبار بن کر گہرائیوں میں گر رہا ہے۔ مجھے چلہ کے تقاضوں کے مطابق کسی قسم کے خوف میں مبتلا نہیں ہونا تھا اور نہ ہی حرکت کرنی تھی۔

یہ خود سپردگی کا عمل تھا۔

میں خواب وخیال کی دنیا میں اتر گیا تھا۔ میرے ذہن سے تاریکی کی چادر سرک گئی تھی اور کھلا آسماں اپنی تابناکیوں اور رفعتوں کے ساتھ پھیلا ہوا نظر آیا۔ پوری کائنات کے اسرار کے قفل جیسے کھل گئے تھے۔ یہاں فضائوں میں تیر رہا تھا مگر پڑھائی کا عمل پھر بھی نہیں رکا تھا۔ ایک خودکار طریقے سے ہی ایک طرف کو بڑھ رہا تھا۔ میں جدھر سے بھی گزرتا ہوائی مخلوق کے بدوضع 'بدصورت وجود حیرت واستعجاب سے میری طرف دیکھتے لیکن میرے براق وجود کی روشنیاں انہیں مجھ سے دور کر دیتیں۔ ایک دو بار کچھ شوریدہ سر اور شرارتی وجود مجھے چھونے اور ڈرانے کی خاطر میری طرف لپکے بھی تھے مگر جونہی وہ میرے براق کی لہراتی طلسماتی روشنیوں کے قریب آئے ان پر ان گنت سے شہاب گرے اور وہ عبرتناک چیخیں مار کر لمحہ بھر میں راکھ ہو گئے تھے۔

تاحد نظر ارض وسما کی وسعتیں جلوہ فگن تھیں۔ میں فضائوں کے سینے سے اترتا ہوا ایکجانب کو بڑھنے لگا تو اسی لمحے نوچندی رات کا شباب اترنے لگا جس سے پورے ماحول میں بے چینی وبے قراری بڑھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ جدھر کو مجھے لے جایا جا رہا تھا... دور بہت دور ایک کھنڈر نما عمارت ہے جس پر سونے کا کلس نمایاں ہے 'کسی غمزدہ بیوہ کی طرح اداس نظر آ رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد نادیدہ راہنما قوتیں مجھے اس کھنڈر میں لے گئیں۔ میں قریب پہنچا تو یہ ایک مندر کی عمارت تھی جس پر کائی اور مکڑیوں کے جالے جال کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ مندر سے باہر انسانوں کی کھوپڑیاں اور ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ مندر کی عمارت ناگوار بو میں سانسیں لے رہی تھی۔ میں مندر کے بڑے سے دروازے کے سامنے اترا تو دروازہ بے آواز صدا کے ساتھ دھیرے دھیرے کھل گیا اور ناگوار بو کا بھبکا باہر کو نکلا۔

میں دروازے کے اندر داخل ہوا۔ گہرے نارنجی رنگ کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ میں جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا دھوئیں میں میرا راستہ بنتا جا رہا تھا اور میں ایک بڑے سے کمرے کے اندر پہنچ گیا۔

کمرے کا ماحول دیکھ کر میرے لبوں پر زہر ناک مسکراہٹ تیر گئی۔ مندر کی ناگوار فضائوں کے برعکس کمرے کا ماحول نہایت خوشبودار احساس لئے ہوئے تھا اور نہایت آراستہ پھولوں سے سجا ہوا کمرہ... ایک بڑی سی مسہری' ریشمی پردے جس کے چاروں طرف لہرا رہے تھے۔ میٹھے میٹھے سروں میں گھنٹیاں بجنے لگیں' بے خود کر دینے والا ماحول تھا۔ میں دروازے کے درمیان کھڑا ہو گیا تو مسہری کے پردے بے تابی سے والہانہ انداز میں پھیل گئے اور ایک کمال نازاں و جمال صفت دوشیزہ مہین لباس میں لپٹی ہوئی مسہری پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت انگیز ہوس آمیز چمک تھیں۔

''ٹھہر کیوں گئے ہو۔ آگے آجائو.....'' وہ بولی تو فضا میں ترنم جاگ اٹھا۔

میں آگے بڑھا۔ میری چال میں تفاخر اور خمار تھا۔ زبان اس کے جلوہ حسن کے آگے گنگ ہو گئی تھی۔ اس وقت مجھے گماں ہوا کہ میں جس کی تلاش میں آیا ہوں یہ وہ نہیں ہے۔ پدمنی تو نفرت و کراہت کا ملغوبہ۔ ایک ایسی بدروح ہے جس کو دیکھتے ہی گھن آتی ہے۔ مگر یہ شفاف شبنموں جیسی میٹھی دوشیزہ کون ہے؟ شاید مخفی قوتوں نے اس مہربان وجود کو میری مدد کے لئے بھیجا ہے۔

وہ انگڑائی لیکر اٹھی تو اس کے ریشمی بدن کی پوروں میں آتش جوانی سے تلاطم برپا ہو گیا۔ اس کا ہر عضو بے باک ہو گیا۔ اتنی مکمل عورت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ کسی مصور کی خیالی تصویروں جیسی تھی۔ اس کو دیکھ کر زاہد بھی کفر کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں خود فراموشی کے عالم میں کھو گیا۔ اس نازنیں پری جمال اپسرا نے میرے پورے بدن کو اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ میں دم بخود حیرت سے اس مجسمہ فطرت کو دیکھ رہا تھا۔

''آئو میرے ہمدم آگے بڑھو۔ میں کب سے تمہارے انتظار میں پیاسی بیٹھی ہوں۔''

اس کی آواز جذبات سے مغلوب ہو رہی تھی اور وہ جل پری کی طرح مخملی مسہری پر بے قراری سے پہلو بدلنے لگی۔

میں کسی سحر زدہ موکل کی طرح مسہری کے پاس پہنچا تو میری رگوں میں آتش لہو بھڑکنے لگی۔ اس نے نرم گداز شیر و شہد میں گندھا ہوا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور میں نے اس کا ہاتھ بے اختیاری سے تھام لیا۔ اس نے سسکاری بھری تو آگ نفس میرے بدن کو یوں جلانے لگی جیسے آگ سے بھڑکتے تندور کے پاس موم رکھ دیا جائے تو وہ پگھل کر مائع ہو جاتا ہے۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما تو میرا پورا بدن موم کی طرح پگھل گیا۔ وہ اٹھی اپنا چہرہ میرے قریب لا کر بولی ''تم اتنے برسوں سے کہاں تھے۔''

میں خاموش کسی بت کی طرح اس کا تمازت بھرا چہرہ دیکھتا رہا۔

اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے گداز مخروطی ہاتھوں میں تھام لئے اور انہیں اپنی تپتی آنکھوں پر لگا کر بولی۔

''یہ آنکھیں وصل ہجر میں سلگ سلگ کر موم ہو گئی ہیں۔'' اس کی آنکھوں سے موتیوں جیسے آنسو گرے اور میرے ہاتھوں میں جذب ہو گئے۔ میرا دل بے اختیار ہو گیا۔

''میں اب آ گیا ہوں نا''

میرے لبوں سے نکلا

"اب مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے۔"

وہ اپنے قریب کر کے بے تابی سے پوچھنے لگی۔

نہ جانے اس وقت کیا ہوا کہ میں موم کی طرح اس کی قربت میں پگھلتا چلا گیا۔ میرا نفس بہک گیا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے تو اس وقت ہوش آیا تھا جب حسن آتش رواں نے مجھے پانی پانی کر کے میری روح کو آب گناہ میں غرق کر دیا تھا۔

پس اس وقت جب میں گناہ وندامت کی دلدل میں ڈبکیاں کھا رہا تھا' وہ دلفریب حسن اپنی حقیقت کے ساتھ آشکار ہو گیا اور اس نے بے حد و بے حساب بلند قہقہہ لگایا۔ میں جیسے ہوش میں آ گیا اور چونک کر اس کی جانب دیکھا تو مجھ پر لرزا طاری ہو گیا۔ مسہری پر میں جس کے قرب وصل کی آگ سے موم ہو گیا تھا اب اس کا جہنمی پیرہن عیاں ہو گیا تھا۔ کچھ لمحے پہلے جس کے حسن دلفریب نے میرے قلب و نظر کو بدگماں کر کے مغلوب کر لیا تھا اب اپنے مکروہ خدوخال کے ساتھ نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ مسہری پر ایک سراپۂ نفرت اپنی قہر سامانیوں حقارتوں کے نشہ میں مغرور ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کا مکروہ چہرہ میرے سامنے مکڑی کے جالے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ خوشبوؤں کی بجائے تعفن آمیز بو کا احساس بڑھ گیا تھا۔

وہ سراپہ آگ 'نفرت وجلال کا روپ پدمنی مجھے دغا دے گئی تھی۔ مجھے بات ہو گئی تھی۔ میں اپنے چلے کی ریاضتوں کے انبار تلے دب گیا تھا۔

پدمنی فتح سے چور تھی۔ وہ کسی فاتح درندے کی طرح ڈکرائی اور بولی

"میں نے تیری شکتی 'تیرا مان 'تیرا گیان اور تیرا استھان پلید کر دیا 'تباہ کر دیا 'تجھے برباد کر دیا ہے۔ ہا...ہا... ہا...ہا... "۔ اس کا قہر و نفرت کی مستی میں ڈوبا قہقہہ مجھے ذلت ناک شکست سے دوچار کر گیا تھا۔ میں نے بے بسی کے عالم میں خود کو مجتمع کرنے کی کوشش کی اور اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑنے لگا۔ لیکن اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور میں مسہری سے نیچے گر گیا۔

میری حیثیت برفیلی سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے اس نومولود بچے کی سی ہو گئی تھی جس کے اوپر سے بھاری لحاف اتار کر بے دردی سے باہر پھینک دیا جائے۔ ندامت اور شرمندگی کی لہر نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور پھر میں نے اپنی حیثیت کا ادراک کرتے ہی اس قاتلہ کی جانب دیکھا جو اپنے خبیث باطن کی خباثتوں کے ساتھ میرے سر پر کھڑی تھی۔

"پدمنی میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا"۔ میں ہانپتا کانپتا ہوا بولا تو اس نے استہزائی قہقہہ لگایا اور پھر نفرت سے بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی اور بولی۔

"اب تو مجھے کوئی نہیں مار سکے گا۔ نہال شاہ کی پوری نسل بھی مجھے مارنے پر لگ جائے تو میں اس کے ہاتھ نہ آسکوں گی"۔

پدمنی دو قدم پیچھے ہٹ کر نفرت سے دہاڑی۔ "میں تجھے واپس بھیج رہی ہوں۔ تمہیں عبرت کی تصویر بنا کر۔ جاؤ اور اپنے میاں جی اور اس کالے نامراد سے کہو۔ وہ تمہیں ایسا گیانی بنا دیں۔ ایسا علم سکھا دیں جو پدمنی کو جلا کر راکھ کر سکے۔ جاؤ اور اس لمحے کا انتظار کرو جب میں دوبارہ تیری خوشیاں چھیننے آؤں گی۔ اب میں ہرکالی منگل کو تیرے پاس آیا کروں گی اور تم میری پیاسی اور سلگتی آتما کی آگ بجھایا کرو گے۔ آج پدمنی نے صدیوں بعد ایک منش

کے وجود سے وہ کچھ حاصل کر لیا ہے۔ جس کی تمنا میں وہ جل کر مر گئی۔ سنو جانے سے پہلے یہ سنتے جاؤ کہ تمہارے بابا نہال شاہ نے اگر مجھے میرے بدن کو چھو لیا ہوتا اور مجھ سے بیاہ رچا لیا ہوتا تو میں اس کے عوض تمہارے خاندان کی رکھشا کرتی"۔

"پدمنی تو جھوٹ بولتی ہے۔ میرے باوا جی سرکار نے تجھے اس وقت بخش دیا تھا جب تو ان کی موت بن کر ان پر نازل ہوئی تھی۔ لیکن انہوں نے تمہارے ساتھ رحمدلی کا سلوک کیا۔ تو نے ان سے علم سیکھنے کی بھیک مانگی اور انہوں نے تجھے نہ صرف پناہ دی بلکہ علم سکھانے شروع کئے۔ اے ظالم بدروح تو اپنی شرارتوں اور شیطانیوں کے باعث باوا جی کی نظروں میں گر گئی تھی تو اپنی آگ میں خود جل گئی اور اس کا الزام باوا جی کو دیتی ہے۔ تو نے میرے خاندان کو اپنی نفرت کا نشانہ بنایا ہے۔ میرے بچوں کو تو نے مار ڈالا اے ظالم... تو نے معصوم سندھ کو برباد کر دیا۔ خدا کی قسم میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک دن تجھے پکڑنے میں کامیاب ہو گیا تو تجھے ذلت کی موت ماروں گا۔"

پدمنی میری بات پر قہقہے لگاتی رہی۔ میری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

میں نے اپنی قوتوں کو یکجا کر کے اپنے وجود پر نظر ڈالی تو مجھے اپنی پور پور میں پدمنی کی غلاظت بکھری ہوئی نظر آئی۔ ظالم نے اپنی صدیوں کی پیاس بجھانے کے لئے مجھے بھرپور استعمال کیا تھا۔ میں اپنی قوتوں کو یکجا نہ کر سکا۔ میرے نورانی علوم کی طاقتیں ناراض ہو گئی تھیں۔ پدمنی اپنی خوابگاہ میں فاتح کی طرح تن کر کھڑی تھی اور میں فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ میری روح اپنی کم مائیگی پر بلک رہی تھی۔ مجھے یہ احساس کوڑے مارنے لگا تھا کہ میں نے میاں جی کی ہدایات پر عمل کیوں نہیں کیا تھا۔ انہوں نے تو مجھے واضح بتا دیا تھا کہ دیکھ پتر پدمنی نہ جانے کس روپ میں تیرے سامنے آئے اور تو اس سے دغا کھا جائے۔ اگر تو اس بار اس کے دھوکے میں آ گیا تو تجھے بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ میں نے میاں جی کی نصیحت کو اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے فراموش کر دیا تھا اور اب پدمنی کے رحم و کرم پر بیٹھا بلک رہا تھا۔

نہ جانے میں کب تک شرمندگی کی آگ میں جلتا رہتا کہ اچانک مجھے پدمنی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر اذیت ناک کھچاؤ اور گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اسی لمحہ ایک نورانی ہیولہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی چھڑی تھی جس کی نوک سے آگ کا شعلہ نکل رہا تھا۔ ہیولے نے چھڑی کی نوک پدمنی کی طرف کی تو پدمنی نے دلخراش چیخ ماری۔

"اشرف میاں۔ اگر تو نے مجھے جلایا تو میں تیرے ناگی کو مار ڈالوں گی۔" پدمنی نے کربناک آواز میں کہا تو ہیولے نے چھڑی فضا میں روک لی اور اس کا رخ اوپر کر دیا۔ پھر ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔

"بدبخت تو نے اس کو اپنی غلاظت کے جال میں پھانس لیا ہے۔ آج میں تجھے جانے دے رہا ہوں صرف اس کی زندگی کی خاطر۔ پھر دوبارہ کبھی اس کو تنگ کیا تو اسی وقت جلا کر راکھ کر دوں گا"۔

ہیولے کی آواز میں اسقدر دبدبہ تھا کہ پدمنی جھرجھری لیکر رہ گئی اور آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بس مجھے اتنا یاد ہے کہ اس کے بعد ہیولہ میری طرف بڑھا تھا۔ اس نے چھری میری طرف بڑھائی تو میرے ذہن کو زوردار جھٹکا آیا۔ یوں لگا جیسے میرا وجود غلاظت سے باہر نکل آیا ہو۔ میں زوردار چیخ مار کر اٹھا تو میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔

"میاں جی..." میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے گرد گھپ اندھیرا تھا اور میرا پورا بدن مردے کی طرح تنگ سی جگہ پر اکڑا پڑا تھا۔ مانوس خوشبوئیں میرے گرد ہنوز پھیلی ہوئی تھیں۔

اسی لمحہ ڈھک سے میرے اوپر کوئی ڈھکن سا اٹھا تو مجھے یاد آیا کہ میں تو تابوت میں قید ہو کر پڑھائی کر رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکن کھلا تو دیئے کی روشنی میں دو وجود کھڑے نظر آئے۔

''ناگی باہر نکلو۔''میاں جی کی آواز سنائی دی۔

''لے تو میرا ہاتھ تھام لو''دوسرا وجود استاد مراد کا تھا۔اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔تابوت سے باہر نکال کر بولا۔''میرے کاندھے پر ہاتھ رکھو کہیں گر نہ جانا''۔مجھے بے حد نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔

''شکر کر'زندہ بچ گیا ہے''۔میاں جی گھمبیر آواز میں بولے

''آپ کا شک صحیح نکلا تھا۔میاں جی''استاد مراد نے کہا''اسے بہت سمجھایا تھا کہ مجھے ساتھ لے چلو۔مگر اسے اپنی پراسرار طاقتوں پر بہت گھمنڈ تھا''۔استاد مراد اور میاں جی مجھے بڑی مشکل سے آستانے پر لے کر آئے تھے۔سحری کا وقت ہو چلا تھا۔مجھ سے تو چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔میں نیم بے ہوش تھا۔انہوں نے مجھے آستانے کے اندر لٹایا اور میرے کپڑے اتار کر میرے بدن پر مختلف عملیاتی تیلوں کی مالش کرنے لگے۔یہ مانوس سی بو تھی مجھے یاد آیا کہ برسوں پہلے میں نے استاد مراد کو جب اس طرح کے تیلوں سے مالش کراتے دیکھا تھا تو مجھے گھن آنے لگی تھی۔لیکن آج میرے بدن کو پدمنی کی نحوست سے پاک کرنے کے لئے عملیاتی تیل سے مالش کی جا رہی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ استاد مراد اور میاں جی نے سورج طلوع ہونے تک عملیات اور دھونیوں کے ذریعے میرے ہوش قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔میاں جی نے استاد مراد سے یہ کہا تھا۔

''سورج پھوٹنے سے پہلے پہلے اس کو ہوش میں لانا ہے۔اگر یہ بے ہوش ہو گیا تو پدمنی کا خوف اس کے ذہن میں پنجے گاڑھ کر بیٹھ جائے گا''۔

لہذا انہوں نے سورج نکلنے سے پہلے مجھے مکمل ہوش دلا دیا۔استاد مراد اور میاں جی نے پورا دن مجھے اپنے پاس رکھا اور مجھے عملیات کی پراسرار دنیا کی اونچ نیچ سے آگاہ کرتے رہے تھے۔انہوں نے کہا تھا۔''ناگی یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔اندھے جذبات'غصہ اور بے شعوری سے عامل کو بچنا چاہیے۔چلہ کے وقت کبھی خلاف علم حرکت نہیں کرنی چاہیے۔چھوٹے موٹے علم میں بھی عامل کی گستاخی اور بے پروائی برداشت نہیں ہو سکتی''۔

میں اس روز بے حد رنجیدہ بھی تھا اور میرا خون بھی کھول رہا تھا۔میں نے میاں جی سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔''میاں جی میں پدمنی کو معاف نہیں کر سکتا۔وہ میری خوشیوں کی قاتل ہے۔میں اپنی جان قربان کر کے بھی آنے والی نسلوں کو اس کے قہر سے بچاؤں گا''۔

''پہلے تجھے عملیات کی تعلیم مکمل کرنی ہو گی''۔میاں جی نے کہا۔''تمہیں علوم پر دسترس ہو گی تو تبھی اس خرافہ کو پکڑنے میں کامیاب ہو سکو گے۔دیکھو علم تو ہمارے پاس بھی ہے لیکن بعض حالات میں ہماری قوتیں بے بس ہو جاتی ہیں۔''میاں جی نے اس کی وجوہات سے مجھے آگاہ کیا اور مجھے احساس ہو گیا کہ جب انسان دو کشتیوں کا سوار ہو تو اس کے ڈوب مرنے کا امکان بھی ہوتا ہے۔ایک وقت میں کالے علم اور نوری علم سیکھنے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔اگر ایک عامل صرف نوری علوم حاصل کرے تو گندی قوتیں اس پر غالب نہیں آ سکتیں۔کالے اور سفید علوم کے ملغوبہ سے استفادہ کرنے والا عموماً کالی قوتوں سے مات کھا جاتا ہے۔

اس روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اگر ایک بڑا اور کامیاب عامل بننا ہے تو مجھے نوری علوم پر دسترس حاصل کرنا ہو گی۔میں نے میاں جی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ بے حد خوش ہوئے البتہ رنج کے عالم میں کہا''کاش ہم نے بھی صرف نوری علم سیکھا ہوتا''۔

میں میاں جی کی بات سمجھتا تھا۔ انہوں نے بھی خاندانی روایات کی طرح کالے علم اور نوری علم سے استفادہ کیا تھا۔ اس علم کے باعث ہی بعض اوقات وہ طاقتور کالی قوتوں کو مکمل طور پر شکست نہیں دے سکتے تھے۔

استاد مراد نے میرے فیصلے کو پسند نہیں کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں سفلی اور نوری دونوں علوم سیکھنے کا عمل جاری رکھوں۔ اگرچہ اس وقت تک میں نے کچھ سفلی علوم بھی سیکھ رکھے تھے اور نوری علوم سے بھی راہنمائی لیتا تھا لیکن ایک عامل کامل بننے کے لئے مجھے ایک کشتی پر سوار ہونا تھا۔ میرے سامنے پدمنی کی طاغوتی قوتوں کا ایک کوہ گراں تھا جس کو میں نے گرانا تھا۔ پھر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آخر ایسی پراسرار قوتیں حاصل کرنے کا کیا فائدہ جس پر عامل کو پوری دسترس نہ ہو۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ دنیا میں صرف نوری طاقتیں ایسی ہیں جنہیں زوال نہیں آسکتا۔ کالے علوم والا تو زندگی بھر عذابوں سے دوچار رہتا اور ذلتیں اٹھاتا ہے۔

میں نے نوری علوم اور عملیات کی راہ پر چلنے سے پہلے اپنی باطنی غلاظتوں کو دھونے کا فیصلہ کیا۔ میاں جی نے میری بھرپور مدد کی اور مجھے وہ روشن راہیں دکھا دیں جن پر چل کر میں روحانی علوم کا ماہر بن سکتا تھا۔ میں آپ کی اپنی اس آپ بیتی میں ان علوم سے آگاہ کروں گا۔ یہ ایک لمبا صبر آزما اور کٹھن سفر تھا مگر یہ تھا بہت ثمر آور۔ روحانی علوم کے لئے مزید راہنمائی کیلئے میاں جی نے اپنے خاندانی عامل جن طرطوش کو بھی بلایا تھا اور مجھے کئی مہینے تک اس کے سپرد کیا تھا۔ طرطوش کی نگرانی اور سرپرستی میں مجھے عجیب و غریب تجربات سے بھی گذرنا پڑا تھا۔

ٹھہریئے۔ اب ضروری ہو گیا ہے کہ میں جہانِ عملیات کے اسرار بیان کرنے سے پہلے آپ کو اپنا مکمل تعارف کرا دوں اور اپنے اس خاندانی پس منظر اور حالات سے آگاہ کر دوں جن کی وجہ سے مجھے عملیات کی دنیا میں آنا پڑا۔

زمیندار جو عامل بن گیا

انیسویں صدی کے وسط تک ہمارا خاندان ضلع ہوشیار پور کا نامی گرامی زمیندار گھرانہ تھا، مگر اس کی وجاہت اور زمینداری اس وقت زوال پذیر ہو گئی جب سارے خاندان کی باگ دوڑ باواجی نہال شاہ کے ہاتھ آئی۔ انہیں زمینوں اور گھوڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ آبائی پیشہ جاری نہ رکھ سکے۔ ان کی عدم دلچسپی کے باعث خاندان کا دبدبہ اور اثر و رسوخ قدرے کم پڑ گیا اور شریک برداری نے باواجی کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زمینوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔

ہمارے باواجی کو اگر دلچسپی تھی تو صرف علم نجوم اور عملیات سے، میں نہیں جانتا کہ انہیں جوتش سے کیسے دلچسپی پیدا ہوئی مگر یہ ضرور علم ہے کہ انہوں نے بیس سال کی عمر ہی میں ان علوم پر دسترس حاصل کر لی تھی اور ان کے چرچے سن کر نیپال کے شاہ نے انہیں اپنے دربار میں مدعو کیا تھا۔ شاہ نیپال جوتشیوں اور سنیاسیوں کا بہت بڑا قدر دان تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے جاگیرداروں کو وہ عزت اور رتبہ نصیب نہ ہوتا جو ایک درمیانے درجے کے جوتشی کو مل جاتا۔ ہمارے باواجی تو اعلیٰ پائے کے جوتشی تھی۔ انہیں ستاروں کے علم کے علاوہ حکمت اور عملیات پر بھی کامل عبور تھا۔

باواجی نہال شاہ کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ انہوں نے حکمت کی تعلیم کسی سے حاصل نہیں کی تھی۔ انہیں جوتش اور عملیات کی بدولت ہی حکمت کا خزانہ ملا تھا۔ ان کے بارے میں یہ روایت نسل در نسل ہم تک پہنچی ہے کہ انہوں نے اپنے عملیات کے زور پر جنات کو بھی اپنا مطیع کر رکھا تھا اور ان میں طرطوش نامی ایک عمر رسیدہ جن بھی تھا جو اپنے قبیلے میں طبیب کی حیثیت رکھتا تھا۔ باواجی کو طب و حکمت کے رموز اور نایاب نسخہ جات کا عمل طرطوش ہی نے سکھایا تھا، اس نے چند ایک نسخے ایسے عطا کیے تھے جو عملیات اور طب کے ملاپ سے تیار کیے جاتے تھے اور انہیں اپنی نسل کو منتقل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

باواجی کی شہرت ہوشیار پور سے نکل کر دور دور تک پھیل چکی تھی، لیکن ان کا اپنا خاندان انہیں ایک سنیاسی اور سادھو ہی سمجھتا اور اکثر افراد ان کا مذاق اڑاتے تھے، تاہم باواجی اپنی طاقتوں سے پوری طرح آگاہ تھے اور وہ شریک برادری کی باتیں اور طعنے سننے کے باوجود خاموش رہتے تھے۔ انہوں نے شادی بھی نہیں کی تھی، ان کی کوئی بہن تھی نہ بھائی۔ ماں، باپ لڑکپن ہی میں وفات پا گئے تھے، اس لیے وہ دیوانہ حال اپنی دنیا میں رہتے اور کئی کئی ماہ کیلئے گاؤں سے باہر چلے جاتے۔ کسی کو ان کے بارے میں علم نہ ہوتا کہ وہ کہاں ہوں گے اور کب آئیں گے۔

ان کی عدم موجودگی میں ان کی برادری نے زمینوں کے علاوہ ان کی خاندانی حویلی پر بھی قبضہ کر لیا، باواجی ان کی یہ تمام حرکات دیکھتے رہے مگر انہیں کچھ نہیں کہا تھا۔

باواجی نہال شاہ نے اکیسویں سال میں قدم رکھا، تو ان کے چلوں اور عملیات کا ایک دور ختم ہو گیا۔ ان دنوں وہ مستقل طور پر اپنی حویلی میں رہنے لگے اور حیرت انگیز طور پر انہوں نے اپنی زمینوں پر بھی جانا شروع کر دیا۔ برادری کو باواجی کی یہ تبدیلی ناگوار گزری، مگر کوئی بھی کھل کر ان کے خلاف نہیں بول سکتا تھا، کیوں کہ گاؤں کے اصل وارث اور بڑے چودھری تو وہی تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ علم جوتش کے عشق نے انہیں گھر بار سے بیگانہ کر دیا تھا، مگر اب وہ دوبارہ اپنی چودھراہٹ اور خاندانی وراثت کو سنبھالنے کے شائق ہو گئے تھے، لہٰذا وہ تمام لوگ جو ہاتھ آئی مفت کی زمینوں پر پل رہے تھے، اب اندر ہی اندر ان کے خلاف سازشیں کرنے لگے تھے۔ باواجی کو اپنے علوم کے ذریعے ان تمام سازشوں کا علم تھا، لیکن وہ از خود کسی کو کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے۔

ہمارے اس آبائی گاؤں کا نام نمولیاں تھا۔ یہ تحصیل گڑھ شنکر کا گاؤں تھا۔ نمولیاں کے پہلو میں ایک بڑا سا مٹی کا ٹیلہ تھا جس پر ہندوؤں نے ایک طرف شمشان گھاٹ بنا لیا تھا اور اس کی دوسری جانب مسلمانوں کا قبرستان تھا۔ ہماری حویلی اس ٹیلے سے سو گز کے فاصلے پر سب سے نمایاں تھی اور اس کی چھت پر کھڑے ہو کر گاؤں کے ہر گھر میں باآسانی جھانکا جا سکتا تھا۔

مٹی کا یہ ٹیلہ بابالال شہباز کے نام سے مشہور تھا جو ایک صاحب کرامات بزرگ تھے، انہوں نے ایک بار جلتی ہوئی "پاتھی" (اوپلا) اپنے تکیے میں دبادی اور خود کہیں چلے گئے تھے۔ بعد میں کسی نے وہ جگہ کھودی تو وہ جلتی ہوئی پاتھی برآمد ہوگئی، یہ بات سارے گائوں میں پھیل گئی اور اسے بابالال شہباز کی کرامت سمجھ کر ان کا ٹیلہ بنادیا گیا۔ قیام پاکستان تک اس پر ہر ہاڑ کی پہلی جمعرات کو میلہ لگتا تھا۔ میلے میں ہندو، سکھ اور مسلمان عقید تمند آتے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔

اس بار بھی ہاڑ کی پہلی جمعرات آتے ہی نمولیاں میں لوگوں کی چہل پہل شروع ہوگئی۔ باواجی نہال شاہ ان دنوں اپنی حویلی میں واپس آچکے تھے اور انہوں نے میلہ سجانے میں پہلی بار دلچسپی لی تھی۔ پرانی روایت کے مطابق، گائوں کا چوہدری میلے کی شروعات کرتا تھا، لیکن اس بار باواجی گائوں میں موجود تھے، لہٰذا خود انہوں نے خصوصی اعلان کر دیا کہ مزار پر آنے والے زائرین ان کے مہمان ہوں گے اور وہی زائرین کے کھانے کا انتظام کریں گے۔ یہ بات حیرت انگیز بھی تھی اور شریک برادری کے لیے دکھ کا باعث بھی۔ سبھی طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

کسی نے کہا: "مجھے تو سادھو کے تیور اچھے نہیں لگتے۔ اس کے ہوش واپس آرہے ہیں، تبھی تو دو تین مہینے سے حویلی میں ڈیرہ ڈالے بیٹھا ہے اور زمینوں پر بھی جارہا ہے۔"

"اور یہ بھی سنا ہے کہ گائوں کے سارے کمی اس کے پاس پلٹ گئے ہیں۔ اس کے باپ کے نوکر اب دن رات اس کا پہرہ دیتے ہیں۔"

کوئی اور بولا! "اب کیا ہوگا؟"

ہر زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ ایک جوشیلا بلند قامت اور نہایت کڑیل جوان منصور خان برادری کے سورمائوں اور بزرگوں کے سامنے کھڑا ہو کر سینہ پھلانے لگا: "سادھو کا سارا سنیاس میں نکالوں گا۔ تم لوگ فکر مت کرو، اب یہ کام میرا ہے، میں اسے گائوں سے اٹھا کر باہر پھینک دوں گا اور اس کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دوں گا۔ وہ دوبارہ ادھر آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

جمعرات سے ایک دن پہلے ہی دوسرے دیہات کے زائرین نمولیاں آنے لگے۔ باواجی نے اپنی حویلی کے دروازے کھول دیے تھے۔ زائرین آتے گئے اور حویلی میں شب بسری کے علاوہ انہیں لذیذ کھانا مل رہا تھا۔ سبھی لوگ باواجی کی فیاضی کے معترف ہوئے اور انہیں دعائیں دینے لگے۔ باواجی ان باتوں سے بے نیاز اپنے کمرے میں ساری رات ریاضت کرتے رہے۔ یہ سحری کا وقت تھا، چاند نے افق اور زمین پر اپنا نور پھیلا رکھا تھا۔ باواجی نہال شاہ حویلی سے باہر نکلے اور اپنی زمینوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ وہ جس رات چلہ کاٹتے تو سحری ہوتے ہی کھیتوں میں نکل جاتے، اپنے چند خاص عملیات کرتے اور پھر سورج کی پہلی کرن کے نمودار ہوتے ہی حویلی میں لوٹ آتے۔ اس روز بھی وہ حسب معمول کھیتوں میں گئے اور ایک صاف ستھرے کھیت میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے گرد ایک حلقہ کھینچا اور سر گھٹنوں میں دبائے گرد و پیش سے بیگانہ ہو کر اپنے عمل میں مصروف ہو گئے۔

باواجی کو یونہی بیٹھے بیٹھے خاصا وقت ہو گیا تھا جب منصور خان ہاتھ میں کلہاڑی اٹھائے وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ایک نظر باواجی کو دیکھا جو اپنے آپ میں مست تھے اور پھر ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ دودھیا روشنی میں اسے کوئی ذی روح دکھائی نہ دی۔ ماحول پر عجیب طرح کی خاموشی مسلط تھی۔ دور سے کہیں کتوں کے بھونکنے کی ایک آدھ آواز آرہی تھی۔ منصور خان دبے پائوں اطمینان کے ساتھ آگے بڑھا، مگر جونہی وہ باواجی سے تین فٹ کے فاصلے پر پہنچا، کسی غیر مرئی طاقت نے اس کے پائوں جکڑ لیے اور اسے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔

منصور کو اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا وہ ہر خوف سے بے نیاز تھا، مگر اس لمحے اس کا دل لرز کے رہ گیا۔ اس نے کلہاڑی تان کر باواجی پر وار کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا اور اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹا، مگر جونہی اس نے دوبارہ آگے بڑھنا چاہا، تو اس غیر مرئی طاقت نے دوبارہ اسے جکڑ لیا۔ منصور خان نے اس بار آگے بڑھنے کے لیے بہت زور لگایا، مگر پہلے کی طرح پھر ناکام رہا۔ اس نے کلہاڑی زمین پر رکھ کر اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے انجانی قوت کو آگے دھکیلنے کی کوشش کی، لیکن وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

منصور خان پسینے میں شرابور تھا۔اس نے دیکھا کہ باواجی نہال شاہ اپنے حال میں مست ہیں۔اس نے بے چارگی سے آسمان کی طرف دیکھا اور زمین سے کلہاڑی اٹھانے کے لیے جھکا تو وہ اپنی جگہ سے غائب تھی۔وہ دیوانہ وار اسے تلاش کرنے لگا، کلہاڑی اس کی نشانی تھی اور سارا گائوں اس نشانی کو خوب پہچانتا تھا۔منصور خان کلہاڑی تلاش کر ہی رہا تھا کہ عقب سے باواجی کی آواز سنائی دی:"منصور خان! کلہاڑی ڈھونڈ رہا ہے کیا؟"

وہ ایک دم پلٹا اور باواجی کے ہاتھ میں اپنی کلہاڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

باواجی دو قدم آگے بڑھے اور منصور خان کی آنکھوں میں اپنی شعلہ نما آنکھیں ڈال کر بولے:"میں چاہوں تو تیری ہی کلہاڑی سے تیرے ٹکڑے کر دوں، مگر میں خون خرابہ پسند نہیں کرتا اور نہ میں دوسروں کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔لے پکڑ اپنی کلہاڑی اور اسی خاموشی سے گائوں واپس چلا جا جیسے آیا تھا۔میں نہیں چاہتا کہ صبح کے اس پر نور اجالے میں سارا گائوں تیرا تماشا دیکھے۔"

منصور خان باواجی کی قہر آلود آنکھوں کی تاب نہ لا سکا۔اس نے کلہاڑی پکڑ لی اور سر گرا کر مریل قدموں سے پلٹ گیا اور ایک بار بھی اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

باواجی نہال شاہ بھی حویلی واپس آ گئے اور صبح سویرے اپنے ہاتھوں سے زائرین کو کھانا کھلایا اور پھر سب سے پہلے خود ٹیلے پر جا کر بابا لال شہباز کے مزار پر دعا کی۔اس کے بعد عام زائرین اپنے چڑھاوے چڑھانے کے لیے آتے رہے اور یہ سلسلہ سہ پہر تک جاری رہا۔

اس روز باواجی نے میلے میں ایک نئی روایت ڈالی۔انہوں نے دور دراز کے دیہات سے آنے والے نوجوانوں کو اپنے گائوں کے نوجوانوں سے کشتی لڑنے کی دعوت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان اور سکھ نوجوان ایک ہل چلے ہوئے کھیت میں نکل آئے۔گائوں کی عورتیں بھی کھیل تماشے دیکھنے وہاں اکٹھی ہو گئیں۔یہ کشتیاں ہو ہی رہی تھیں کہ منصور خان بھی لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں آ گیا اور اچھل اچھل کر بیٹھکیں لگانے لگا۔گھومتے گھومتے وہ اس جگہ آ پہنچا جہاں باواجی نہال شاہ بیٹھے تھے۔وہ باواجی کے سامنے بیٹھکیں لگانے لگا۔سارا مجمع منصور خان کی اس حرکت پر حیران رہ گیا کیونکہ اس کا یہ انداز مبارزت دراصل باواجی کو مقابلے پر للکار رہا تھا۔سارا گائوں اور زائرین یہ جانتے تھے کہ باواجی نہال شاہ جواں سال ہونے کے باوجود شہ زور نہیں۔وہ دبلے پتلے سے تھے، چلوں اور ریاضتوں کی مشقت سے وہ انتہائی نحیف دکھائی دیتے تھے۔

منصور خان نے دراصل یہ شاطرانہ چال چلی تھی کہ گائوں والوں کے سامنے کشتی کی آڑ میں ان کا خاتمہ کر دے گا اور اس پر کوئی لڑنے بھی نہیں آئے گا کیونکہ لوگ یہ سمجھیں گے کہ باواجی داؤ پیچ کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گئے تھے۔

باواجی نہال شاہ منصور خان کی شاطرانہ چال سمجھ گئے تھے، لیکن وہ اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھے مسکراتے رہے۔منصور خان باواجی کی اس حرکت پر تلملا اٹھا اور بلند آواز میں بولا:"گائوں والو! تم میں سے کوئی ہے جو میرا مقابلہ کر سکے۔"مجمع پر خاموشی چھائی رہی تو منصور خان دوبارہ چلایا:"تو پھر گائوں والو! میں گائوں کے وارث چودھری نہال شاہ کو مقابلے کی دعوت دیتا ہوں' اس سے کہو میرا مقابلہ کرے"مجمع تب بھی خاموش رہا، البتہ منصور خان کے حواری بولے:"چودھری نہال شاہ! منصور خان کی خواہش پوری کر دو۔"

باواجی نے مسکراتے ہوئے ایک نظر منصور کے حواریوں پر ڈالی اور پھر اپنی چادر اتار کر اپنے منشی کو تھما دی۔"سرکار! یہ کیا کرنے جا رہے ہیں؟"منشی، باواجی کی چادر پکڑتے ہوئے بولا۔"آپ کہاں اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں سرکار! اسے دفع کریں اور کہہ دیں کہ کسی اور سے زور آزمائی کرے۔"

"منشی جی! اس کا مقابلہ تو اب میں ہی کروں گا۔اس نے میری غیرت کو للکارا ہے، لہٰذا اسے اس کی سزا دینا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"یہ کہہ کر باواجی، منصور خان کو گھورتے ہوئے میدان میں آ گئے۔

باواجی نے ایک سفید چوغہ زیب تن کر رکھا تھا، وہ عموماً کالے رنگ کی چادر سے بکل مارتے اور سر پر سفید رنگ کی پگڑی باندھتے تھے۔ چادر تو انہوں نے منشی کو پکڑا دی تھی، البتہ پگڑی بدستور سر پر قائم تھی۔

منصور خان نے باواجی کو اپنے مقابل آتے دیکھ کر ٹھٹھا لگایا: "سادھو جی! یہ پگڑی اور سفید چوغہ اتار کر لنگوٹ کس لو۔ ایسا نہ ہو تمہارے سر کی عزت میرے پیروں تلے روندی جائے اور تیرا یہ چوغہ تار تار ہو جائے۔"

باواجی نے اس کی نظروں سے نظریں ملاتے ہوئے کہا: "منصور خان! تو انتہائی کمینہ اور بد فطرت انسان ہے۔ میں تجھے ایک بار معاف کر چکا ہوں، لیکن آج تو پورے گاؤں کے سامنے مجھے بے عزت کرنے اور جان سے مارنے کی غرض سے یہ کھیل کھیل رہا ہے تو جان لے کہ آج کے بعد تیری طاقت کا یہ نشہ بھی اتر جائے گا اور تو اپنے بدبخت پیروں پر نہ چل سکے گا اور نہ ہی ان گستاخ آنکھوں سے کسی کو دیکھ سکے گا۔"

باواجی کا لہجہ لحہ بہ لحہ بدلتا جا رہا تھا۔ ان کی آواز جوش جذبات سے قدرے بلند ہو گئی تھی۔

منصور خان، باواجی کی جلالی کیفیت دیکھ کر اندر سے ہل گیا۔ اسے سحری والا واقعہ بھی یاد آ گیا، مگر وہ گاؤں کے لوگوں کے سامنے اپنی سبکی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس نے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا: "نہال شاہ! بہانے نہ بناؤ، تم اپنی زبان کی طاقت سے کچھ نہیں کر سکتے، مگر میں تجھے اپنے ان پنجوں سے مروڑ کر رکھ دوں گا۔" وہ یہ کہتے ہی باواجی کی طرف اچھلا مگر دوسرے ہی لمحے ایک مافوق الفطرت واقعہ ہوا اور لوگوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔

منصور خان جس زور سے باواجی کی طرف کودا تھا، اس سے دوگنی طاقت میں وہ الٹی قلابازی کھا کر کئی گز پیچھے لڑھکتا چلا گیا اور جب رکا تو اس کا سر اکھاڑے کی نرم مٹی میں دھنس چکا تھا اور ٹانگیں آسمان کی طرف ستون کی طرح اکڑ گئی تھیں، اس کے دونوں بازو سیدھے اکڑ گئے۔ اس کے بدن میں ذرا بھی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی پتھر کے بت کو سر کے بل زمین میں گاڑ دیا گیا ہو۔ لوگ حیران تھے کہ منصور خان کے ساتھ ہوا کیا ہے، مگر یہ صرف باواجی ہی جانتے تھے کہ اس بدنصیب کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا ہے۔

باواجی اطمینان سے منصور خان کی طرف بڑھے اور پانچ فٹ دور کھڑے ہو کر اپنی انگشت شہادت سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے منصور خان دھڑام سے چاروں شانے چت پڑا تھا۔

باواجی جوان تھے، اگرچہ ریاضت نے انہیں اپنے نفس پر دسترس عطا کی تھی مگر جب جوانی کی سرکش موجیں انسانی جذبات کو مہمیز دیتی ہیں تو کئی بار دماغ تپ بھی جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت باواجی کے ساتھ بھی ہوا اور جلال کی کیفیت میں بے قابو ہو گئے تھے اور انہوں نے دنیا کے سامنے اپنے بھید کھول دیے تھے۔

"اوئے بدبخت منصورے! اٹھ اور میری پگڑی اپنے ناپاک قدموں تلے روند ڈال۔" باواجی بے سدھ لیٹے منصور کی طرف بڑھے اور ایک بار پھر شہادت کی انگلی اس کی طرف سیدھی کر دی۔

منصور خان کسی موکل اور سحر زدہ انسان کی طرح کھڑا ہو گیا۔ باواجی اس کے قریب ہوئے اور اس کی آنکھوں میں اپنی قہر آلود آنکھیں گاڑ دیں۔ برسوں کی ریاضت نے ان کی آنکھوں میں پراسرار چمک بھر دی تھی۔ ان کی آنکھوں سے نفرت کے سیاہ بادل اٹھے اور منصور کی آنکھوں پر چھا گئے۔ اس کی روشنی سے بھرپور آنکھوں میں اندھیرے اتر گئے۔ اسے یوں لگا جیسے آگ کی ایک روشن سلاخ اس کی آنکھوں میں پھیر دی گئی ہو، وہ زخمی بھینسے کی طرح ڈکرایا:

"لوگو! مجھے بچاؤ۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" منصور خان نے اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر پیچھے کی طرف ہٹنا چاہا مگر وہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکا۔ اسے یوں لگا جیسے پیٹ سے نیچے کا دھڑ پتھر کا ہو گیا ہے۔ اسے باواجی کی پراسرار قوتوں نے بے بس کر دیا تھا اور اس کا اوپر کا دھڑ نیچے والے بے جان پتھریلے دھڑ پر یوں ڈولنے لگا جیسے کپڑا ہوا سے لہرانے لگتا ہے۔

پھر یکایک سرد ہوا کا ایک تیز بگولا نمودار ہو گیا جس نے منصور خان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یوں لگا جیسے برف پوش پہاڑوں سے تیز برفیلی ہوائیں یہاں اتر آئی ہوں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سرد بگولا صرف منصور خان تک محدود تھا جبکہ پورے مجمع تک اس کی ایک بھی لہر نہیں پہنچ رہی تھی۔ سرد بگولا جب رکا تو منصور خان کی جگہ برف کا ایک مجسمہ، استادہ نظر آیا۔ لوگ حیران و پریشان ہو کر کبھی اس مجسمے کو اور کبھی باواجی کو دیکھتے جبکہ باواجی تو ان

سب سے جیسے بے پرواہو گئے تھے۔ وہ بھول ہی گئے تھے کہ ان کے گردان کے گائوں کے لوگ کھڑے ہیں اور میلے میں شرکت کرنے والوں کا بھی ایک ہجوم وہاں اکٹھا ہے۔ اسی لمحے مجمع میں حرکت پیدا ہوئی اور لوگ دبے پائوں وہاں سے کھسکنے لگے۔ یہ سب منصور خان کے حواری تھے۔ وہ جیسے ہی مجمع کے حصار سے باہر نکلے، ان کے قدم ایک گرجدار آواز نے روک لیے۔ "تم کہاں بھاگنے لگے ہو؟ اپنے یار کو تو ساتھ لیتے جائو۔" باوا جی ان سب کے خوف سے لرزتے چہروں کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "تم تو گائوں کے چودھری ہو۔ چودھری ڈرپورک نہیں ہوتے۔ آگے بڑھو اور اس سادھو اور مست ملنگ سے دو دو ہاتھ کرو۔"

وہ باوا جی کی آنکھوں اور لہجے کی تاب نہ لا سکے اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے: "نہال شاہ جی! ہمیں معاف کر دو، ہم نے تم کو پہچاننے میں غلطی کی ہے۔ قسم لے لو آئندہ جو ہم تمہارے بارے میں کوئی بھی غلط بات سوچیں۔"

ان سب کے سر ندامت اور خوف سے جھکے ہوئے تھے، اسی لمحے باوا جی کا منشی ان کے قریب آ گیا۔ اس نے باوا جی کی کالی چادر ان کے کاندھوں پر ڈال دی۔ باوا جی نے اپنے عمر رسیدہ منشی کو سرد نگاہوں سے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ان کا جلال کافور ہو گیا۔ انہوں نے چادر کی بکل ماری اور خاموشی سے اپنی حویلی کی جانب چل دیے۔

باوا جی نہال شاہ سیدھے اپنے حجرہ میں پہنچے تھے۔ کمرہ لوبان اور عنبر کی مدہوش کن خوشبو سے معمور تھا۔ ایک گوشے میں تیل کا دیا روشن تھا۔ حویلی کے ایک کمرے کو باوا جی نے اپنے لیے حجرے کی صورت میں ترتیب دیا تھا اور اپنے شب و روز اسی کمرے میں بسر کرتے۔ حجرے کے بیچ میں ایک چٹائی بچھی تھی جس پر سفید چادر اور گائو تکیہ پڑا تھا۔ یہ باوا جی کا بستر تھا۔ وہ چارپائی کی بجائے زمین پر سوتے تھے۔ حجرے میں چھوٹے چھوٹے لکڑی کے صندوق بھی پڑے تھے جس میں نایاب جڑی بوٹیاں تھیں۔ ان جڑی بوٹیوں سے وہ ادویات بناتے تھے۔

مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد باوا جی چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور طرطوش کی حاضری لگانے لگے وہ جب سے حویلی آئے تھے، ان کی طرطوش جن سے باقاعدہ ملاقاتیں جاری تھیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد حجرہ بھاری بھاری سانسوں سے بھر گیا، ملگجے اجالے میں ایک بھاری بھرکم وجود باوا جی کے سامنے پیش ہوا۔ یہ طرطوش جن تھا جو انسانی روپ میں باوا جی کے پاس آتا تھا۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ گندمی رنگ، موٹی موٹی سرمگیں سحر انگیز آنکھیں، کاندھوں تک سفید زلفیں اور سفید ڈاڑھی اور فولاد میں ڈھلا ہوا حرارت آمیز بدن۔ وہ دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور باوا جی اس سے نایاب جڑی بوٹیوں اور مہلک ترین امراض کا درس لینے لگے۔ دونوں خاصی دیر تک حکمت کی گرہیں کھولتے رہے۔ جب طرطوش کے واپس جانے کا وقت ہوا تو اس نے باوا جی سے اجازت طلب کی اور جاتے جاتے بولا: "نہال شاہ! میں آج آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمائیں!" باوا جی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"آج آپ نے جلالت کا جو روپ اختیار کیا ہے، یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔ آپ نے منصور خان کو اس کی گستاخی کی اس قدر کڑی سزا دی ہے کہ ہماری برادری میں بھی یہ بات پھیل گئی ہے کہ طرطوش کا یار اپنی طاقت کے گھمنڈ میں انسانوں پر ظلم کر رہا ہے۔"

باوا جی اطمینان سے بولے: "طرطوش! تم درست کہتے ہو، میں بھی جانتا ہوں کہ مجھے کس وقت کیا کرنا ہے۔ تمہیں اعتماد ہونا چاہیے کہ تمہارا دوست کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔"

"میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آج کل ہمارے قبیلے کے باغی خاصے سرکش ہو گئے ہیں۔ مجھے ان کے معاملات نے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ باغی، سردار کو میرے خلاف بھڑکا رہے ہیں اور انہوں نے ایک آدھ بار میرے شاگردوں پر حملے بھی کیے ہیں، اس لیے ہمیں بہت محتاط ہونا پڑتا ہے۔"

"میں اس معاملے میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟ مجھے آپ اپنے باغیوں کے سرغنے کا نام بتائیں۔ میں اسے اپنا مطیع کر کے کمزور بنا دوں گا اور وہ آئندہ آپ کے سامنے سر اٹھانے کی جرات نہیں کرے گا۔"

طر طوش، باواجی کی پیشکش سن کر حیرت سے بولا: "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! کیا واقعی آپ یہ کام کر سکتے ہیں؟"

باواجی مسکرائے: "طر طوش! کیا تمہیں یہ بات یاد نہیں رہی کہ تمہیں ہم تک پہنچانے والی قوت نے ہمیں کیا کچھ دے رکھا ہے۔"

طر طوش شرمسار ہو گیا۔ "ہاں! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ 800 سال کی عمر میں حافظہ کمزور پڑ ہی جاتا ہے۔ ہم میں بھی انسانوں جیسی کمزوریاں، خامیاں اور بیماریاں موجود ہیں۔"

"پھر تو آپ کو حافظہ مضبوط کرنے کی دوا کھلانی چاہیے۔" باواجی مسکرائے۔

طر طوش جنات کی مخلوق میں مستند اور حاذق طبیب مشہور تھا، لیکن جب باواجی نے اسے دو تین جڑی بوٹیوں کے مرکبات سے دوا بنانے کا طریقہ سکھایا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا اور باواجی کے دونوں ہاتھ تھام کر عقیدت سے بولا: "نہال شاہ جی! آپ تو ہم جنات سے زیادہ حاذق ہیں اور..." طر طوش کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ حجرے میں کسی تیسرے کی سانس محسوس ہوئی۔

باواجی ایک دم دہاڑے: "تو نے دبے پائوں حجرے میں آنے کی جرات کیسے کی؟"

"یہ میں ہوں باواجی!" ایک نوخیز جن لہولہان حالت میں حاظر ہوا۔

طر طوش اسے دیکھ کر قدرے گھبرایا اور پوچھا: "مستان تجھے کیا ہوا ہے؟"

مستان اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر روتے ہوئے بولا: بابا حضور! مجھے گورداس نے مارا ہے۔"

"گورداس... اس کی یہ جرات...." طر طوش غصے سے کانپنے لگا اور اس کی آواز سے حجرے میں تلاطم بپا ہو گیا۔ اس نے باواجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "یہ گورداس باغیوں کا سردار ہے، باواجی۔ مستان میرا شاگرد ہے، اسے میں نے جڑی بوٹیاں لانے کے لیے کشمیر بھیجا تھا۔ مجھے یقین ہے اس نے مستان کو کشمیر ہی میں مارا ہو گا، اس لیے کہ وہ ہماری حدود میں ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ میں آپ سے اجازت چاہوں گا اور بہت جلد ملاقات کے لیے حاضری دوں گا۔ اس دوران، میں گورداس کا معاملہ نپٹانے کی کوشش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے تم جائو مگر یہ بات یاد رکھنا کہ اگر تم ہمارے دوست ہو تو ہم بھی تمہارے دوست ہیں۔ تمہارے دشمن ہمارے دشمن ہیں۔ جب آئو تو گورداس کے سارے کوائف لیتے آنا۔ میں اس شیطان کو بھسم کر کے رکھ دوں گا۔" باواجی نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔

"میں سردار سے اجازت حاصل کرنے کے بعد گورداس کے کوائف دوں گا، باواجی!" طر طوش بولا۔ "ہم اپنے ضوابط کی رو سے اپنے دشمنوں کو مارنے سے پہلے سردار کی اجازت لینے کے پابند ہوتے ہیں۔"

طر طوش مستان کو لے کر واپس چلا گیا اور باواجی چٹائی پر اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ وہ اپنی پراسرار طاقتوں کو مجتمع کر کے اپنا وجود سمیٹ رہے تھے، کچھ ہی دیر بعد وہ چلے کی حالت سے باہر آ گئے اور پھر اپنے زمینی بستر پر سو گئے۔

ان کو سوئے کچھ ہی دیر گزرتی تھی کہ حجرے پر ایک محتاط دستک ہوئی، وہ جلدی سے بیدار ہوئے اور دروازہ کھول دیا۔ باہر چادر میں لپٹی ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے چادر سرکا کر گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ باواجی نے سوچا یہ عورت حویلی کی چاکر ہو گی، چنانچہ وہ دروازے سے باہر آ گئے اور بولے: "کیا بات ہے؟ اس وقت کیوں آئی ہو؟"

"میں..." عورت کچھ بولتے ہوئے جھجک سی گئی۔

"بولتی کیوں نہیں؟ کیا بات ہے؟" باواجی نے ذرا تلخی سے کہا۔

عورت قدرے گھبرائی اور اپنا گھونگھٹ سرکا کر اپنا چہرہ عیاں کر دیا۔ باواجی ایک لمحے کے لیے اس کے حسن کی تاب نہ لا سکے، لیکن انہوں نے اپنے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے پوچھا:

"کون ہو تم؟ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی؟"

"میرا نام روشن ہے۔" وہ جھجک کر بولی۔ "منصور خان کی چھوٹی بہن ہوں۔"

باواجی، منصور خان کا نام سنتے ہی حجرے سے باہر آ گئے۔ "تو یہاں تک کیسے پہنچی ہے۔"

"آپ اس حویلی کے پرانے باسی ہیں مگر شاید ان چور دروازوں کو نہیں جانتے جو اس حویلی کی دیواروں میں چھپے ہیں۔" روشن آہستہ سے گویا ہوئی: "میں ان چور دروازوں کو جانتی ہوں۔"

باواجی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: "میں کل صبح تک یہ چور دروازے بند کر دوں گا۔"

"آپ میرے بھائی کو معاف کر دیں۔" وہ لجاجت سے بولی۔

باواجی نے کہا: "ہم تمہاری بات کا مان رکھ لیتے ہیں، اب گھر جاؤ۔ صبح منصور خان گھر آ جائے گا۔"

روشن نے ممنونیت سے باواجی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں تشکر سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ زبان سے کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر کسی حجاب نے اس کے لب سی دیے۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ باواجی اسے واپس جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ وہ حجرے میں واپس آئے اور چٹائی پر دراز ہو گئے... یہ رات باواجی نے کشمکش میں گزار دی اور سحری کے وقت نماز ادا کرنے کے بعد وہ حسب معمول اپنے کھیتوں کی طرف نکل پڑے، لیکن آج انہیں اپنے کسی مراقبے میں قرار نہیں آ رہا تھا۔ وہ بہت جلد واپس حویلی آ گئے، اور اپنے نفس سے لڑتے رہے۔ آخر کار جب سورج طلوع ہوا تو ان کے دل نے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

روشن کی خاموش آنکھوں نے انہیں جذبات کے تلاطم میں مبتلا کر دیا تھا، لہٰذا انہوں نے اپنے نفس پر قابو پانے کے لیے اپنی پسندیدہ جگہ پر جا کر چھ ماہ کا چلہ کاٹنے کا فیصلہ کیا اور اسی روز کسی کو بتائے بغیر ایک بار پھر حویلی سے غائب ہو گئے۔

واپس فہرست پر جائیں

حسین چمارن اور ٹھاکر

ہوشیار پور سے ذرا آگے ایک پہاڑی تھی جس پر ہندوئوں کا "ارجنی کا میلہ" لگتا تھا۔ باواجی پہاڑی کی ایک ہموار چٹان پر بیٹھ جاتے اور وہاں پہروں چلہ کشی میں غرق رہتے۔ یہاں سے بستی کی گزرگاہیں اور کھیت کھلیان صاف نظر آتے تھے، مگر کسی کو باواجی کا یہ مسکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ باواجی کو پہاڑی مسکن پر آئے چھ ماہ بیت گئے تھے اور اب وہ دوبارہ اپنی زندگی کی طرف لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے گائوں واپس جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اگلے روز ان کو واپس جانا تھا۔ جانے سے پہلے وہ کچھ وقت کے لیے چلہ کاٹنے لگے۔ انہیں کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ ان کے حساس کانوں نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر اپنی روحانی طاقت سے دیکھ لیا کہ ایک نوجوان بوڑی کنویں کی طرف جا رہا ہے، تو اسے مخاطب کیا:

"تو ادھر کیا لینے جا رہا ہے بنتو؟"

دبے دبے پائوں پہاڑی گزرگاہ سے گزرنے والا وہ جواں سال غریب اپنا نام سن کر گھبرا گیا، اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"اوپر آ جا بنتو! پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ آ۔" باواجی نے اسے پکارا۔

بنتو چمار نے اپنے ہاتھ میں مٹی کا کوزہ اٹھا رکھا تھا۔ اس نے اپنے سامنے والی پگڈنڈی کی جانب نظر دوڑائی اور کسی سحر زدہ انسان کی طرح اس طرف ہو لیا۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر اس کی باواجی پر نظر پڑی اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

وہ باواجی کو دیوتاؤں کا اوتار سمجھ کر ان کے قدموں میں جھک گیا مگر باواجی نے اسے کاندھے سے پکڑا اور دھیرے سے کہا: "اٹھ پاگل لڑکے! مجھے سجدہ نہ کر۔ میں کسی بھگوان کا اوتار نہیں، میں تو اپنے اللہ کا حقیر بندہ ہوں۔" انہوں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کٹورے کی طرف دیکھا اور آہستگی سے پوچھا: "اس میں پانی لینے جا رہا ہے تو؟"

"جی پربھو..." بنتو مسکینی سے بولا۔ "میری پتنی بیمار ہے سرکار۔"

"اور اس نے تجھے بوڑی کنویں کا پانی لانے کے لیے کہا ہے۔"

"جی۔ جی سرکار۔"

"... اور تو پانی لانے کے لیے چل دیا۔" باواجی نے اس سے سوال کیا۔ "تو نہیں جانتا کہ بوڑی کنویں کا پانی لانے والا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔"

"جانتا ہوں سرکار! بنتو چمار ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "پر میں نے سنا ہے کہ بیمار پتنی کے لیے پانی لانے والے کو کنواں کچھ نہیں کہتا۔"

باواجی مسکرائے اور بولے: "کنواں کسی کی نیت نہیں جانتا۔ وہ تو خونی ہے اور اپنے پانی کے بدلے خون پیتا ہے۔"

بنتو، باواجی کی بات سن کر لرز گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر باواجی نے کہا:

"احمق آدمی! تو موت سے لڑنے جا رہا ہے۔ لے میں تیرا مسئلہ حل کر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے مراقبے کی کیفیت میں اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دوسرے ہی لمحے وہ بنتو چمار کو دیکھتے ہوئے بولے:

"تیری پتنی بیمار نہیں۔ وہ ڈھونگ رچا رہی ہے۔"

"نن... نن... نہیں سرکار! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے تو کالی کی وسوگند کھائی ہوئی ہے۔ روشنا ہرجائی نہیں ہو سکتی۔"

"میں جانتا ہوں تو میری بات کا یقین نہیں کرے گا بنتو! اس کا حل یہی ہے کہ میں تجھے بوڑی کے کنویں سے بچا لوں۔" یہ کہہ کر باواجی نے فضا میں ہاتھ گھمایا اور دوسرے ہی لمحے ان کے ہاتھ میں ایک پھڑ پھڑاتی چڑیا آ گئی۔

"یہ چڑیا تیری جان کا صدقہ ہے۔ پانی نکالنے سے پہلے اس کو کنویں کی طرف پھینک دینا، اس کے بعد ڈول سے پانی نکال لینا اور ادھر میرے پاس واپس آ جانا۔"

ڈرا سہا بنتو کنویں کے قریب پہنچا اور چڑیا اس کی طرف اچھال دی۔ اس نے ابھی اپنے پر کھولے ہی تھے کہ کسی پراسرار بے آواز لہر نے اسے اپنے سحر میں لے لیا اور غڑاپ سے کنویں کے اندر چلی گئی۔ بنتو نے جلدی سے ڈول پکڑا اور اسے کنویں میں پھینک کر پانی نکال لیا۔ پھر جلدی سے کٹورہ پانی سے بھرا اور واپس بھاگا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے ایک بار بھی پلٹ کر دیکھا تو وہ پتھر کا ہو جائے گا۔

وہ ہانپتا کانپتا پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا اور پانی سے بھرا کٹورہ باوا جی کے سامنے رکھ دیا۔ "یہ لیں سرکار، میں پانی لے آیا ہوں۔"

باوا جی نے اطمینان سے کٹورہ اٹھایا اور اس کا پانی اپنے کٹورے میں ڈال دیا۔ پھر اپنے گھڑے کا پانی بنتو کے کٹورے میں ڈال کر کہا: "یہ لے اور اپنی پتنی کو سادہ پانی پلا دے۔" بنتو بے چارہ پریشان ہو گیا۔ باوا جی مسکرائے اور اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے: "تیری پتنی کو بوڑی کے کنویں کا پانی نہیں چاہیے تھا، وہ تیری جان لینا چاہتی ہے۔"

"سرکار! مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آری کہ وہ میری جان کیوں لینا چاہتی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آج تک ہمارے درمیان لڑائی نہیں ہوئی۔ اس نے آج تک مجھے تنگ نہیں کیا، پھر وہ میری جان کی دشمن کیسے بن گئی؟"

باوا جی حسب معمول مسکرائے۔ "اس کا جواب تجھے چند روز بعد ہی مل جائے گا۔ فی الحال تو یہ پانی اپنی بیمار پتنی کو پلا دے۔"

بنتو نے سادہ پانی کا کٹورہ اٹھایا اور بستی کی طرف چلا گیا۔ تمام راستے وہ باوا جی کی باتوں ہی میں الجھا رہا، لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے ان کی باتوں کو ایک دیوانے کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور گھر کا دروازہ پار کرتے ہی زور زور سے چلایا:

"روشنا! اری او روشنا! دیکھ میں تیرے لیے پانی لے آیا ہوں۔"

روشنا نے بنتو کی آواز سنی تو جلدی سے رسوئی سے باہر نکلی۔ وہ حیران پریشان سی بنتو کو دیکھنے لگی۔ "تجھے بوڑی کنویں نے کچھ نہیں کیا؟" روشنا بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "تو کہیں اور جگہ سے تو پانی نہیں لے آیا؟"

"لے! بھلا اور کہاں سے لانا تھا۔" بنتو نے پانی کا کٹورہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور جھوٹ کا سہارا لے کر بولا۔ "لوگ تو ایسے ہی بوڑی کنویں کی کہانیاں بناتے ہیں، مجھے تو اس نے کچھ نہیں کہا روشنا"

روشنا کٹورہ پکڑ کر اس کا پانی دیکھنے لگی اور پھر یکایک اس نے ایک جھرجھری لی اور پانی کا کٹورہ اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے گر پڑا۔ بنتو اس کی یہ حرکت دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔ "کیا ہو گیا ہے تجھے روشنا! تو نے یہ پانی کیوں گرا دیا ہے؟"

"بنتو! مجھے سنبھالا دو میں گئی۔" روشنا اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے چیخی۔ بنتو کے تو ہاتھ پائوں پھول گئے، اس نے روشنا کو اپنے بازوئوں کے حصار میں لے لیا اور اسے سہارا دے کر صحن میں بچھی چارپائی پر لا بٹھایا۔ روشنا چارپائی پر بیٹھتے ہی یکدم دھڑام سے گری اور تڑپنے لگی۔

"بنتو! میں گئی۔ ہائے بنتو، میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگا ہے۔ جا بھاگ کر سنیاسی کو لے آ۔" روشنا دہائی دینے لگی۔

بنتو نے یہ سنتے ہی باہر کو دوڑ لگا دی اور تھوڑی دیر بعد ہی گائوں کے سنیاسی کو لے آیا، لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی وہ روشنا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اچھی بھلی ہو چکی تھی اور آرام سے چارپائی پر بیٹھی تھی۔ روشنا، سنیاسی جی کو دیکھتے ہی بولی: "بنتو! میں اب ٹھیک ہوں۔ سنیاسی جی کو تو نے کیوں تکلیف دی ہے؟" وہ چارپائی سے اٹھی اور سنیاسی جی کو چارپائی پر بٹھا کر بولی: "سرکار! بنتو تو ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ آپ بیٹھئے میں آپ کے لیے دودھ لاتی ہوں۔" بنتو، روشنا میں یکایک یہ تبدیلی دیکھ کر ٹھٹک گیا اور اسے باوا جی نہال شاہ کی باتیں یاد آنے لگیں، مگر وہ خاموش ہی رہا۔

روشنا نے سنیاسی جی کی دودھ سے سیوا کی اور ان کے جاتے ہی اس کے تیور بدلنے لگے۔

"بنتو! تجھے مجھ سے پریم نہیں، اگر تو سچا ہوتا تو میری یہ حالت نہ ہوتی۔"

"لیکن... بھلی مانس، میں نے کیا کیا ہے؟" وہ روشنا کے تیور دیکھ کر ایسا گھبرا گیا کہ اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

"اچھا تو تجھے اس چوٹی والے چلہ باز نے ورغلایا ہے اور تو اپنی روشنا سے دھوکا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔" روشنا تلخی سے بولی۔

"لیکن اب میں تیرے لیے سچ مچ بوڑی کا پانی لے کر آئوں گا۔ بس تو ایک بار مجھے معاف کر دے۔" بنتو اپنی جوان بیوی کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ روشنا اس سے بیس سال چھوٹی تھی اور وہ تو ایک عام سی صورت والا مریل اور چیچک زدہ انسان تھا۔ یہ بات تو ساری بستی میں مشہور تھی کہ روشنا ہر دوسرے روز بنتو کی پٹائی کرتی ہے مگر وہ بیوی پرست آگے سے چوں بھی نہیں کرتا۔ اس روز بھی روشنا نے بنتو کو دھنک کر رکھ دیا اور اسے خبردار کیا کہ اگر اب اس نے اس چلہ باز کی طرف جانے کی جرات کی تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے گی۔

اس روز بنتو آگے سے ہاتھ جوڑ کر منمنایا تھا: "بس اب نہیں جائوں گا۔ میرا وشواش کرو۔"

اس بات کو گزرے دو روز ہوئے تھے کہ روشنا نے بنتو کو ایک اور امتحان میں مبتلا کر دیا۔ اس نے فرمائش کی: "تو جانتا ہے کہ میں ماں بننا چاہتی ہوں۔ مجھے سنیاسی جی نے کہا ہے کہ شیرنی کا دودھ پیئے گی تو بیٹا جنے گی۔ اب تو جنگل میں جا اور شیرنی کا دودھ لے کر آ۔ دیکھا اگر تو دودھ لے کر نہ آیا تو مجھے صورت بھی نہ دکھانا۔" روشنا کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا، بے چارہ بنتو اس کے آگے گڑگڑا رہا تھا، التجائیں کر رہا تھا، لیکن روشنا نے اسے شیرنی کا دودھ لانے کے لیے آمادہ کر ہی لیا اور بنتو گھر سے شیرنی کا دودھ لانے نکل کھڑا ہوا۔

☆☆☆☆☆☆

باواجی کا چلہ پورا ہو چکا تھا اور اب انہوں نے بلاداد کے پہاڑی مسکن کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس روز موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ باواجی نے اپنا مختصر سا سامان اپنے تھیلے میں ڈالا اور پہاڑی سے اتر کر بلاداد کی بستی کی طرف چل دیئے تاکہ ہوشیار پور جانے سے پہلے بنتو چمار کی خیریت دریافت کر لی جائے۔ وہ پوچھتے تاچھتے اس کے گھر پہنچ گئے۔

بلاداد ایک مختصر سی بستی تھی اور یہاں زیادہ تر چمار ہی بستے تھے' البتہ بڑی ذات کے ٹھاکروں نے بستی کے درمیان بڑی سی حویلی بنائی ہوئی تھی۔ حویلی کیا تھی ایک پورے باغ کا منظر پیش کرتی تھی جس میں نارنگی اور آم کے درختوں کے علاوہ رنگ برنگ پھولوں کی بہار دکھائی دیتی تھی۔ ٹھاکر کہرام سنگھ اس بستی کا والی وارث تھا۔ بنتو چمار کا گھر ٹھاکر کی حویلی سے فقط دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ یہ کچا سا مکان ایک کمرے اور رسوئی پر مشتمل تھا لیکن اس کی یہ خوبی تھی کہ وہ حویلی کی طرف جانے والے راستے پر تھا۔

باواجی بنتو چمار کے دروازے پر پہنچے اور دستک دینے لگے تو معاً انہیں گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ انہوں نے بے اختیار ہو کر آواز کی جانب دیکھا تو حویلی کی طرف سے ایک گھڑ سوار گھوڑے کو دلکی چال چلاتے ہوئے ادھر آ رہا تھا۔ ایک قد آور اور ٹھوس جثے کا مالک سکھ شاہانہ انداز میں گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ باواجی نے اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد دروازے پر لگی کنڈی ہلا کر دستک دی اور بنتو کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران گھڑ سوار بھی ان کے سر پر آ پہنچا اور باواجی کی طرف دیکھ کر رعب دار آواز میں بولا: "اوئے سادھو! ان غریبوں مسکینوں کے گھر سے تجھے کیا خیرات ملے گی۔ جا اور اونچی ذات سے والوں سے کچھ مانگ"۔

باواجی نے پلٹ کر سکھ نوجوان کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر ۲۵ یا ۲۶ سال ہو گی۔ آنکھوں میں جوانی کا خمار اور لہجے میں تکبر اترا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے لہجے کو نظر انداز کیا اور تحمل کے ساتھ بولے: "سردار جی! میں سادھو نہیں اور خیرات لینے کے لئے دروازہ نہیں کھٹکھٹا رہا۔ میں تو بنتو سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تجھے اس سے کیا کام ہے؟" اس نے بگڑے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "تو اس کا لگتا کیا ہے؟ اس سے پہلے تو تجھے کہیں نہیں دیکھا"۔ "میں اس کا کچھ بھی نہیں لگتا اور نہ مجھے اس سے کوئی کام ہے۔" باواجی نے تحمل سے جواب دیا۔

"جب تجھے اس سے کوئی کام نہیں اور نہ تو اس کا کچھ لگتا ہے تو پھر کیا لینے آیا ہے؟" گھڑ سوار نے باواجی کا سر سے پائوں تک جائزہ لیتے ہوئے پوچھا پھر خود ہی

مشکوک انداز میں بولا "تو کہیں اس کی گھر والی سے تو نہیں ملنے آیا۔"

یہ سن کر باواجی کے اندر ابال سے اٹھنے لگا مگر انہوں نے کمال ضبط کے ساتھ کہا۔ "سردار جی آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میرا اس کی بیوی سے کیا واسطہ!"

سکھ گھوڑے سے اترا' اسے قریب ہی کھونٹے سے باندھا اور باواجی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "حیرت ہے بھئی! تو پھر تو آیا کیا لینے ہے؟"

اس دوران دروازہ کھل گیا اور بنتو چمار کی بیوی روشنا باہر آگئی۔ اس نے سردار جی کو دیکھتے ہی پرنام کیا' پھر جھک کر اس کے پائوں چھونے لگی تو اس نے روشنا کو بازو سے پکڑ لیا اور لگاوٹ کے ساتھ بولا "روشنا! تجھے کتنی بار سمجھایا ہے میرے پائوں نہ چھوا کر۔ تیری جگہ تو بلونت سنگھ کے دل میں ہے۔ پائوں میں جگہ تو ہم نے گائوں کی دوسری عورتوں کو دے رکھی ہے"۔

"سرکار! خیر تو ہے۔ اور یہ کون ہے؟" روشنا نے باواجی کی طرف دیکھ کر بے باکی سے پوچھا۔

"لے بھلا مجھے کیا معلوم یہ کون ہے۔ یہ تو تیرے پتی بنتو چمار سے ملنے آیا ہے اور تو مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ یہ کون ہے"۔ بلونت سنگھ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

روشنا نے حیرت کے ساتھ باواجی کا جائزہ لیا اور بولی: "کیا کام ہے تجھے بنتو سے؟"

"یہ تو میں بھی اس سے پوچھ چکا ہوں' اسے کوئی کام نہیں۔ مگر حیرت ہے یہ سادھو پھر بھی اس سے ملنا چاہتا ہے۔" بلونت سنگھ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

روشنا نے اب چونک کر باواجی کی طرف دیکھا اور پوچھنے لگی: "کہیں تم پہاڑی والے سادھو تو نہیں ہو۔ وہی جس نے بنتو کو بوڑی والے کنوئیں کا پانی نہیں لانے دیا"۔ باواجی نے اثبات میں سر ہلایا تو بلونت سنگھ اور روشنا نے ایک دوسرے کو عجیب سے انداز میں دیکھا۔ پھر روشنا ناک سکیڑ کر بولی: "اب تو پھر بنتو کو الٹی سیدھی سنانے آگیا ہے۔ جا چلا جا یہاں سے بنتو تجھے نہیں ملے گا۔ میں نے اسے شیرنی کا دودھ لانے کے لئے جنگل میں بھیج دیا ہے۔"

باواجی کو یہ تضحیک آمیز لہجہ گوارا نہ ہوا مگر انہوں نے دل کا ابال زبان پر نہ آنے دیا۔ بظاہر وہ ایک نحیف نزاد تھے' اس لئے انہوں نے دونوں کے ساتھ الجھنے سے گریز کیا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ الجھنے پر اگر بلونت سنگھ بدزبانی پر اتر آیا تو انہیں اپنے بچائو اور اسے سزا دینے کے لئے اپنی پراسرار قوتوں کو حرکت میں لانا پڑے گا۔ مگر یہ بات ان کے نفس کے خلاف جاتی تھی۔ اپنا غصہ دبانے کی کے لئے ہی تو وہ چھ مہینے سے پہاڑی مسکن پر چلہ کشی میں مصروف رہے تھے۔ اگر وہ اس سے الجھ پڑتے تو ان کی ساری ریاضت کے ضائع جانے کا خدشہ ہوتا' لہذا انہوں نے روشنا سے کہا: "روشنا! میں جا تو رہا ہوں مگر میری ایک بات سن لے۔ جو عورت اپنے مرد سے بے وفائی کرتی ہے' اسے کسی اور کی وفا بھی نہیں ملتی۔ تو اپنے معصوم شوہر کو مارنے کے لئے جو کچھ کر رہی ہے' یہ ٹھیک نہیں۔ میرے اللہ نے چاہا تو بنتو کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ زندہ سلامت اور کسی شیر کے مانند آئے گا۔ اس وقت تو چاہے گی بھی..... تو وہ تجھے چھوڑے گا نہیں اور نہ تجھے کوئی اور بچانے والا ہوگا۔" یہ کہہ کر باواجی نے بلونت سنگھ کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھا اور کہا: "بلونت سنگھ! تجھے اپنی جوانی اور چودھراہٹ پر بڑا

گھمنڈ ہے لیکن میں تجھے بھی کہے دیتا ہوں کہ طاقت کے نشے سے باہر نکل آ تیری خرمستیاں تیرے لئے عذاب بننے والی ہیں"۔ بلونت سنگھ کو باواجی کی یہ نصیحت راس نہ آئی اور اس نے انہیں زور سے دھکا دے دیا۔ باواجی اس کا زور آور دھکا سہہ نہ سکے اور لڑکھڑاتے ہوئے گر گئے۔ بلونت سنگھ نے انہیں کہا: "سادھو مہاراج! اب تیرے لئے یہی اچھا ہے کہ تو فوراً یہاں سے دفع ہو جا' ورنہ کرپان سے تیرا گلا کاٹ دوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے روشنا کا ہاتھ پکڑا اور بولا: "چل آ روشنا ہم چلتے ہیں۔" وہ روشنا کو ساتھ لئے اس کے گھر میں داخل ہو گیا اور دروازے کو کنڈی لگا دی۔ باواجی نے اس قدر بے عزتی پر کمال ضبط سے کام لیا اور کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور بنتو چمار کے بند دروازے پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے واپس چل دیئے۔ ان کا یہ سارا ضبط ان کی نفس کشی کا نتیجہ تھا ورنہ وہ اس قدر ضبط نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جوگ سنیاس کے خوگر نہ ہوتے تو بھی ان کی ایک اپنی پہچان تھی۔ وہ نمولیاں جیسے بڑے گاؤں کے وارث تھے۔ ان کی چودھراہٹ کا دائرہ کم از کم بلونت سنگھ کی جاگیروں سے زیادہ تھا۔ اس تناظر میں ان کا یوں بے عزت ہو جانا ان کی سبکی کے مترادف تھا۔ لیکن روحانیت کا منشا تبھی پورا ہوتا ہے جب آدمی اس کا بے جا استعمال نہ کرے۔

جنگل جنات اور باواجی

باواجی سر جھکائے پیدل ہی ہوشیار پور کی طرف روانہ ہو گئے۔ بلاداد کی بستی سے نمولیاں کا فاصلہ خاصا تھا۔ ایک رات اور دن کی مسافت کے بعد ہی پیدل چلنے والا اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا تھا۔ اس سے پہلے جب وہ ادھر آتے تھے تو گھوڑے پر سوار ہو کر آتے۔ اس دور میں گھوڑے کے سوا دوسری کوئی سواری ملنا انتہائی دشوار تھا۔ ویسے بھی راستہ پر صعوبت اور خطرناک تھا۔ کوئی اکیلا شخص اس قدر طویل سفر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ان دنوں سفر کرنے والے قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے کیونکہ راستے میں ڈاکوئوں اور جنگلی جانوروں کا خدشہ رہتا تھا۔ اس بار باواجی نے جب بلاداد سے نمولیاں کے لئے پیدل سفر کا ارادہ کیا تو اس کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ پیدل سفر کرنے سے صعوبتوں کو برداشت کرنے اور تزکیہ نفس کا موقع ملے گا۔

باواجی جب بلاداد سے چلے تو سورج ان کے سر پر تھا مگر اب مغرب کی گود میں سر چھپانے کیلئے اپنی روشنیوں کو تاریکیوں کے حوالے کر رہا تھا۔ تین چار گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد وہ گھنے جنگل کے نزدیک پہنچ گئے جو خوفناک جانوروں کا مسکن تھا۔ جنگل سے آگے چھوٹی بڑی پہاڑیاں تھیں اور اس کے بعد ہوشیار پور کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔

باواجی غیر معمولی قوتوں کے مالک انسان تھے اور پراسرار قوتیں ان کی مطیع تھیں اس لئے جنگلی جانوروں سے خوف کھانا ان کی شان کے خلاف تھا۔ وہ تو صرف اللہ سے ڈرتے تھے اور اللہ سے ڈرنے والا کسی قسم کا خوف دل میں نہیں لاتا۔ وہ ایک درخت کے نیچے اپنی چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ رات کی تاریکی میں جانوروں اور پرندوں کے شور نے طلاطم برپا کیا ہوا تھا مگر باواجی گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ اس وقت جنگلی حیات نیند کی وادیوں میں اتر رہی تھی اور شور قدرے کم ہو گیا تھا۔

باواجی نے حسب معمول طرطوش کی حاضری لگانی شروع کی اور چند ہی ثانیے بعد ماحول میں عجیب و غریب تبدیلی رونما ہوئی۔ جنگلی جانوروں نے چیخ پکار شروع کر دی' خاص طور پر جنگلی بلیاں اور کتے دردناک آوازوں سے چیخنے چلانے لگے تھے۔ پرندوں کے شور نے ان کی منحوس آوازوں میں شدت پیدا کر دی۔ طرطوش نے حاضر ہوتے ہی باواجی کو سلام کیا اور مسکراتے ہوئے بولا:

"باواجی! آج آپ کو جنگل کے اندر محفل سجانے کا خوب طریقہ سوجھا ہے۔ بے چارے سوئے ہوئے جانوروں کو جاگنا پڑ گیا ہے۔ اب جب تک میں یہاں موجود رہوں گا وہ یونہی روتے چلاتے رہیں گے"۔

باواجی عجیب لہجے میں بولے: "طرطوش! یہ تو اللہ کی عنایت ہے کہ اس کی ذات اعلیٰ نے جانوروں اور پرندوں کو تمہارے وجود کی پہچان کا علم دیا ہوا ہے۔

ایک اس دور کا انسان ہے جو تم جیسی اعلیٰ مخلوق کا وجود تسلیم ہی نہیں کرتا"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہر ایک کو نظر نہیں آ سکتے "طرطوش نے کہا۔ "ویسے بھی یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جب تک خود کسی چیز کو دیکھ نہیں لیتا' اس کا وجود تسلیم نہیں کرتا"۔

"نہیں طرطوش یہ بات نہیں۔ انسان بڑا حیلہ باز ہے۔ وہ آنکھوں دیکھی بات پر یقین کر لیتا ہے مگر بعد میں اس پر شک کرتا رہتا ہے اور کسی نہ کسی بہانے سے اس کی حقیقت کو جھٹلاتا رہتا ہے۔ انسان کو سمجھنا بہت مشکل ہے تم یوں سمجھو فرشتوں' جنات اور کائنات کی ہر جاندار شے کے اندر جو جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ انسان کے اندر ہیں۔ اس کی جبلت کا دائرہ کائنات سے ماوراء ہے۔ تمہاری مخلوق انسان کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اگرچہ جنات بہت سی طاقتوں کے مالک ہوتے ہیں' پھر بھی وہ انسان کی نہیں معراج کو چھو سکتے"

طرطوش باواجی کی باتیں انہماک کے ساتھ سن رہا تھا۔ وہ بولا اس آن اسے انسانوں کی بڑائی ناگوار گزری۔ وہ بولا "نہال شاہ! ہم انسان کی افضلیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر یہ کہنا کہ جنات انسانوں سے کم تر ہیں' درست نہیں۔ جنات بھی اللہ کی عبادت اور ریاضت کرتے ہیں اور اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح کہ انسان ہمارے ہاں بھی معاشرتی زندگی مختلف نظاموں کے تحت چلتی ہے۔ ہمارے بچے بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں' بیمار ہوتے ہیں' لڑتے جھگڑتے ہیں۔ گویا ہمارا طرز زندگی اور فکر و عمل انسانوں سے مختلف نہیں۔ ہماری معاشرتی اور سائنسی ترقی اگرچہ انسانوں کو نظر نہیں آتی مگر ہماری دنیا میں یہ سب موجود ہے۔ اب اگر آپ جنات اور انسان کا تقابلی جائزہ لیں تو جنات انسان سے کمتر نہیں بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ان میں انسانوں سے زیادہ خوبیاں ہیں تو غلط نہیں ہو گا"۔

باواجی طرطوش کا استدلال سن کر بولے: "تم ٹھیک کہتے ہو مگر یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ انسان جنات سے افضل ہے اور یہ میں نہیں کہتا' قرآن کہتا ہے' البتہ یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ انسان جنات سے افضل ہونے کے باوجود جسمانی طور پر اس سے کمزور ہے۔ اس لیے کہ انسان اپنی علمی خوبیوں سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ اپنی علمی طاقت کی بدولت جنات کو اپنا مطیع بنا سکتا ہے۔ انسان کو جو علم اور ذہن عطا کیا گیا ہے جنات اس سے محروم ہیں" باواجی نے انسان اور جنات کا تفاوت واضح کرتے ہوئے بتایا۔ "اللہ تعالیٰ نے فرشتوں' جنات اور انسانوں میں بنیادی تخصیص قائم کر دی ہے۔ فرشتے نور کی پیداوار ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان میں شر کی کوئی گنجائش نہیں۔ جنات آگ سے پیدا ہوئے ہیں' چنانچہ وہ نیک اور صالح ہونے کے باوجود بدی کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن انسان بظاہر جتنا بھی برا نظر آئے بہر حال اس میں اچھائی کا تناسب جنات کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ انسانوں اور جنات کی ارواح میں یہ فرق خالق کائنات نے قائم کیا ہے' اس لیے میں اور تم اس خلیج کو پاٹ سکنے سے رہے"۔

طرطوش کو باواجی کی یہ باتیں ناگوار گزر رہی تھیں لہذا انہوں نے موضوع بدل دیا اور طب کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ باواجی اور طرطوش کی یہ نشست معمول سے خاصی طویل ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں دوست دن چڑھے تک یونہی طب کی گتھیاں سلجھاتے رہیں گے۔ سحری سے کچھ دیر پہلے باواجی نے تہجد کی نماز ادا کی اور کچھ دیر کے لیے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ انہوں نے طرطوش کو اس کی دنیا میں واپس جانے کی اجازت دی تو وہ عقیدت و احترام کے ساتھ کہنے لگا: "نہال شاہ! میں چاہتا ہوں آج میرے شاگرد فجر کی نماز آپ کی امامت میں ادا کریں۔ اس وقت تک آپ کچھ دیر کے لیے آرام کر لیں' میں یہاں پہرہ دیتا ہوں۔

باواجی نے خوش دلی کے ساتھ اجازت دے دی اور طرطوش فجر ہونے تک باواجی کا پہرہ دیتا رہا۔ پھر اس نے باواجی کو جگایا اور اپنے ہاتھوں سے انہیں وضو کرایا۔ اسی اثنا میں طرطوش س کے شاگرد جنات بھی حاضر ہو گئے۔ جنگل کی تاریکی میں سفید لبادوں اور انسانی روپ میں ڈھلے ہوئے جواں قامت جنات کی ایک قطار نے باواجی کی امامت میں نماز ادا کی۔ نماز کے بعد باواجی نے تلاوت قرآن پاک کی اور انہیں چند فقہی مسائل بتائے۔

اب طرطوش کے واپس جانے کا وقت ہونے والا تھا۔ اپنی دنیا سے جدا ہوئے بہت وقت گزر گیا تھا۔ جانے سے پہلے معاًاسے کچھ یاد آ گیا اور اس نے کہا:

"نہال شاہ! میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا ہوں کہ بنتو چمار اسی جنگل میں موت کی ہچکیاں لے رہا ہے۔ جب آپ سو رہے تھے میں نے سارے جنگل کا گشت کیا تھا۔ اس دوران میری نظر اس پڑ گئی۔ وہ گہرے کھڈ میں پڑا ہے اور اس کی ٹانگ کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ میں نے اپنے ایک شاگرد کو اس کی حفاظت پر چھوڑ دیا تھا۔ اب آپ بتائیں اس کا کیا کرنا ہے"۔

باواجی نے جھٹ سے کہا: "اسے نکال کر ادھر لے آؤ"۔

طرطوش نے اپنے چہیتے مستان جن کو اشارہ کیا: "تم جاؤ اور اسے اٹھا لاؤ" پھر اس نے باواجی سے کہا "میں حیران ہوں وہ جنگل میں کیا لینے آیا تھا؟"

باواجی نے اسے 'بنتو چمار' اس کی بیوی اور بلونت سنگھ کا سارا قصہ سنا دیا۔ یہ سن کر طرطوش بھڑک اٹھا اور گرج کر بولا: "نہال شاہ! میں بلونت سنگھ کا گلا اس کی کرپان سے کاٹ دوں گا۔ اس بدکار کی یہ جرات کہ اس نے آپ کو دھکا دے کر گرایا اور بے عزتی کی۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔

"نہیں طرطوش! تم یہ نہیں کرو گے۔ میں نے جب اسے معاف کر دیا ہے تو تمہیں اس سے بدلہ لینے کی ضرورت نہیں۔"

اس دوران مستان 'بنتو چمار کو اٹھا کر لے آیا۔ باواجی نے اپنے تھیلے میں سے ایک چراغ نکالا اور جلا کر اس کی روشنی میں بنتو کا جائزہ لینے لگے۔ وہ بری طرح گھائل ہوا تھا اور اس کی دائیں ٹانگ جگہ جگہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ اس کے باوجود اس کی نبض چل رہی تھی۔ باواجی کے پاس اس وقت کوئی دوائی نہیں تھی ۔انہوں نے طرطوش کو چند ادویات لانے کے لیے کہا جو اس نے کچھ ہی دیر بعد حاضر کر دیں۔ باواجی نے بنتو کے پورے جسم پر ان ادویات کی مالش کی اور اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر چند جڑی بوٹیوں کا لیپ کرنے کے بعد اوپر کپڑا باندھ دیا پھر ایک پیالہ پانی میں دوائی گھول کر اس کے منہ میں قطرہ قطرہ ٹپکانے لگے

۔کوئی دس منٹ بعد اس نے سسکاری بھری اور آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے لگا۔ باواجی نے اسے مخاطب کیا تو "بنتو چمار باواجی کی آواز سنتے ہی ہڑبڑا اٹھا اور اس کی بے ہوشی کافور ہو گئی۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ پہلے اسے گمان ہوا کہ وہ خواب میں باواجی سے مل رہا ہے مگر باواجی نے اسے اپنی موجودگی کا یقین دلایا تو اس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ باواجی نے اسے بتایا کہ وہ انہیں کس حالت میں جنگل سے ملا ہے 'البتہ انہوں نے اسے یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ اسے جنات نے زخمی حالت میں دریافت کیا تھا اور وہی اسے اٹھا کر لائے ہیں۔

بنتو چمار باواجی کی عنایات جان کر زار و قطار رونے لگا اور ہچکیاں بھرتے ہوئے بولا: "سرکار! میں نے آپ کی بات نہ مان کر بہت بڑا پاپ کیا ہے اور اس کی کڑی سزا بھی بھگتی ہے۔ آپ مجھے شما کر دیں" اس نے باواجی کے پاؤں پکڑ لیے اور اپنا سر ان کے قدموں میں رگڑنے لگا: بنتو کی اس حرکت پر مستان کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ہنسنے کی اس عجیب و غریب آواز پر بنتو نے یکدم رونا بند کر دیا اور چونک کر سر اٹھا کر گرد و پیش میں دیکھنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ باواجی تو اس طرح کبھی نہ ہنسے ہوں گے کیونکہ یہ آواز تھی ہی غیر انسانی۔

باواجی کو مستان کا یوں ہنسنا اچھا نہ لگا اور انہوں نے اسے جھڑک دیا "دفع ہو جاؤ۔ اور تم بھی جاؤ"۔ انہوں نے مستان اور اس کے ساتھیوں سے کہا تو بنتو چمار ایک بار پھر ان کے قدموں میں گر گیا اور رونے لگا۔

"باواجی سرکار مجھے قدموں سے جدا نہ کریں"۔ وہ سمجھا تھا کہ باواجی نے اسے جھڑکا ہے۔ باواجی کو اس کی غلط فہمی اندازہ ہو گیا تھا۔ لہذا انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "بنتو! اب اٹھو اور میری بات غور سے سنو۔" بنتو چمار میکینکی انداز میں یوں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا جیسے اس کے بدن میں کسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہی نہیں تھی۔ وہ ایک صحت مند انسان کی طرح حرکت کر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

یہ باواجی کی دوائیوں کا حیرت انگیز اثر تھا کہ اس کے سارے زخم مندمل ہو گئے تھے اور جسم میں توانائی بھی رواں ہو گئی تھی 'البتہ اس کی ٹانگ کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے جوڑ ابھی تک جدا تھے مگر اسے کوئی درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

باواجی نے بنتو چمار کو اس کی بیوی اور بلونت سنگھ کے تعلقات سے آگاہ کیا اور سمجھایا: "دیکھو بنتو! جو بندہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا 'وہ بے غیرت کہلاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ آدمی جسمانی طور پر طاقتور ہی ہو تو اپنی غیرت کا اظہار کر سکے۔ غیرت تو چیونٹی جتنی بھی ہو تو ہاتھی جیسے پہاڑ کو مار دیتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا

کہ تم بلونت سنگھ کو جان سے مار دو' اگرچہ وہ اسی سلوک کا مستحق ہے مگر میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم روشنا کو چھوڑ دو۔ وہ کبھی تمہاری ہوئی ہے نہ ہو سکے گی۔ وہ ایک ڈائن ہے اور جب بھی اسے موقع ملا تمھیں کھا جائے گی۔ اگر تو زندہ رہنا چاہتا ہے تو غیرت کے ساتھ جی اور مرنا ہے تو جی داروں کی طرح مر۔"

بنتو چمار باواجی کی باتیں سن کر شرمندگی سے زمین میں گڑ گیا۔ وہ بولا: "باواجی سرکار! میں جانتا ہوں کہ روشنا بلونت سنگھ کی رکھیل ہے مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ وہ گاؤں کے والی وارث ہیں۔ ہم ان کا ہی دیا کھاتے ہیں اور ہماری جانوں پر انہیں مکمل اختیار حاصل ہے۔ یہ میری بد قسمتی ہے کہ سارے گاؤں میں روشنا سے بڑھ کر کوئی اور خوبصورت ناری نہیں۔ اگرچہ وہ میری پتنی ہے مگر صرف نام کی حد تک۔ بلونت سنگھ سے پہلے اس کا باپ کہرام سنگھ روشنا پر نظر رکھے ہوئے تھا مگر بیٹے کو جب روشنا نظر آئی تو اس نے اپنے باپ سے بات کی۔ بلونت اپنے باپ کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد ہے۔ اس لیے کہرام سنگھ اس کے راستے سے ہٹ گیا اور اس نے روشنا کے سارے حقوق بیٹے کے نام کر دیے۔ اب آپ ہی بتائیے باواجی! میں کیا کروں؟ آپ کہتے ہیں میں غیرت کے ساتھ زندہ رہوں۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ مجھے غیرت کے ساتھ کون جینے دے گا؟ یہ کہہ کر بنتو رونے لگا اور بولا: "باواجی! روشنا مجھے اپنی قربت کے جھانسے دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اولاد پیدا نہیں کر سکتی۔ اسے کوئی بیماری ہے۔ مگر مجھے اولاد کا بڑا جنون ہے۔ اسی لیے تو کبھی بوڑی کے کنویں سے پانی لانے پر راضی ہو جاتا ہوں اور کبھی شیرنی کے دودھ کی خاطر جان خطرے میں ڈال لیتا ہوں۔ آپ نے پہلے بھی مجھے بتایا تھا کہ روشنا وفا کی دیوی نہیں مگر میں اس کی باتوں میں آ کر بہل گیا تھا اور شیرنی کا دودھ لینے اس جنگل میں آ گیا تھا۔" اس کے بعد بنتو نے باواجی کو بتایا کہ کس طرح جنگل میں داخل ہوتے ہی وہ خوفزدہ ہو گیا اور جنگلی جانوروں کی آوازیں سن کر بھاگ اٹھا مگر جھاڑیوں میں الجھ الجھ کر گرنے اور خوف کی شدت سے حواس باختہ ہو کر وہ ایک گڑھے میں گر گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

باواجی نہ جانے بنتو چمار میں اس قدر کیوں دلچسپی لے رہے تھے۔ انہیں اس معصوم اور کمزور انسان سے ایک خاص انس ہو گیا تھا۔ تبھی وہ اس پر مہربان ہو رہے تھے۔ انہوں نے اس کی باتیں بڑے غور سے سنیں اور کہا: "بنتو! میں تیرا درد جانتا ہوں مگر تیرے اس درد کی دوا بھی میں ہی بنوں گا۔ آج سے میں تیرا سایہ بن کر رہوں گا۔ بس تو اپنے اندر حوصلہ پیدا کر اور اپنی بستی میں واپس چلا جا۔ تیرے دشمن تیرا انتظار کر رہے ہیں۔"

باواجی کی باتوں نے بنتو کو حوصلہ دیا' اس کے اندر یقین کی چنگاری سلگنے لگی اور وہ خود پر اعتماد کرنے کے قابل ہو گیا۔ اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ باواجی فہال شاہ

جس طرح آڑے وقت میں اس کی مدد کو پہنچ رہے ہیں اس طرح مستقبل میں پیش آنے والی مشکلات میں بھی اس کی مدد کریں گے۔

باواجی کی ادویات نے بنتو کے زخم تو بھر دیے تھے مگر ابھی وہ اپنی ٹانگوں کے سہارے چلنے سے معذور تھا' لہذا باواجی نے اسے اپنے ساتھ نمولیاں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اگلی صبح وہ بنتو کو لے کر جنگل سے کسی طرح باہر نکلے۔ اس بارے میں یہ روایت ہم تک پہنچی ہے کہ انہوں نے اپنی پراسرار طاقتیں استعمال کرنے کے بجائے بنتو کو اپنے کاندھوں پر بٹھا لیا تھا اور پیدل ہی گھنے جنگل عبور کرنے لگے۔ بنتو خود حیران تھا کہ ایک نحیف شخص کس قدر آرام کے ساتھ ایک شخص کو اٹھائے پیدل چل رہا ہے۔ جنگل میں جانوروں کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ اور درندے بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ بنتو انہیں دیکھ کر خوف سے مرا جا رہا تھا مگر باواجی کی بے نیازی دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ انہیں جانوروں کا کوئی خوف نہیں تھا۔ اس کے لیے ایک حیران کن بات یہ بھی تھی کہ کسی بھی درندے نے ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا' البتہ جب وہ کسی وحشی جانور کے پاس سے گزر رہے ہوتے تو وہ عجیب انداز میں فضا میں کچھ تلاش کرنے لگتا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ فضا میں کسی نامانوس بو کو محسوس کر رہا ہو۔ بنتو کو اسی طرح کے حیران کن تجربات سے پالا پڑتا رہا اور انہوں نے کوئی ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد جنگل عبور کر لیا۔ آگے کھلے سرسبز شاداب لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں پھیلے ہوئے ان کھیتوں میں ہرن' چنکارے' جنگلی گھوڑے اور خرگوش گھوم پھر رہے تھے۔ باواجی نے ایک گھوڑے کو قابو کیا اور بنتو کو اس پر بٹھا کر خود بھی اس پر سوار ہو گئے اور پھر اسی گھوڑے پر سفر کرتے ہوئے نمولیاں آ گئے۔

بنتو اس وقت تک نمولیاں میں رہا جب تک وہ اپنی ٹانگوں پر چلنے پھرنے حتیٰ کہ دوڑنے کے قابل نہ ہو گیا۔ وہ باواجی کی سیوا میں لگا رہتا تھا۔ باواجی نے بھی اس پر خصوصی توجہ دی اور ان کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر ایک روز اس نے اسلام قبول کر لیا۔ باواجی نے اس کا اسلامی نام نوردین رکھ دیا۔

ایک مہینے بعد نوردین نے بلاداد جانے کے لیے رخت سفر باندھا اور باواجی سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے اسے نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ رخصت ہونے کی اجازت دی اور سمجھایا: "نوردین! اللہ نے تجھے اپنے نور سے فیض یاب کیا ہے تو اس نام کی لاج بھی رکھنا۔ اپنی بستی میں اسلام پھیلانے کی کوشش کرنا۔ تقدیر نے ترے راستے بڑے کشادہ کر دیے ہیں مگر ایک بات یاد رکھنا۔ غریبوں اور کمزوروں پر کبھی ظلم نہ کرنا اور ناانصافی سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا۔"

نوردین نے ممنونیت کے ساتھ کہا "باواجی سرکار! میں آپ کی باتوں پر عمل کروں گا"۔

بنتو چمار اب نوردین کے روپ میں بلاداد کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ وہ اندر باہر سے مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ باواجی نے اسے رخصت کرتے وقت شیر کی ہڈی پر عمل کر کے دیا اور تاکید کی اور کہا "نوردین اسے کالے دھاگے کے ساتھ باندھ کر اپنے گلے میں ڈال کر رکھے۔ پھر تعویذ اپنے گلے سے کبھی نہ اتارنا۔ شیر کی ہڈی تیرے اندر شیروں جیسی طاقت اور خوبیاں پیدا کر دے گی۔ یاد رکھ یہ راز بھی کسی کو نہ بتانا کہ تمہاری طاقت بڑھانے میں یہ تعویذ کیا کمالات دکھا رہا ہے۔" نوردین نے تعویذ لے کر سنبھال لیا اور اسی روز بلاداد کے لیے روانہ ہو گیا۔

مندر اشکتی اور مسان

ایک روز باواجی لال شہباز قلندر کے ٹیلے پر اپنے مداحوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ان میں ہندو بھی تھے اور سکھ بھی۔ سبھی اپنے مسائل بیان کر رہے تھے اور باواجی انہیں فرداًفرداًان کے مسائل کے حل بتا رہے تھے۔ کسی کو وہ تعویذ دے رہے تھے تو کسی کے لیے طبّی ادویات تجویز کر رہے تھے۔انہوں نے منصور خاں کے واقعے کے بعد اپنی یہ عادت بنائی تھی کہ وہ حتی الامکان اپنی پراسرار طاقتوں بالخصوص جنات کے ذریعے سائلوں کے مسائل حل نہیں کراتے تھے۔بلکہ عملیات اور علم نجوم کی بدولت لوگوں کے مسائل حل کرنے شروع کر دیے تھے۔انہوں نے پراسرار علوم کا ایک ملغوبہ سا بنا لیا تھا۔وہ بیک وقت قرآنی علوم سے بھی استفادہ کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ طب اور نجوم کو بھی استعمال کرتے۔یہ بات ہمیں معلوم نہیں ہو سکی کہ باواجی کو یہ ستاروں کا علم کیسے حاصل ہوا'البتہ اس بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ یہ علم انہوں نے اپنے ہی گاؤں کے ایک پنڈت سے سیکھا تھا۔

نمولیاں میں ہندو بھی آباد تھے۔وہ پنڈت کالے جادو اور جوتش کا علم جانتا تھا۔غالباًاسی نے باواجی کو جوتش اور کالے علوم کی چاٹ لگائی تھی۔میں اپنے جدا مجد کی ان پراسرار قوتوں کو روحانیات کا حصہ اس لیے نہیں ٹھہرا سکتا کہ وہ قرآن پاک اور نمازیں پڑھنے کے علاوہ دیگر علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے۔یہ علوم اسلامی تعلیمات کے برعکس ہوتے ہیں اور ان پر دسترس حاصل کرنے کے لیے عامل کو انتہائی گھٹیا غیر انسانی حرکات اور چلے کرنے پڑتے ہیں۔ان حرکات کے بغیر ان علوم پر مکمل دسترس حاصل کرنا ناممکن ہے۔البتہ اگر ایک انسان اسلامی علوم کی بدولت صرف روحانی طاقتوں کے حصول کے لیے عبادت ریاضت کرے تو وہ دیگر مخفی علوم سے بھی زیادہ قوت حاصل کر لیتا ہے۔ایسا شخص اللہ کا برگزیدہ بندہ بن جاتا ہے اور اس کی نگاہ سے لوگوں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں... مگر علوم کا ملغوبہ تیار کر کے اپنے اندر پراسرار طاقتیں جمع کرنے والے لوگ ذرا مختلف ہوتے ہیں۔باواجی انہی مختلف لوگوں میں سے تھے۔وہ دنیا کے آدمی تھے مگر اپنے باطنی علوم کی بدولت اپنے علم کا صدقہ بھی ادا کرتے اور نیک کاموں مائل رہتے تھے۔انہوں نے کالے علوم سے تو اجتناب کیا تھا'تاہم وہ اس علم کی تمام مکروہ رسموں اور اوچھے ہتھکنڈوں سے آگاہ تھے۔وہ علم جوتش میں اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔یہ علم چونکہ ستاروں کے حساب کتاب'انکی چال ڈھال اور انسانی زندگیوں پر ان کے اثرات کے بارے میں روشنی ڈالتا ہے'اس لیے باواجی اسے غیر اسلامی سمجھتے ہوئے اس کا پرچار بہت کم کیا کرتے تھے۔

لیکن اس روز جب وہ لال شہباز قلندر کے ٹیلے پر بیٹھے تھے تو انہیں برسرعام اس علم سے استفادہ کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ہوا یوں کہ انہوں نے اپنے خاندان کے آدمیوں کے زائچے بنانے شروع کر دیے اور کئی گھنٹوں تک ستاروں کی الجھی چالیں تلاش کرنے میں مصروف رہے۔انہوں نے جب منصور خان کا زائچہ بنایا تو چونک پڑے اور اس فکر میں مبتلا ہو گئے کہ منصور خاں بظاہر اسقدر خوفناک نہیں ہو سکتا جتنا کہ وہ زائچے میں نظر آرہا تھا۔انہوں نے اس کا زائچہ ایک سے زائد بار بنایا مگر نتیجہ ایک نکل ہی رہا تھا جو باواجی کے حق میں بہتر نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆☆

اتفاق کی بات ہے کہ اس روز گڑھ شنکر کا پجاری پنڈت گرورامانرائن نمولیاں آگیا۔ وہ بابا منوہر کے مندر میں ایک جاپ کرنے آیا تھا۔ گاؤں کے چودھری باوانہال شاہ کے پراسرار علوم کی بھنک اس کے کانوں میں پڑی۔ پنڈت رامانرائن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ کالے علوم میں استاد کا درجہ رکھتا ہے اور کالی ماتا کے پجاری اس کے چرن دھو کر پیتے تھے۔

باواجی کی شریک برادری کے دماغ ابھی ٹھکانے نہیں آئے تھے اس لیے انہیں جونہی یہ خبر ملی کہ گڑھ شنکر سے پنڈت رامانرائن آیا ہے تو انہوں نے باواجی کے خاتمے کے لیے اس کی مدد حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس مقصد کے لیے منصور خاں کو آگے کر دیا۔ منصور خاں نے پہلے تو ان کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا مگر برادری کے بار بار طعنوں سے گھبرا کر اس نے پنڈت رامانرائن سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور اسی شام رات ڈھلتے ہی وہ بابا منوہر کے مندر میں گیا۔ اس نے پنڈت رامانرائن سے ملکر اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ باواجی کو کالے جادو کی بدولت ختم کر دیں۔ رامانرائن بڑا گھاگ اور شیطان کا چیلا تھا۔ اس نے منصور خاں سے کاروباری لہجے میں بات کی اور کہا:

"بالکے! میں تیرا کام کر تو دوں۔ مگر مجھے کیا ملے گا؟"

"آپ جو حکم کریں' میں حاضر کر دوں گا" منصور خاں نے جواب دیا۔

"نہیں بالکے! تم مجھے راضی نہیں کر سکو گے"

رامانرائن کی آنکھوں میں ہوس کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ لمبی لمبی جٹوئیں' ماتھے پر سیندور' ٹھوس بدن' عمر پچاس برس کے لگ بھگ۔ اس نے منصور خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا: "تم یہی چاہتے ہو نا کہ نہال شاہ کو مار دوں اور تم لوگ اس کی حویلی اور زمینوں قابض ہو جاؤ اور تمہیں گاؤں کی چودھراہٹ مل جائے۔

منصور خاں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"مگر یہ سوچو کہ یہ کام کر کے مجھے کیا ملے گا"

"میں آپ کی جھولی بھر دوں گا۔" منصور خاں نے کہا۔

"لیکن بالکے! میری جھولی تو پہلے ہی بھری ہوئی ہے۔ دھن دولت کی میرے پاس کوئی کمی نہیں" پنڈت منصور خاں کا چہرہ دیکھتے ہوئے برابر مسکراتا رہا۔

"پھر آپ ہی کچھ بتایئے" منصور خان زچ ہو کر بولا

"مجھے اس گاؤں کی سب سے سندر ناری چاہیئے اور وہ ہو بھی مسلمان۔ اگرچہ ہم تم لوگوں کو ملیچھ سمجھتے ہیں مگر آشاؤں کا بھوجن تو یہی مخلوق ہوتی ہے۔ مندر کے اس ویرانے میں ملیچھ رہتا ہے نہ کوئی ....." پنڈت نے بات ادھوری چھوڑ کر منصور خان کی طرف دیکھا جو تذبذب میں پڑ گیا تھا۔

"ہے نہ یہ مشکل کام؟" پنڈت رامانرائن بولا: "منصور خان! تیری ساری آشائیں صرف پنڈت رامانرائن ہی پوری کر سکتا ہے۔ میں نے تیری جنم کنڈلی بنا کر پڑھ لی ہے۔ تیرے لیکھوں میں راج یوگ ہے۔ تیرے ستاروں کی روشنیاں تیرے آنے والوں دنوں کی تاریکیاں کھا جائیں گی۔ اگر تو اس جیسے دس دیہات کا سب سے بڑا زمیندار بننا چاہتا ہے تو مجھے خوش کر دے۔ میں تجھے وچن دیتا ہوں تجھے نامراد نہیں رہنے دوں گا۔"

منصور خان پنڈت کی باتیں سن کر گنگ رہ گیا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ جذباتی بہت تھا اور جذبات میں آتے ہی اس کا دماغ سن ہو جاتا تھا۔ پنڈت کی باتیں سن کر وہ سنہری مستقبل کے خواب دیکھنے لگا تھا ان خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے اس اپنے گھر اور غیرت کی دیواروں میں نقب لگائی تھی۔ یہ بات تو منصور خان بھی جانتا تھا کہ نمولیاں جیسے بڑے گاؤں میں صرف ایک اس کی بہن روشن ہی تھی جو پنڈت کے معیار پر پوری اتر رہی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ روشن ہی کی وجہ سے باواجی نہال شاہ نے اس کی خطائیں معاف کرتے ہوئے دوبارہ ایک جیتے جاگتے انسان کا روپ دیا تھا۔ اور وعدہ لیا تھا کہ منصور خان آئندہ ایسا نہیں کرے گا اور اب جب سے نہال شاہ دوبارہ گاؤں آئے تھے تو اسے یہ سن گن بھی ہو گئی تھی کہ روشن باواجی نہال میں دلچسپی لے رہی ہے۔ یہ باتیں منصور خان کو شدید ناگوار گزری تھیں' لہذا اس نے گاؤں کی چودھراہٹ حاصل کرنے کے لیے پنڈت سے اپنی غیرت کا سودا کر لیا۔

☆☆☆☆☆☆

مندروں کی گندی سیاست میں جنم لینے والے ہندوؤں نے شروع دن ہی سے برصغیر کے ان مسلمانوں کے خلاف ایسے گھناؤنے جال پھیلا دیے تھے جو کسی نہ کسی گاؤں کے مالک ہوتے تھے۔ ان کے خلاف ان کی برادری میں سے ان کے دشمن پیدا کرتے اور انہیں اپنی "شکتی" دے کر خاندانی دشمنیوں کی داغ

بیل ڈالتے رہتے تھے۔ نمولیاں میں بھی باوا جی نہال شاہ کے آباؤ اجداد کی وجہ سے مسلمانوں کا دبدبہ تھا مگر باوا جی کی اپنی غلطی کہہ لیں کہ انہوں نے زمینوں اور چودھراہٹ میں ایک طویل عرصہ دلچسپی نہیں لی تھی جس کی وجہ سے ان کی شریک برادری میں پھوٹ پڑ گئی تھی اور گاؤں کے اونچی ذات کے ہندوؤں نے بھی اس خاندان کو ختم کرنے کے لیے اندورون خانہ سازشوں کے جال پھیلا رکھے تھے 'البتہ وہ کھل کر سامنے نہیں آ رہے تھے۔ اب انہیں منصور خان کے روپ میں ایک کارندہ مل گیا تھا جو باوا جی نہال شاہ سے اپنی بے عزتی اور ہزیمت کا بدلہ لینے پر تل گیا تھا۔

منصور خان پنڈت رامانرائن کو اپنے مقاصد کی خاطر شیشے میں اتارنے گیا تھا مگر پنڈت نے اسے اپنے شیشے میں اتار لیا اور اسے اپنی غیرت گروی رکھ کر گاؤں کی چودھراہٹ کے خواب دکھا دیئے تھے۔

باوا جی کو ختم کرنے کے لیے پنڈت نے منصور خان کو ایک چھوٹی سی بند پڑیا دی اور اسے سمجھاتے ہوئے کہا: "منصور خان ! ! اس پڑیا میں ایک کوڑھی کا مسان ہے۔ تم یہ مسان کسی طرح نہال شاہ کو کھلا دو۔"

"مگر میں کیسے کھلا سکتا ہوں؟ وہ تو میرا دشمن ہے اور وہ کبھی بھی میرے ہاتھ کا دیا نہیں کھائے گا۔ آپ ایسا کریں کوئی جادو وغیرہ کر کے اس کو ختم کر دیں۔ یہ کھلانے پلانے والا طریقہ رہنے ہی دیں تو بہتر ہے"۔ منصور خان نے کہا۔

"میں نے اپنی شکتی اس مسان میں اتار دی ہے اور نہال شاہ کو مارنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے کھائے۔ تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ نہال شاہ مہان شکتی کا مالک ہے۔ اس لیے اسے مارنے کے لیے جادو کے بجائے مسان یا زہر استعمال کرنا پڑے گا۔"

"پنڈت جی ! کیا آپ کو یقین ہے کہ مسان کھانے سے وہ مر جائے گا؟" منصور خان نے سوال کیا۔

"بالکے ! وہ مرے گا اور تمہارے سامنے تڑپ تڑپ کر مرے گا"۔ پنڈت نے اسے بتایا "یہ جو مسان ہے 'بڑا ہی کارگر زہر ہے۔ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ مسان ہوتا کیا ہے۔ ہم جب مردوں کو جلاتے ہیں تو ان کی راکھ گنگا میں بہا دیتے ہیں۔ لیکن ہم بیمار ہندوؤں کے مرنے پر ان کی راکھ چوری بھی کر لیتے ہیں اور ان پر عملیات کر کے بھلے چنگے لوگوں کو کھلا دیتے ہیں۔ مرنے والا جس مرض میں مبتلا ہو کر مرتا ہے 'یہ راکھ کھانے والا اسی بیماری میں مبتلا ہو کر مر جاتا ہے۔ اور اس کا کوئی توڑ بھی نہیں نکال سکتا"۔

منصور خان نے پڑیا پنڈت کے ہاتھ سے لے لی اور بولا: "سرکار آپ سے کیا وعدہ اس وقت پورا کروں گا جب آپ کا کیا ہوا وعدہ پورا ہو گا۔"

پنڈت رامانارائن نے ایک مکروہ قہقہ بلند کیا اور اپنی جٹاؤں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا: "اچھا ٹھیک ہے ہم ہیں تو ندیدے مگر تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ پنڈت سے وعدہ خلافی کرنے والا زندہ نہیں رہتا۔"

منصور خاں پنڈت کی ہدایات حاصل کر کے جب مندر سے باہر نکلا تو پورا گاؤں تاریکی کی چادر میں بکل مارے سو رہا تھا۔ وہ اپنی حویلی میں چلا گیا اور مسان کو نہایت احتیاط کے ساتھ سنبھالنے کے بعد سو گیا۔ رات اس نے سنہری خواب دیکھنے میں گزاری تھی۔ اگلے روز وہ تڑکے وقت اپنے حواریوں سے ملا اور انہیں مقصد میں کامیابی کی نوید سنائی مگر انہیں یہ نہیں بتایا کہ پنڈت اور اس کے درمیان سمجھوتہ کیا ہوا ہے۔

اس روز منصور خان باوا جی سے ملنے کے لیے لال شاہ باز کے ٹیلے پر پہنچ گیا اور اس نے اپنی اگلی پچھلی گستاخیوں کی معافی مانگ کر اپنے گھر میں کھانا کھانے کی دعوت دی جسے باوا جی نے قبول کر لیا۔

شام کے وقت باوا جی حسب وعدہ منصور خان کے گھر چلے گئے۔ منصور خان کی ماں اور بہنیں تو کھانے کی تیاری میں لگ پڑیں اور منصور خان' باوا جی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ باوا جی نے جب سے منصور خان کا زائچہ بنایا ہوا تھا' انہیں اس کی طرف سے کھٹکا سا لگ گیا تھا۔ مگر نہ جانے انہوں نے پھر بھی کیوں اس کی دعوت قبول کر لی تھی۔ باوا جی نے منصور خان کی آنکھوں میں اضطرابی کیفیت بھی دیکھی تھی۔ اس کا لہجہ اور آنکھیں اس کی باتوں کی چغلی کھاتی تھیں مگر باوا جی نے انہیں یکسر نظر انداز کر دیا' البتہ' باوا جی خود بے چین نظر آ رہے تھے۔ بظاہر وہ منصور خان سے باتیں کر رہے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں بار بار دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ منصور خان بھی ان کی بے چینی کا مطلب جان چکا تھا۔ باوا جی کو ابھی تک روشن نظر نہیں آئی تھی۔ حالانکہ اس کی ماں اور دوسری بہنیں آ کر نہ صرف ان سے مل چکی تھیں بلکہ ان کے ساتھ باتیں بھی ہوئی تھیں۔ لیکن باوا جی کو یہ پوچھتے ہوئے لاج آ رہی تھی کہ روشن کہاں ہے۔ وہ روشن جس نے ان کے دل کے اندھیروں کو محبت کی روشنی سے پر نور کر دیا تھا۔ وہ پوچھتے بھی تو کیسے؟ اس لیے وہ اپنی بے کلی کو لگام دینے میں ہی لگے رہے مگر ان کی بے قرار آنکھوں کو قرار نہ آ رہا تھا۔

اس دوران کھانا چن دیا گیا۔ کھانا صرف باوا جی اور منصور کے لیے ہی رکھا گیا تھا۔ کھانا آتے ہی منصور خاں کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ باوا جی نے اس کے چہرے کی یہ تبدیلی صاف طور پر محسوس کر لی تھی اور ابھی وہ اس سے کچھ پوچھنے ہی لگے تھے کہ منصور خان خود ہی اچانک بول اٹھا۔

"نہال شاہ آؤ پہلے ہاتھ دھو لو" اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر جا کر روشن کو آواز دی "ارے او روشن! ادھر آؤ بڑے چوہدری کے ہاتھ دھلا دے۔" روشن کا نام سنتے ہی باوا جی کی آنکھوں میں قرار لوٹ آیا۔ وہ دھیرے سے اٹھے' اسی لمحے روشن اندر آ گئی۔ اس نے بھاری سی چادر سے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے باوا جی کو سلام کیا اور باوا جی خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئے اور جب ایک آدھ منٹ بعد واپس کمرے میں آئے تو منصور خان باوا جی کے چہرے پر سکون دیکھ کر مطمئن ہو گیا کیونکہ اب وہ خود بھی مطمئن ہو چکا تھا۔ اس نے باوا جی کے کھانے میں مسان شامل کر دیا تھا۔

باوا جی نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر کھانے کے بعد انہوں نے منصور خان سے کہا "منصورے! میں نے آج تک اس قدر لذیذ اور پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا....."

ابھی وہ بات مکمل بھی نہ کر سکے تھے کہ منصور خان کی ماں اندر آ گئی۔ وہ باوا جی کی بات سن کر بولی: "کھانا مزیدار کیوں نہ ہوتا نہال شاہ پتر..... یہ کھانا میری روشن نے جو پکایا ہے۔"

"سبحان اللہ۔" باوا جی کے منہ سے نکلا۔

منصور خان کی ماں باوا جی کے پاس بیٹھ گئی اور بولی: "نہال شاہ! اگر تو برا نہ مانے تو ایک بات کہوں۔"

"چاچی! آپ ایک نہیں سو باتیں کریں۔ میں برا کیوں مانوں گا۔" باوا جی نے خوشدلی کے ساتھ کہا۔

"پتر میں اکثر سوچتی ہوں کہ تو کیا چیز ہے۔ تجھے نہ اپنی فکر ہے نہ اپنی جائیداد اور زمینوں کی۔ ہمارے سوا تیرا کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہیں ہے۔ اگر تیرے ماں باپ زندہ ہوتے یا کوئی بہن بھائی ہی ہوتا تو شاید تمہیں ان کی فکر ہوتی اور تو ان کے لیے اور پھر اپنے لیے کچھ اچھا برا سوچتا۔ لیکن اللہ نے تجھے ساری فکروں سے ہی آزاد کر دیا ہے۔ اب میری مان شادی کر لے۔ یہ بھری جوانی کی عمر تو کب تک اکیلا رہے گا۔ تیری اتنی بڑی حویلی کب تک سنسان رہے گی۔ اگرچہ آج یہ رونقیں تیرے دم سے ہیں مگر جب تو نہ ہو گا تو اس حویلی اور زمینوں پر جانتا ہے کون قبضہ کریں گے جو تیری غیر موجودگی میں یہاں قابض تھے۔ اگر تیرا کوئی بال بچہ ہو گا تو پھر یہ ساری جائیداد ان کی ہو گی۔ اپنی آنے والی نسل کی خاطر اگر تو اس جائیداد کی رکھوالی کرے گا تو یہ بات مناسب لگے گی۔ اگر تو نے شادی ہی نہیں کرنی تو پھر اتنی زمینوں اور حویلی کا کیا کرے گا۔"

منصور خان کو اپنی ماں کی یہ نصیحت آموز باتیں انتہائی ناگوار گزریں۔ وہ بولا:

"ماں چھوڑ تو کیا باتیں لے بیٹھی ہے۔ نہال شاہ کوئی بچہ نہیں کہ جسے دنیاداری کی سمجھ نہیں۔ ویسے بھی وہ جس کام پڑا ہوا ہے 'اس کا تقاضا ہے کہ ابھی شادی نہ کرے۔ ورنہ اس کی ساری ریاضت ختم ہو جائے گی۔"

باوا جی منصور خان کی بات سن ہنس پڑے۔ وہ بولے "چاچی ٹھیک کہتی ہے 'میں اب شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں اس لیے خاموش ہوں کہ مجھے اس بارے میں بات کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"لے پتر یہ کیا بات ہوئی۔" منصور خان کی ماں بولی۔ "ہم جو ہیں۔ اگر تو کہے تو تیرے لیے کوئی لڑکی تلاش کروں" یہ بات تو وہ بھی جانتی تھی کہ نہال شاہ روشن میں دلچسپی رکھتا ہے مگر وہ جان بوجھ کر یہ بات زبان پر نہ لائی تھی۔

"ہاں چاچی" باوا جی نے عندیہ دیا۔ "مگر مجھ سے ایک بار پوچھ ضرور لینا۔"

"منصور پتر تو ذرا جانوروں کو ایک نظر دیکھ آ۔ میں اتنی دیر نہال شاہ سے کچھ باتیں کر لوں۔" منصور خان نے قہر آلود نظروں سے ماں کو گھورا اور اپنی چادر کو کاندھوں پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

"نہال پتر! میں لمبی چوڑی بات نہیں کروں گی۔ تو بھی سچ سچ بتا دے۔ تجھے روشن کیسی لگتی ہے؟"

باوا جی کے لبوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی' بولے: "چاچی! تم پوچھنا کیا چاہتی ہو؟"

"تو نے خود ہی اجازت دی ہے کہ میرے لیے کوئی لڑکی تلاش کرو۔ مجھے اپنی روشن سے بڑھ کر کوئی اور لڑکی تیرے لیے بہتر نہیں لگتی پتر۔ اور پھر اس کے کھانے کا ذائقہ بھی تجھے پسند آیا ہے۔" روشن کی ماں دھیرے سے بولی۔ "میری روشن بہت تابعدار اور نیک ہے۔"

☆☆☆☆☆☆

اس شام جب باوا جی حویلی واپس لوٹے تو بہت خوش تھے۔ انہوں نے آتے ہی حویلی کے ملازموں میں چاندی کے سکے تقسیم کیے مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ کس بات پر خوش تھے۔ لیکن ان کی خوشیوں پر اس وقت زوال شروع ہو گیا جب اچانک ان کی طبیعت گھبرانے لگی اور انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ باوا جی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے ان کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیا ہے اور دماغ دھواں دھواں سا ہونے لگا ہے۔ جسم میں سے توانائی یوں زائل ہو گی جیسے برسوں کے بیمار ہوں۔ اس وقت وہ اپنے مخصوص کمرے ہی میں موجود تھے لیکن نقاہت نے انہیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اٹھ کر کوئی دوائی کھاتے یا کسی عمل کے سہارے خود کو قائم رکھ سکتے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ انہیں ایک طاقتور مسان کھلا دیا گیا ہے جو رگ و پے میں سرایت کر کے پورے جسم پر قبضہ جما چکا ہے۔ صرف آدھ گھنٹہ ہی میں باوا جی کی حالت غیر ہو گئی۔ ان کی زبان پھول کر دانتوں اور تالو کے درمیان یوں پھنس گئی تھی کہ منہ کھول سے نہ کھل سکتا تھا۔ پورے جسم پر عجیب و غریب سی خارش شروع ہو گئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے بدن کی کھال خشک ہو کر پھٹ رہی ہے۔ باوا جی نے ایک بار اپنی توانائیوں کو قابو کرنے کی کوشش کی تھی اور کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہا تھا مگر شیطانی مسان نے ان کی قوت گویائی کو سلب کر لیا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے قضا کا وقت آ چکا ہے اور روح ان کے جسم سے فرار حاصل کرنے کے لیے ایک ایک رگ سے اپنا وجود کھینچ رہی ہے۔ باوا جی بے بسی کی موت کی وادیوں میں اترتے جا رہے تھے اور پھر کچھ ہی دیر بعد ان کے ذہن پر مکمل تاریکی چھا گئی اور وہ دنیا اور مافیہا سے بیگانہ ہو گئے۔

پنڈت رامانرائن نے منصور خان کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ اس کا دیا ہوا مسان باوا جی کو لمحوں میں دیمک کی طرح چاٹ گیا تھا۔ ویسے تو مسان اتنا

سریع الاثر نہیں ہوتا البتہ جب اس پر کوئی عمل کر کے کھلایا جائے تو اس کی شدت بڑھ جاتی ہے لیکن اس کے باوجود ایسا جادو آمیز مسان بھی بتدریج اثر کرتا ہے۔ مگر باواجی کو جو مسان کھلایا گیا تھا اس میں پنڈت نے زہر بھی ملا دیا تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا تھا کہ باواجی نہال شاہ خود بھی عملیات کے ماہر ہیں تو اس نے کسی قسم کا خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے گمان ہو گیا تھا کہ اگر انہیں صرف مسان ہی کھلایا گیا تو وہ اس کے اثر پذیر ہوتے ہی تدارک کر لیں گے۔

عملیات کی دنیا کا یہ اصول ہے کہ کوئی بھی عامل یا جادوگر اپنے مخالف عامل کو معمولی زک نہیں پہنچاتا بلکہ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اسے مار دیتا ہے۔ پنڈت نے اسی اصول کے تحت باواجی کو مسان میں زہر ملا کر کھلوا دیا تھا۔ لیکن باواجی کی خوش قسمتی تھی کہ نہیں بے ہوش ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی جب طرطوش خلاف دستور حاضر ہو گیا۔ حالانکہ وہ اس وقت باواجی کے سامنے آتا تھا جب باواجی خود اس کی حاضری لگاتے۔

طرطوش باواجی کی حالت دیکھتے ہی سکتے میں آ گیا۔ اس نے جھٹ پٹ ان کی نبض دیکھی جو تقریباً ڈوب چکی تھی۔ اس نے اپنے شاگرد مستان کو طلب کیا اور جلدی سے چند ادویات لانے کے لیے کہا۔ اس دوران طرطوش نے بے جان باواجی کو اپنی گود بٹھا لیا اور خود کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگا۔ یکدم اسے کچھ خیال آیا اور اس نے کمرے میں موجود ادویات کے مرتبان کھولے اور ایک پیالے میں سیال نما دوائی انڈیل کر باواجی کے منہ سے لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ زبان پھول جانے کی وجہ سے دانت اس میں کیلوں کی طرح ٹھونک گئے تھے۔ طرطوش نے بمشکل منہ کھولا اور سیال قطرہ قطرہ کر کے ٹپکانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد مستان بھی ادویات لے کر آ گیا۔ طرطوش نے ایک سفوف پر دم کیا اور اسے پانی گھول کر باواجی کی نبض پکڑ لی پھر مستان کی مدد سے باواجی کا منہ کھول کر دوائی ٹپکاتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد اسے نبض دوبارہ بحال ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے ایک شاگرد کو طلب کیا اور اسے باواجی کے چہرے پر عرق چھڑکنے کا کہا۔ عرق کی ہلکی ہلکی بھینی سی پھوار پڑتے ہی باواجی کا سارا بدن کسمسایا اور حیرت انگیز طور پر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ طرطوش پر نظر پڑتے ہی ان کی مردہ آنکھوں میں زندگی آ گئی۔

"شکر ہے میرے خدایا! نہال شاہ جی آپ نے آنکھیں کھول لی ہیں۔" آج آپ نے مجھے بلایا تو نہیں تھا مگر میں خود ہی ایک کام کے سلسلے میں آ گیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تقدیر نے ایک کام کا بہانہ بنا کر مجھے اپنے یار کی مدد کے لیے یہاں پہنچایا ہے۔"

ادویات نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور باواجی کے اندر توانائی بحال ہونے لگی تھی۔ وہ ہمت کر کے بیٹھ گئے اب ان کی قوت گویائی بھی لوٹ آئی تھی۔ وہ طرطوش کا ہاتھ پکڑ کر بولے: "طرطوش! آج تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں تاحیات اسے بھول نہ پاؤں گا۔ میں اس کا کوئی بدلہ تو نہیں دے سکتا۔ مگر آج کے بعد تجھے اپنے عمل سے آزاد کرتا ہوں۔"

جب بھی کوئی عامل عملیات کے زور پر جنات یا کسی دیگر نادیدہ مخلوق کو قابو کرتا ہے تو وہ اس کی مطیع اور غلام ہو جاتی ہے اور وہ صرف عامل کی مرضی اور منشا کے مطابق ہی زندگی بسر کر سکتی ہے۔ اگرچہ بہت سے عامل اس مخلوق کے ہر معاملے کو اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے لیکن اگر وہ چاہیں تو جنات اور موکلان

چوبیس گھنٹے ان کے پاس رہنے کے پابند ہو سکتے ہیں لیکن اس طرح اس مخلوق کے کھانے پینے کا بندوبست بھی عامل کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ جنات اور موکلان کی خوراک پوری کرنا اور انہیں ان کی فطرت کے مطابق ماحول مہیا کرنا عامل کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے زیادہ تر عامل اور جادوگر جنات کو بوقت ضرورت ہی طلب کرتے ہیں۔ اس دوران اگر کوئی عامل وغیرہ اس مخلوق کو اپنے عمل سے آزاد کرنا چاہے تو یہ مخلوق انتہائی خوشی کے ساتھ آزاد ہونا پسند کرتی ہے۔ مگر آزادی کا پروانہ لینے سے پہلے عامل کو کوئی نہ کوئی نشانی ضرور دے کر جاتی ہے۔ اکثر اوقات ایسی نشانیاں عامل کے لیے سوہان روح بن جاتی ہیں کیونکہ جنات وغیرہ نشانی کے طور پر اس کی اولاد میں سے کسی ایک بچے کو مار سکتے ہیں۔ لیکن ایسا صرف کمزور اور کالا جادو کرنے والے عامل کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ کالا جادو شرک اور مکروہات کی دنیا کا علم ہے۔ اسے سیکھنے والا شیطان کا پیروکار ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ شیطان کا چیلا جب بھی جنات اور موکلان کو قابو کرتا ہے تو اسے دنیا کا ہر مکروہ اور گندہ ترین کام کر کے ہی اس مخلوق کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کالے جادو کا عامل ایک طاقتور مخلوق کو اپنے قابو کرنے کے باوجود ان کے زیر اثر آجاتا ہے۔ اس لیے جب وہ اس مخلوق سے جان چھڑانا چاہتا ہے یا بخوشی آزاد کرتا ہے تو تب بھی اسے بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ البتہ جو عامل کالے جادو سے اجتناب کرتا ہے اور نوری علوم کی مدد سے جنات کو قابو کرتا ہے وہ جنات کے زیر اثر نہیں آسکتا۔ باواجی کا بھی یہ معاملہ تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر اپنی جان بچانے کے عوض طرطوش کو آزاد بھی کر دیں تو وہ انہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا بلکہ آزادی کا پروانہ بخوشی قبول کرے گا مگر طوطرش نے حیرت انگیز طور پر آزادی کی نعمت کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا۔

"نہال شاہ جی! اگر مجھے آزاد ہونا اتنا ہی اچھا لگتا تو آپ کے مرنے کے بعد تو میں آزاد ہو چکا ہوتا۔ آپ کی زندگی بچا کر میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور اپنی قوم کے اعتماد کو بحال کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کی ہے کہ اگر ہمیں بھی پیار و محبت کا مستحق سمجھا جائے تو ہم بھی اچھے اور مخلص دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں طرطوش واقعی تم نے حق دوستی ادا کر دیا ہے۔" باواجی نے کہا۔

"اور میں نے بھی....." طرطوش کے عقب سے مستان شرارت کے ساتھ بولا۔

"ہاں تم بھی ہمارے دوست ہو۔" باواجی مسکرائے۔ "آج سے تم لوگ میرے دوست ہو۔ میں سمجھا تھا کہ دنیا میں میرا اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اب میں تنہا نہیں ہوں۔ بلکہ میرے ساتھ دوستوں کی ایک فوج ہے۔"

نہال شاہ! آپ جانتے ہیں کہ آپ کی یہ حالت کیوں ہوئی تھی۔" طرطوش نے پوچھا۔

"مجھے خود سمجھ نہیں آئی کہ کیا ہوا ہے۔ میں نے سوائے منصور خان کے گھر میں کھانا کھانے کے بعد کسی اور جگہ سے کچھ کھایا بھی نہیں"۔ باواجی تشویش ناک انداز میں بولے۔ "لیکن مجھے یقین ہے کہ مجھے زہر دیا گیا ہے مگر کیسے" باواجی بات کرتے کرتے رک گئے اور بولے۔ "طرطوش تمہارا کیا خیال ہے ۔ منصور خان کے گھر والوں نے مجھے زہر دیا ہو گا۔"

"ممکن ہے انہوں نے ہی دیا ہو۔ آخر وہ آپ کے دشمن ہیں۔" طرطوش نے جواب دیا۔

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آج ہی تو منصور خان کی ماں نے مجھے روشن سے شادی کی پیش کش کی ہے۔" باوا جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "طرطوش! تم بھی ذرا حساب لگاؤ اور میں بھی حساب لگا کر دیکھتا ہوں۔"

"باوا جی! میں تو حساب لگا بھی چکا ہوں۔" طرطوش نے انکشاف کیا۔ "آپ کو مسان اور زہر کھلایا گیا ہے اور مجھ یقین ہے کہ یہ زہر ملا مسان منصور خان نے ہی کھلایا ہو گا۔"

باوا جی نے چونک کر طرطوش کی طرف دیکھا اور افسوس ناک لہجے میں کہا: "طرطوش! منصورے کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ خیر اب ذرا مسان کو ظاہر کر کے دیکھتے ہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔"

باوا جی نے طرطوش کو دھونی دینے کے لیے کہا اور خود چٹائی پر آلتی پالتی مار کر عمل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کمرہ لوبان کی دھونی سے مہک اٹھا۔ باوا جی نے ایک کالے مرتبان سے تین چھوٹے چھوٹے سفید موتی نکالے اور مستان سے کہنے لگا:

"مستان بابا منوہر کے ٹیلے کے پچھواڑے میں انجیر کا درخت ہے۔ اس کی ایک شاخ توڑ کر لے آ۔" مستان حکم پاتے ہی غائب ہو گیا اور پلک جھپکتے ہی شاخ لے آیا۔ اس نے انجیر کی شاخ باوا جی کو دی اور تیز لہجے میں کہنے لگا۔ "باوا جی سرکار انجیر کے درخت پر چڑیلوں نے بسیرا کیا ہوا۔ ان کی ساری "پکھی" وہاں موجود ہے۔ میں جب انجیر کی شاخ توڑنے گیا تو وہ مجھ سے جھگڑ پڑے تھے۔ مگر جب آپ کا بتایا تو کہنے لگے کہ باوا جی کو ہمارا پرنام کہنا اور بتانا کہ ہم کب سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ کسی روز ہمیں درشن دینے کی اجازت دیں۔"

باوا جی مسکرائے اور طرطوش سے کہنے لگے: "یہ خبیث روحیں بڑی مکار ہیں۔ انہوں نے مستان کو یہ نہیں بتایا کہ میں نے انہیں انجیر کے درخت سے باندھ رکھا ہے۔ ان شیطانوں نے میری عدم موجودگی میں گاؤں میں بڑی بڑی برائیاں پھیلائی ہوئی تھیں۔ پہلے اس مسان کو نپٹ لوں' پھر ان کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر باوا جی نے سفید موتی سلگتی انگیٹھی میں ڈال دیے۔ کمرے میں عجیب و غریب طرح کی بو پھیل گئی۔ باوا جی نے آنکھیں بند کر لیں اور بچیس منکوں والی کالی تسبیح پر کچھ پڑھنے کے بعد انگیٹھی پر پھونکیں مارتے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد انگیٹھی کے دھویں کا رنگ بدلنے لگا اور اس کا دھواں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگا۔ باوا جی نے پڑھنے کا عمل تیز کر دیا اور جوں جوں وہ دھویں پر پھونکیں مارتے' دھواں سفید رنگ اختیار کر کے چھت تک بلند ہو گیا اور اس کے بعد اس نے کمرے میں پھیلنا شروع کر دیا۔ اب باوا جی نے انجیر کی شاخ کی مدد سے انگیٹھی کی آگ کو کریدنا شروع کیا تو سارے کمرہ کا دھواں ایک وجود کی شکل میں چھٹنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک کالا بجھنگ اور چیچک زدہ چہرے والا مریل سا انسان اپنی بدہیئت وضع قطع کے ساتھ انگیٹھی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ باوا جی نے آنکھیں کھول دیں تو اس شخص نے جھٹ دونوں ہاتھ جوڑے اور باوا جی کے چرن چھونے کے لیے آگے جھکا۔

"پیچھے ہٹ کمبخت"۔ باواجی نے انجیر کی شاخ سے اس کو ٹھوکا دیا تو وہ بدک کر چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مگر پیچھے ہٹتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ چلایا: ہائے میں مر گیا"

"تجھے تو میں ایسا جلاؤں گا کہ تیری نسلیں بھی یاد کریں گی۔ تیری راکھ میں گنگا میں نہیں بہاؤں گا بلکہ کالی چڑیل کو کھلاؤں گا۔" مستان کی غصہ میں بھری ہوئی آواز ابھری۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ اسے دے مارا اور دھاڑ کر بولا:

"جلدی بول۔ تیرا مسان کس نے قبضہ میں کیا ہے۔"

"میرا ماس تو چھوڑو۔ بھگوان کی سوگند ابھی بتاتا ہوں۔" کالا شخص درد کی شدت سے چلایا۔

"نہیں تو ایسے ہی بتائے گا۔" مستان نے اس کی کمر کے ماس (گوشت) کو چٹکی کے انداز میں پکڑ رکھا تھا۔

"میرا نام مرلی ہے۔ مجھے جب شمشان گھاٹ پر جلایا گیا تو پنڈت رامانرائن نے میری راکھ اپنے قبضے میں کر لی وہ میرا مسان اپنے دشمنوں کو کھلاتا رہتا ہے۔" وہ درد سے بلبلاتا ہوا بولنے لگا۔ "پنڈت نے باواجی کو میرا مسان کھلانے سے پہلے اس میں شیش ناگ کا زہر بھی ملا دیا تھا۔ تاکہ باواجی سنبھل ہی نہ سکیں۔"

"مستان اسے چھوڑ دے۔" باواجی نے مستان کو حکم دیا اور بولے: "مرلی آرام سے بیٹھ جا اور مجھے بتا کہ اب تو کس شرط پر اپنی جڑیں میرے وجود سے باہر نکالے گا۔"

مرلی دوزانو ہو کر انگیٹھی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا: "باواجی آپ جو دان کریں گے میں لے لوں گا۔"

"لیکن تمہیں وچن دینا ہو گا کہ دوبارہ ادھر نہیں آؤ گے۔" باواجی نے کہا۔ "میں چاہوں تو تجھے بھسم کر کے تیرا قصہ ہی پار کر دوں مگر میں تجھے اپنے اصولوں کے مطابق واپس بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"باواجی آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہم ہندو ماس نہیں کھاتے۔ مجھے سات بھاجی (سبزیاں) کی خوشبو دے دیں۔ برسوں سے کچھ کھایا نہیں ہے۔ میں آپ کے چرن چھو کر چلا جاؤں گا۔" مرلی نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"طرطوش! سات سبزیوں کا بندوبست کرو۔" باواجی کا حکم پاتے ہی طرطوش نے سات پکی ہوئی سبزیاں حاضر کر دیں۔ جونہی گرما گرم سات سبزیوں کا سالن کمرے میں پہنچا' مرلی بے تابی سے لمبے لمبے سانس لینے لگا اور سبزیوں کی خوشبو لیتے ہی وہ مدہوش سا ہو گیا۔

"ہم نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ تم نے بھاجی کی خوشبو لے لی ہے۔ اب چلے جاؤ۔" باواجی نے نفرت کے ساتھ انجیر کی شاخ لہرائی تو مرلی نے ایک

فلک شگاف چیخ بلند کی اور دھوئیں میں تحلیل ہو گیا اور وہ دھواں کمرے میں چکر کھانے کے بعد کمرے کی ایک درز سے باہر نکل گیا۔ لیکن اسی لمحہ ایک عجیب بات ہوئی کہ دروازے کے قریب سے کسی کی گھٹی گھٹی سی چیخیں سنائی دیں دوسرے ہی لمحے دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھل گیا اور روشن کی ماں چیختی چلاتی دھاڑیں مارتی ہوئی باواجی کی طرف بڑھی۔

"نہال شاہ! میں لٹ گئی برباد ہو گئی.....بے غیرت منصور نے تمہاری عزت روشن کو پنڈت رامانرائن کے حوالے کر دیا ہے۔"

یہ سنتے ہی باواجی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ان کے اندر انتقام کا جوالہ مکھی انگڑائیاں لینے لگا۔ وہ یکدم اٹھے اور طرطوش سے بولے: "طرطوش! اب پنڈت اور منصور امیر اقہر سے نہیں بچ سکتے۔ خدا کی قسم اب ان دونوں کا قتل مجھ پر واجب ہو گیا ہے۔" باواجی نے روشن کی ماں کو تسلی دی اور کہا:

"چاچی! روشن تیری بیٹی ہے تو اب میری عزت بن چکی ہے۔ تو ادھر حویلی میں میرا انتظار کر۔ میں روشن کو شیطان کے پنجے سے نکال کر لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر باواجی نے اپنی کالی چادر کی بکل ماری اور انجیر کی شاخ ہاتھ میں پکڑ کر باہر نکل گئے۔ طرطوش اور مستان بھی باواجی کے ساتھ ہو لیے اور کچھ ہی دیر بعد وہ سبھی بابا منوہر کے مندر کے سامنے پہنچ گئے۔

بہن کا بیوپاری

مندر ایک ہولناک تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ باواجی برسوں بعد اس طرف آئے تھے۔ اگرچہ مندر انہی کی جاگیر میں تھا مگر جب سے انہوں نے سنیاس کا چولا پہنا تھا' وہ گائوں میں ہونے والی سرگرمیوں سے لاتعلق ہو گئے تھے۔ اس وقت ان کے سامنے بابا منوہر کا مندر ایک نیا روپ لیے ہوئے تھا۔ پہلے تو انہیں گمان گزرا شاید وہ کسی اور مندر میں آ گئے ہیں مگر پھر انہیں یقین کرنا پڑا کہ نمولیاں میں اب ہی مندر ہے جہاں گائوں کی ہندو آبادی پوجا پاٹ کرتی ہے۔

باواجی کی حیرانی کچھ بے جا نہیں تھی۔ اس سے پہلے یہاں ایک ویران کھنڈر نما مندر ہوا کرتا تھا۔ اس کے چاروں طرف ہندوئوں کی آبادی تھی اور یہ گھر انتہائی خستہ حالت میں ہوتے تھے مگر اب مندر کے ارد گرد پختہ مکان تعمیر ہو گئے تھے اور مندر کی عمارت بھی ایک قلعے کے اندر بند ہو چکی تھی۔ باواجی کو ہرگز علم نہ تھا کہ دس برس کے عرصے میں بابا منوہر کا مندر ہندوئوں کی سازشوں کا گڑھ بن چکا ہے اور اس کے اندر پوجا پاٹ کے نام پر غریب و نادار عورتوں کی عزتیں لوٹی جاتی ہیں۔

باواجی نے مندر کی عمارت تک پہنچنے کیلئے دروازہ تلاش کرنا شروع کیا تو ان کی حیرانی مزید بڑھ گئی کیونکہ قلعہ نما چار دیواری میں ایک بھی دروازہ نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ باواجی قلعے کا دروازہ تلاش کرنے کیلئے طرطوش کو کوئی حکم دیتے، وہ خود ہی کہنے لگا: "نہال شاہ جی! پنڈت بڑی خبیث اور بدکار روح ہے۔ اس نے مندر کے گرد طلسمی قلعہ تعمیر کر دیا ہے۔ یہ پختہ دیواریں نہیں بلکہ فریب نظر ہے۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے طرطوش!" باواجی نے انجیر کی چھڑی لہراتے ہوئے کہا۔ "میں خبیث کافر کا یہ طلسم اپنی چھڑی سے ختم کر دوں گا"۔ یہ کہتے ہی وہ زیر لب کچھ پڑھنے لگے ساتھ ساتھ چھڑی کو فضا میں لہراتے جاتے۔ چند لمحے بعد وہ آگے بڑھے اور چھڑی جونہی دیواروں سے ٹکرائی فضا میں شیطانی آہوں اور سسکیوں کا شور سنائی دیا۔ باواجی نے چھڑی مارنے کی رفتار تیز کر دی۔ وہ ساتھ ساتھ طرطوش کو بھی ہدایات جاری کر رہے تھے۔

"طرطوش! میں اس خبیث کی حقیقت جان گیا ہوں۔ اس نے جانگلی وال کی چڑیلوں کو اس مندر کی حفاظت پر بلایا ہوا ہے۔ تم مستان سے کہو کہ وہ انجیر کے درخت پر بندھی ہوئی چڑیلوں کو رہا کرا کے لے آئے"۔ اس کے ساتھ ہی باواجی نے اپنی چھنگلی سے تانبے کا ایک چھلا اتارا اور کہا یہ مستان کو دے دو اور اسے کہہ دو کہ انجیر کے درخت سے ایک انجیر توڑ کر اس چھلے کو انجیر کے درمیان رکھ کر دوبارہ جوڑ دے اور اسے بابا کے شہباز قلندر کے تکیہ پر جا کر دبا دے۔"

طرطوش نے چھلا لے کر مستان کے حوالے کر دیا اور وہ اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔

باواجی کا خیال تھا کہ طلسماتی قلعے کی دیواریں توڑنے میں انہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی مگر انہیں یہ عمل کرتے ہوئے دانتوں پسینہ آ رہا تھا۔ وہ جونہی

ایک طرف کی دیواریں گراتے اور دوسری جانب بڑھتے تو ان کے آگے گری ہوئی دیواریں دوبارہ کھڑی ہو جاتیں۔ طرطوش بھی باواجی کے ساتھ مل کر دیواریں گرا رہا تھا بلکہ اس نے اپنے شاگردوں کو بھی اس محاذ پر بلا لیا تھا۔ باواجی کے کہنے پر اس کے شاگردوں نے طلسماتی قلعے کی دیواروں پر کھڑی محافظ چڑیلوں کو پکڑ کر باندھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ایسا کرنے سے فضا میں جنگ و جدل کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ طرطوش اور اس کے شاگرد چڑیلوں سے باقاعدہ گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ چڑیلیں کالے جادو کی پیداوار ہوتی ہیں۔ جبکہ جنات ان تمام علوم سے ماورا ہوتے ہیں۔ چڑیلوں کی ساری طاقت ان کے حاکم کے قبضہ میں ہوتی ہے۔ جتنا کوئی حاکم یا عامل طاقتور ہو اس کی مطیع چڑیلیں اتنی ہی طاقت کی حامل ہوتی ہیں۔

طرطوش اور دوسرے جنات کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان چڑیلوں کو قابو میں کرنا اس قدر آسان نہیں کیونکہ ان کا حاکم پنڈت رامانرائن ان کی رکھشا کر رہا تھا۔ جب وہ خاصی دیر تک چڑیلوں کو قید نہ کر سکے تو طرطوش نے باواجی سے کہا "باواجی سرکار! یہ کالی چڑیلیں قابو میں نہیں آ رہیں"۔

یہ سنتے ہی باواجی نے دیواریں گرانے کا عمل چھوڑ دیا اور طیش کے عالم میں اس کی طرف منہ کر کے بولے:

"طرطوش! تم اور تمہارے شاگرد ان چڑیلوں کو بھی قابو نہیں کر سکتے۔ کتنی شرم اور ذلت کی بات ہے۔ اپنے ساتھیوں سے کہو کہ پیچھے ہٹ جائیں۔ اب میں خود ان کو جلا کر بھسم کر دوں گا۔" یہ کہتے ہی باواجی دس قدم پیچھے ہٹے اور مندر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ پھر انہوں نے اپنی کالی چادر زمین پر بچھائی اور اس کے گرد نجور اور پیسی ہوئی شکرف سے دائرہ لگا دیا اور خود اندر بیٹھ کر چوکی لگانے لگے۔ انہوں نے خوشبویات سلگانے کیلئے طرطوش سے انگیٹھی منگوائی اور اس میں گوگل اور عطر ڈال کر آگ جلا دی، پھر وہ آنکھیں بند کر کے وظیفہ پڑھنے لگے۔

ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ باواجی کی چوکے کے گرد ایک سفید سا ہیولا نظر آنے لگا۔ اس لمحے باواجی نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ انہوں نے انجیر کی شاخ کا رخ ہیولے کی طرف کیا اور دھاڑ کر بولے: "آ تو م! تو نے اتنی دیر کیوں کر دی؟ کیا تجھے معلوم نہیں ہو گیا تھا کہ ہم تمہاری زنجیر ہلا رہے ہیں کم بخت!"۔

فضا میں ایک گونجدار آواز پیدا ہوئی۔ یوں لگا کہ جیسے آسمانوں پر بجلی کوندی ہو۔ باواجی کے جواب میں وہ ہیولا دائرے کے اندر داخل ہو گیا اور دوزانو ہو کر اس نے عقیدت کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

"پیچھے ہٹ کر بات کر کم بخت! باواجی تیرے ساتھ اس وقت تک ہاتھ نہیں ملائیں گے جب تک تو رامانرائن کے قلعے کو بھسم نہیں کر دیتا۔ اس نے تیری کچھ لگتی چڑیلوں کے پورے قبیلے کو قلعے کی دیواروں پر بیٹھا رکھا ہے۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ تو گندگی کے ان ڈھیروں کو کس طرح آگ دکھاتا ہے۔"

"جو حکم باواجی سرکار!" ہیولا گونجدار آواز میں بولا اور اس کے ساتھ ہی اس نے کھڑے ہو کر اپنے دونوں بازو طلسماتی قلعے کی طرف یوں بڑھا دیے جیسے اسے اپنے سینے سے لگانا چاہ رہا ہو۔

طر طوش اور اس کے شاگرد اس عجیب و غریب ہیولے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ باواجی نے اسے آتوم کہہ کر پکارا تھا۔ یہ نام ان کیلئے یہ اجنبی تھا۔ طر طوش حیران ہوا کہ برسوں سے باواجی کی سیوا میں لگا ہوا ہے اور ان کے ہر ایک راز سے بھی آگاہ ہے مگر آتوم کی آمد نے اسے یقین دلایا کہ وہ باواجی کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے باوجود ابھی ان سے مکمل طور پر آگاہ نہیں ہوا۔ طر طوش ایک صاحب علم جن تھا' مگر اس واقعے نے اس کی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے چند چڑیلوں کو مار کر سکا تھا مگر آتوم نے تو آتے ہی طلسمی قلعے کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اس نے ایک بازو کا حصار قائم کر کے قلعے کو جکڑ لیا اور دوسرے سے چڑیلوں کو یوں پکڑنے لگا جیسے کوئی پتنگے پکڑتا ہے۔

وہ ہر چڑیل کو اس کے بالوں سے پکڑتا اور اس کا ایک بال اتار کر اپنے قبضہ میں کر لیتا پھر اسے پرے پھینک دیتا۔ اسی طرح اس نے قلعے پر بیٹھی تمام چڑیلوں کے بال اکٹھے کر لیے اور پھر انہیں باواجی کو تھما کر بولا: "سرکار! یہ کالی چڑیلیں ہیں۔ یہ تب ہی مر سکتی ہیں جب ان کے بال جلا دیئے جائیں۔"

باواجی سلگتی ہوئی انگیٹھی میں بال ڈالنے لگے تو چڑیلوں نے واویلا مچا دیا اور بلک بلک کر اپنی جان بخشی کی التجائیں کرنے لگیں۔

"سرکار! ان پر رحم نہ کیجئے گا" آتوم کی آواز گونجی۔ "چڑیل کسی کی نہیں ہوتی۔ آپ نے اسے معاف کر دیا تو اس کی شیطانی طاقت اور بڑھ جائے گی۔"

یہ سنتے ہی باواجی نے تمام چڑیلوں کے بال انگیٹھی میں جھونک دیئے۔ اس لمحے چڑیلوں پر قیامت گزر گئی۔ وہ یوں سلگنے لگیں جیسے گرم لاوا پہاڑوں کو جھلسا دیتا ہے۔ طلسمی قلعے کے ارد گرد آگ ہی آگ نظر آ رہی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد ماحول شانت ہو گیا۔ آتوم بولا! "سرکار! اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم جا سکتے ہو آتوم! مگر یاد رکھو جب میں یاد کروں تو جلدی آ جایا کرو۔" باواجی نے کہا۔

آتوم عقیدت سے بولا: "سرکار! آئندہ غفلت نہیں کرونگا۔" پھر اس نے جھک کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو باواجی نے اس بار اس سے مصافحہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے آتوم کا ہیولا غائب ہو گیا۔ باواجی اٹھے اور انجیر کی چھڑی کی مدد سے اپنے حصار میں دروازہ بنا کر باہر نکل آئے۔

"طر طوش! تیرا مستان ابھی تک نہیں آیا....." باواجی نے حصار سے باہر نکلتے ہی پوچھا۔

یہ سنتے ہی طر طوش پریشان ہو گیا۔ "اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا"۔ وہ فکر مندی سے بولا۔ "کہیں وہ دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو؟"

"ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔" باواجی نے آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ پڑھا اور دوسرے لمحے ان کے چہرے پر حیرانی ابھر آئی۔ آنکھیں کھول کر بولے: "طر طوش میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میں نے چڑیلوں کو آزادی دے کر اچھا نہیں کیا"۔

"کیا ہوا ہے نہال شاہ جی؟" طر طوش گھبرا گیا۔

"انہوں نے آزاد ہوتے ہی مستان کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔" باواجی بولے۔ "اب تم مستان کے پیچھے جاؤ" میں خود اکیلا مندر میں جاتا ہوں۔ اگر میں پہلے مستان کو رہا کرانے اور چڑیلوں سے حساب برابر کرنے چل پڑا تو حرامی پنڈت کچھ اور نہ کر گزرے۔"

طرطوش نے باواجی کی تجویز سے اتفاق کیا اور وہ مستان کے پیچھے چل دیا۔ باواجی نے اپنی کالی چادر سے بکل ماری اور ایک نظر آسمان کی طرف دیکھ کر آگے بڑھے۔ چاند کو گرہن لگا ہوا تھا۔ ان کے حساب کے مطابق یہ رات نحوست کی تاریکیاں اوڑھے ہوئے تھی۔ ایسی راتیں کالے علم والوں کیلئے نعمت ہوتی ہیں۔ انہی راتوں میں وہ اپنی شیطانی قوتوں کو دوام بخشنے کیلئے چلے کرتے ہیں اور انسانی خون کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ باواجی اس رات کی سنگینیوں سے آگاہ تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہیں پنڈت رامانرائن روشن کو اپنی ہوش کا نشانہ بنانے کے بعد کالی کی بھینٹ نہ چڑھادے۔ یہ سوچتے ہی ان کا دماغ سلگ اٹھا۔ انہوں نے مندر کے اندر داخل ہونے سے پہلے اپنے گرد حفاظتی حصار قائم کر لیا اور پھر مندر کے ہاتھی دروازے تک جا پہنچے۔

دروازہ خلاف معمول کھلا تھا۔ پنڈت نے غالباً یہ سوچ کر دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا کہ طلسمی قلعے کی وجہ سے کوئی ذی روح یہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ باواجی مندر کے اندر داخل ہوئے تو پہلے ہی کمرے کی شان و شوکت اور پر سراریت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ پوجا پاٹ کا کمرہ تھا۔ جس کے درمیان کالی کی مورتی اپنی وحشت انگیز شکل و صورت کے ساتھ ایستادہ تھی۔ اس کے چرنوں میں خون سے بھرا تھار کھا ہوا تھا اس کے ساتھ ہی ایک انسانی کھوپڑی اپنی زندہ آنکھوں کے ساتھی پڑی تھی۔ کھوپڑی کی آنکھیں شیطانی چمک کے ساتھ دہک رہی تھیں۔ اس کے سر اپر ایک روشن دیا رکھا ہوا تھا۔ تاریک رات میں صرف ایک دیئے کی روشنی سے دن کا منظر پیش کر رہا تھا۔ باواجی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بابا منوہر کے مندر میں ہندو اب پوجا پاٹ نہیں کرتے بلکہ یہ کالے علوم کا مرکز بن چکا ہے۔ کیونکہ کالی کی مورتی اپنے لوازمات کے ساتھ اس بات کا واضح اشارہ کر رہی تھی کہ یہ مندر اس کے پجاریوں کی آماجگاہ ہے۔ کالے علوم کے پروردہ ہندوئوں کیلئے کالی ماتا ایک مقدس دیوی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے جہاں بھی کالے علوم کی تربیت دی جا رہی ہو وہاں کالی کی مورتی، خون بھرا تھال، شیطانی کھوپڑی اور اس پر روشن دیا رکھے جاتے ہیں۔

باواجی غصے اور نفرت کے ساتھ آگے بڑھے اور تھال کو ٹھوکر مار کر الٹا دیا اور شیطانی کھوپڑی پہ رکھے ہوئے دیئے کو اپنی چھڑی کی مدد سے پرے پھینک دیا۔ دیا نیچے گرتے ہی بجھ گیا اور کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ "شیطان کے پجاریو! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑونگا"۔ باواجی یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے مگر اسی لمحے انہیں اپنے عقب سے شیطانی قہقہہ سنائی دیا۔

"آ گئے نہال شاہ! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا"۔

باواجی نے پلٹ کر دیکھا تو ان کی نظر شیطانی کھوپڑی پر پڑی۔

"تم نے مجھے چھڑی کیوں نہیں ماری نہال شاہ۔" کھوپڑی بولی۔ "چھڑی مار کر تم نے دیا تو بجھا دیا۔ پائوں سے تھال بھی الٹ دیا لیکن میں تب مانوں جب تم یہ

چھڑی میرے سر پر مارو گے۔"

باواجی نے اس کی خواہش پوری کرنے کیلئے چھڑی اس کے سر پر دے ماری۔اس لمحے چٹاک کی آواز گونجی جس کے ساتھ ہی کمرہ ایک دم یوں تھر تھرا گیا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔"مزہ آگیا نہال شاہ!مزہ آگیا۔"شیطانی کھوپڑی کا مکروہ قہقہ گونجا۔"تمہاری چھڑی میں واقعی بڑی طاقت ہے۔"

"میں اسی چھڑی سے تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا شیطان کی اولاد!"باواجی دانت کچکچا کر بولے:"بتا تیرا گرو کہاں ہے؟جا اس سے کہہ دے نہال شاہ اس کی موت بن کر آگیا ہے۔اگر خود کو بچا سکتا ہے تو بچالے؟"۔

"میں اپنا گرو آپ ہوں نہال شاہ!"کھوپڑی بولی۔"میں ہی رامانرائن ہوں۔مہا طاقتوں کا گرو میں ہی ہوں۔پہنچ سکتے ہو تو مجھ تک پہنچ جائو۔اس مندر کے سارے دروازے کھلے ہیں۔میں نے سنا ہے تمہارے اندر بڑی شکتی ہے۔اس لیے تو تم مسان کھانے کے باوجود موت سے بچ نکلے۔تم نے میرا طلسماتی قلعہ تباہ کر ڈالا ہے اور میری موکل چڑیلوں کو بھی بھسم کر دیا ہے۔اب آگے بڑھو اور مجھے راکھ بنا ڈالو نہال شاہ!"کھوپڑی کا ایک ایک لفظ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔"میں خود تمہاری راہنمائی کرتا ہوں نہال شاہ!آؤ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"۔یہ کہتے ہی کھوپڑی یوں چل دی جیسے اسے پائوں لگے ہوئے ہوں۔

☆☆☆☆☆☆

باواجی کو پراسرار طاقتیں حاصل کرنے کے بعد اس طرح کی آزمائش سے دوچار نہیں ہونا پڑا تھا۔انہیں تو یہ معلوم ہی تھا کہ ہندو کالے علوم پر بہت دسترس رکھتے ہیں مگر انہیں اس سے قبل ان کی طاقتیں دیکھنے کا صحیح موقع نہیں ملا تھا۔

باواجی کھوپڑی کی راہنمائی میں آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔بالآخر کھوپڑی ایک بند دروازے کے پاس جا کر ٹھہر گئی اور اس کی جانب اشارہ کر کے بولی:"نہال شاہ!یہ بند دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جائو۔"

باواجی نے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا اور ساتھ ہی انہیں عجیب سی وحشت آمیز بو کا احساس ہوا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر روشن پر پڑی۔وہ سپاٹ آنکھوں سے دروازے کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔باواجی دیوانہ وار روشن کی طرف بڑھے مگر وہ تو بت بنی ہوئی تھی۔ان کی آمد کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"روشن! روشن!" باواجی اس کے قریب جا کر بولے۔ "روشن! تم ٹھیک ہو؟"

"ٹھیک کیسے ہو گی نہال شاہ۔ باواجی کے عقب سے وہی آواز گونجی۔ پنڈت رامانرائن نے اسے کسی قابل چھوڑا ہو گا تو یہ ٹھیک رہے گی ناں۔"

باواجی تیزی کے ساتھ پیچھے پلٹے تو دروازے میں پنڈت رامانرائن کو کھڑا پایا۔ اس کی شیطانی آنکھوں سے ہوس کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

"کتے! تو نے روشن کے ساتھ کیا کیا ہے؟" باواجی دھاڑے۔ "جو کسی کتے کو کرنا چاہیے۔" پنڈت نے کمینگی کے ساتھ قہقہہ لگایا۔

"تو نے میری روشن کی عزت کا روشن دیا بجھا دیا ہے بے غیرت انسان!" باواجی اس کی طرف بڑھے۔ "خدا کی قسم اب میں تم لوگوں کا ناپاک وجود اس دھرتی سے مٹا کر ہی دم لوں گا"۔

"ترے اندر دم رہے گا تو ہمارا دم نکالے گا نہال شاہ!" پنڈت اپنی جگہ پر قائم رہا اور باواجی کو طیش دلاتے ہوئے بولا: "تو کیا سمجھتا ہے ترے اندر بہت شکتی ہے۔ لیکن تم پنڈت کی شکتی نہیں جانتے۔ گڑھ شنکر کے مندروں کا مہا پجاری کالی کا دیوانہ اور لاڈلا رامانرائن معمولی انسان نہیں نہال شاہ!۔"

"تم انسان نہیں شیطان ہو۔" باواجی اس کی طرف تھوک کر بولے۔

"شیطان۔ ہا... ہا..." پنڈت نے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "بھگوان نے چاہا تو مجھے شیطان دیوتا کی شکتی بھی دے دے گا۔ شیطان دیوتا تو کالی کا گرو ہے نہال شاہ! اپنی اچھا تو یہی ہے کہ شیطان دیوتا مجھ پر اپنی نظر کرم ڈالے۔"

باواجی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے کچھ پڑھ کر انجیر کی شاخ کا رخ پنڈت کی طرف کیا تو وہ جھٹکا کھا کر پیچھے کو گر گیا۔ باواجی آگے بڑھے لیکن پنڈت اسی لمحے کھڑا ہو گیا۔ "بس یہی زور ہے تیری اس چھڑی کا..." پنڈت نے قہقہہ لگایا اور بولا: لے اب میرا زور دیکھ۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنی جٹاؤں کو جھٹکا دیا۔ اس کے لمبے لمبے الجھے بالوں کی ساری گرہیں کھل گئیں اور ان سے چھوٹے چھوٹے کیڑے زمین پر گرے اور دیکھتے ہی دیکھتے سنہرے سانپوں کی شکل اختیار کر گئے اور اڑ کر باواجی کی طرف بڑھے۔ باواجی نے بڑی بے نیازی کے ساتھ اپنی چھڑی لہرایا انداز میں گھمائی تو سانپ اس سے ٹکراتے ہی آگ کے شعلوں میں لپٹ گئے اور جلنے لگے۔ ان کے جلنے سے کمرے کی فضا تعفن سے بھر گئی اور باواجی کے لیے اس میں سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ یہ چڑیلوں اور دیگر ارواح خبیثہ کی گندگی تھی۔ جس کی بو بڑے سے بڑے عامل کو بے بس کر دیتی ہے، خاص طور پر روحانی علوم کے پروردہ عامل کیلئے ایسے ماحول میں کھڑے ہونا دوبھر ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ باواجی بدبودار ماحول کی گھٹن کا شکار ہو جاتے، انہوں نے اپنے لبادے میں سے گوگل اور مشک کافور نکالے اور انہیں ہاتھ میں لے کر آگ دکھا دی۔ گوگل ایک درخت کا گوند ہے جس کی خوشبو جنات اور دوسری ارواح کو بے کل کر دیتی ہے۔ ہر مسلمان عامل جب بھی کوئی عمل کرتا ہے تو جنات، چڑیلوں اور بدروحوں کو اپاہج کرنے کیلئے جن خوشبویات کی دھونی دیتا ہے گوگل بھی ان میں شامل ہوتا ہے۔

گوگل اور مشک کافور کی دھونی نے یکایک ہی گندگی کافور کردی لیکن اس لمحہ پنڈت نے جنتر منتر شروع کر دیے۔ وہ کالی ماتا کے منتر پڑھ کر اپنے گرد پھونکیں مارنے لگا اور پھر اس نے ایک زوردار پھونک مار کر کمرے میں آگ لگادی۔ اس وقت باواجی کی توجہ دھونی کی طرف تھی۔ آگ نے انہیں اپنے حصار میں لینے کی کوشش کی مگر وہ ان سے دو قدم پیچھے تک ہی محدود رہ گئی کیونکہ باواجی نے اپنی حفاظت کیلئے حصار قائم کیا ہوا تھا۔ پنڈت نے جب دیکھا کہ اس کی طلسماتی آگ نہال شاہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تو اس نے اپنے موکلان حاضر کر لیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرے میں سینکڑوں موکلان جمع ہو گئے... کالے بجھنگ خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے۔ یہ موکلان باواجی کے گرد دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اس دوران باواجی کی نظر دروازے سے ہٹ گئی جس کا فائدہ اٹھاتے ہی پنڈت رامانرائن، روشن کی طرف بڑھا اور اس کی کلائی پکڑ کر اسے باہر کی طرف لے جانے لگا۔ روشن کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل دی وہ ابھی دروازہ عبور کر ہی رہا تھا کہ اس کے موکلان کی شامت آگئی، لیکن اس وقت تک وہ روشن کو باہر نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

باواجی نے اپنی چھڑی کی مدد سے موکلان کو پیٹنا شروع کر دیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ صرف چھڑی سے کام نہیں بنے گا تو انہوں نے اپنے لبادے میں سے مٹھی بھر کر چاول نکالے اور کچھ پڑھنے کے بعد ان پر دم کیا، پھر کمرے میں بکھیر دیے۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے کمرے میں قسم قسم کی چاول کی دیگیں پڑی ہوں۔ پنڈت کے موکلان جانے کب سے بھوکے تھے۔ وہ اپنی من پسند خوراک دیکھتے ہی چاولوں پر جھپٹے مگر باواجی نے انہیں آواز دے کر کہا "خبیثو! یہ چاول تب ہی کھا سکو گے جب مجھے وچن دو گے۔"

"ہم وچن دیتے ہیں۔" موکلان یک زبان بولے۔

"تو پھر یہ بھوجن کھاتے ہی دفع ہو جاؤ اور پنڈت کے بلانے پر کبھی نہ آنا۔ کیونکہ تم نے بھوجن کھالیا ہے۔" باواجی نے کہا۔

عملیات کی پر سرار دنیا میں ایسے ہی عجیب و غریب طور طریقے ہوتے ہیں۔ جب بھی کوئی کالے علم کا ماہر موکلان کو قید کرتا ہے تو انہیں چاول نہیں کھانے دیتا۔ اگر کبھی انہیں چاول کھلا دیے جائیں تو وہ اپنے عامل کی قید سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ باواجی نے پنڈت کے موکلان کو آزاد کر دیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی باواجی نے دروازے کی طرف دیکھا تو پنڈت غائب ہو چکا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو روشن بھی غائب تھی۔ باواجی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پنڈت روشن کو لے کر کھسک گیا ہے۔

باواجی نے اسی لمحے اپنے موکل کی حاضری لگادی۔ چند لمحے بعد موکل حاضر ہوا تو انہوں نے اسے پنڈت کا پتہ لگانے کیلئے اپنے آگے کر دیا اور پھر اس کی راہنمائی میں مندر کے تہہ خانے تک پہنچ گئے۔ پنڈت تہہ خانے میں داخل ہو ہی رہا تھا جب باواجی نے اپنے موکل کے ساتھ اس کے سر پر پہنچ گئے اور اسے خبر بھی نہ ہو سکی۔ وہ روشن کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ باواجی نے کڑک دار آواز کے ساتھ اسے روکا۔ "پنڈت رک جاؤ..."۔

رامانرائن نے حیران نظروں کے ساتھ باواجی کی طرف دیکھا پھر یکایک روشن کو قید خانے کے کھلے دروازے کے اندر دھکا دے دیا اور خود بھی اڑتا ہوا تہہ

خانے میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

باواجی نے موکل کو اپنے واپس بھیج دیا اور خود دروازے کے پاس پہنچے اور اپنی چھڑی زور سے دروازے پر ماری۔ دروازہ ٹوٹ کر کھل گیا اور باواجی اندر داخل ہو گئے۔

پنڈت نے جونہی دیکھا کہ باواجی اس کے سارے طلسمات تہس نہس کر کے اس تک پہنچ گئے ہیں تو اس نے روشن کو اپنی ڈھال بنا لیا اور بولا: "نہال شاہ! اب تم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں تمہاری روشن کو جان سے مار دوں گا۔" لیکن باواجی نے پنڈت کی دھمکی نظر انداز کر دی اور اسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگے۔ تاہم وہ زیر لب وظائف پڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے اس پر پھونک ماری اور اسے اپنی نظروں کے سامنے لا کر کھول دیا۔ پھر اس پر اتنے زور سے پھونک ماری کہ کمرہ یکایک سرد ہوائوں سے بھر گیا۔ یوں لگا جیسے برطانی طوفان نے کمرے پر تسلط جما لیا ہے۔ ایسا ہی انہوں نے پہلی بار منصور خاں کو سزا دینے کیلئے کیا تھا یا اب شیطانی علوم کے پروردہ پنڈت موہن کو کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرد ہوائوں کے تیز بگولوں نے پنڈت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ چیختا ہی رہ گیا۔ روشن کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ نیچے گر گئی تھی۔ اسی لمحے باواجی آگے بڑھے اور بے ہوش روشن کو پیچھے گھسیٹ لائے۔

کمرہ پنڈت کی چیخ و پکار اور سرد بگولوں کے شور سے بھر گیا تھا۔ باواجی نے روشن کو اپنے بازوئوں پر اٹھا لیا اور تہہ خانے سے باہر نکل گئے۔ اب انہیں پنڈت رامانرائن کی فکر نہیں تھی کیونکہ سرد بگولوں نے اس آتشی عامل کی روح منجمند کر دی تھی۔ عملیات کی دنیا کا یہ دستور ہے کہ کالے علوم کے پجاری اور جنات سرد پانی سے گھبراتے ہیں اور انہی سے ان کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ باواجی نے اندازہ کر لیا تھا کہ پنڈت آتشی علوم کا بھی ماہر ہے۔ یہ قوت جنات کے پاس ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس قصہ کا تمام کرنے کیلئے اس کو سرد بگولوں کے ذریعے منجمند کر دیا تھا۔ ان کے اس عمل کا توڑ ان ہندوئوں کے پاس نہیں تھا، اس لیے وہ مطمئن ہو کر حویلی واپس چلے آئے تھے۔ انہوں نے حویلی پہنچتے ہی بے ہوش روشن کو بستر پر لٹایا۔ اس کی ماں باواجی کے حجرے میں بیٹھی ابھی تک رو رہی تھی۔ وہ باواجی کو دیکھتے ہی ان کے قدموں پر جھک گئی مگر انہوں نے اسے بازوئوں سے تھام لیا اور کہا۔

"چاچی! تو میری ماں جیسی ہے۔ مائیں بیٹوں کے پائوں نہیں پکڑتیں۔"

"میرے بچی زندہ تو ہے نہال شاہ؟" روشن کی ماں بلکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"یہ بے ہوش ہو گئی ہے چاچی!" باواجی نے کہا اور پھر اپنے مختصر سے مطب میں سے کچھ دوائیاں نکال کے بے ہوش روشن کو ہوش میں لانے لگے۔ انہوں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اور دوائیوں کے اثر پذیر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ چند ہی لمحے بعد روشن کی نبض معمول پر آنے کے بجائے مدھم پڑنے لگی۔ باواجی نے اسے ایک اور دوائی پلائی، اس کے بعد روشن کی ماں کو حجرے سے باہر بھیجتے ہوئے کہا

"چاچی! جب تک میں نہ کہوں اندر نہ آنا"۔ وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی باہر چلی گئی تو باواجی طرطوش کی حاضری لگانے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ حاضر ہو گیا۔

باواجی نے اسے روشن کی بے ہوشی کے بارے میں بتایا تو اس نے فوراً ایک نسخہ تجویز کر دیا اور ساتھ ہی وہ دوا بھی لا کر دی۔ دوا کھاتے ہی روشن نے آنکھیں کھول دیں اور جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے بے یقینی سے باواجی کو دیکھا پھر ارد گرد دیکھنے لگی مگر اسی لمحے اسے اپنے حالات کا اندازہ ہو گیا اور وہ سمٹ کر اپنے ہی اندر چھپنے لگی۔ باواجی نے اپنی چادر اتار کر اس کا سر اور تن ڈھانپ دیا اور بولے:

"روشن اب تم ٹھیک ہو۔ آرام کرو میں ذرا باہر جاتا ہوں۔"

روشن نے یکدم باواجی کا ہاتھ تھام لیا اور تڑپ تڑپ کر رونے لی! "نہال شاہ جی! یہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں تو برباد ہو گئی نہال شاہ جی! مجھے میرے ماں جائے نے برباد کر دیا ہے۔ مجھے کوئی زہر دے دیں۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔"

باواجی نے اسے حوصلہ دیا۔ "روشن ایسی باتیں نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں آپ کے قابل نہیں رہی نہال شاہ!" روشن روتی جا رہی تھی۔

"تم میرے لیے آج بھی وہی حیثیت رکھتی ہو جو تمہاری پہلے تھی۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔" باواجی نے اسے تسلی دی اور کہا "میں نے اس شیطان کو جہنم واصل کر دیا ہے۔ اب رہا تیرا بھائی..... تو میں ابھی اس کا پتہ کراتا ہوں۔ تم اب اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔"

"میں اپنے دل کو کیسے بڑا کروں۔" روشن تڑپی۔ "عورت کی عزت ہی تو اس کے دل کی پاسبان ہوتی ہے۔ جب عزت ہی نہ رہی تو دل کیسا نہال شاہ جی!"۔

باواجی نے جب دیکھا کہ روشن کی ذہنی حالت بگڑ رہی ہے تو انہوں نے پانی دم کر کے اس کے سر پر چھڑک دیا اور بولے۔ "روشن تم میری جان ہو۔ تمہاری عزت میری عزت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری عزت آج بھی قائم ہے۔ تم کچھ دیر آرام کرو..... میں تمہاری ماں کو تسلی دے کر آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر باواجی باہر نکلے مگر اس سے قبل انہوں نے طرطوش کو واپس بھیج دیا تھا۔ وہ مستان کے بارے میں پوچھنا نہ بھولے تھے۔ جب طرطوش نے بتایا کہ مستان کو چڑیلوں کی قید سے رہا کرا دیا گیا ہے تو باواجی نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ طرطوش نے جاتے جاتے ایک انکشاف کرتے ہوئے کہا: "باواجی اگلی نوچندی رات کو جانگلی وال کے برساتی نالے پر ہندو عاملوں نے ایک میلہ لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ہندو مسلمان لڑکیوں اور لڑکوں کے خون سے کالے علم کے نئے منتر تیار کر رہے ہیں۔ آپ فارغ ہوتے ہی ان کی خبر لیں۔"

یہ سنتے ہی باواجی کو فکر لاحق ہو گئی۔ انہوں نے یہ تو سن رکھا تھا کہ نمولیاں سے ڈیڑھ کوس کی مسافت پر ہندوؤں کا ایک شمشان گھاٹ ہے جس کے ایک

طرف ہندوئوں کا گائوں جانگلی وال ہے۔ گائوں کے درمیان سے ایک برساتی نالہ گزرتا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ چڑیلوں کا مسکن ہے۔ پنڈت رامانرائن نے اپنے قلعے کی حفاظت کیلئے جانگلی وال کی چڑیلوں ہی کو بلایا تھا۔ باواجی نے تہیہ کر لیا کہ وہ روشن کے ٹھیک ہوتے ہی جانگلی وال جائیں گے اور نوچندی رات سے پہلے برساتی نالے کی چڑیلوں کو راکھ کر دیں گے۔

باواجی ابھی اپنی سوچوں میں گم تھے کہ اچانک انہیں حجرے کے اندر سے روشن کی چیخ سنائی دی۔ وہ دوڑ کر حجرے میں پہنچے تو روشن کو دیکھتے ہی ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ ان کی محبت اور چاہت روشن ایک تیز دھار خنجر اپنے دل میں پیوست کیے ہوئے تڑپ رہی تھی۔ وہ جھٹ سے آگے بڑھے اور خنجر نکال کر پرے پھینک دیا اور نڈھال سی روشن کو سہارا دے کر لٹانے لگے۔ "روشن تم نے یہ..... یہ کیا کر دیا"۔

"میں نے کہا تھا نہال شاہ جی، میں آپ کے قابل نہیں رہی۔" روشن کی آواز لڑکھڑائی۔ "مجھے معاف کر دیجئے گا نہال شاہ جی! میں آپ کی روشن تھی مگر پنڈت نے مجھے تاریک کر دیا تھا... نہال شاہ جی... میرے ساتھ ایک وعدہ کیجئے۔" روشن نے کپکپاتے ہاتھوں سے باواجی کا ہاتھ پکڑا۔ "مجھ سے وعدہ کیجیے گا کہ آپ اب اپنی حویلی آباد کریں گے۔"

"روشن! میں وعدہ کرتا ہوں۔" باواجی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ وہ جانتے تھے کہ روشن نے جو خنجر اپنے دل میں اتارا تھا زہر میں بجھا ہوا تھا اور تیز دھار خنجر نے اس کا دل کاٹ کے رکھ دیا ہے۔

روشن! باواجی کے بازئوں میں دم توڑ دیا۔

جانگلی وال کی چڑیلیں

روشن کی موت نے باواجی کو پژمردہ کر دیا تھا۔ انہوں نے خود کو حجرے میں بند کر لیا اور کئی ہفتے وہ یونہی تنہا اور مقید زندگی کے حصار میں بند رہے۔ اس دوران انہوں نے طرطوش کو بلایا، نہ کسی قسم کا چلہ کیا۔ طرطوش نے ایک دو بار خود حاضری دینے کی کوشش کی مگر باواجی اسے واپس بھیج دیتے۔ یہ تقریباً ایک ڈیڑھ مہینے بعد کی بات ہے، طرطوش اپنے طور پر حاضر ہو گیا۔ اس روز وہ بہت برہم دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آتے ہی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا: "نہال شاہ جی! ایک عورت کی خاطر تم نے ساری دنیا سے ناتا توڑ لیا ہے۔ یہ مردوں والی بات نہیں ہے"۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" باواجی نے بیزاری سے پوچھا۔

"میں کچھ کہنے نہیں آیا بلکہ یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ حجرے میں بند رہ کر ایک عورت کا سوگ منانا تمہیں زیب نہیں دیتا"۔

"آخر نکلے نا جن ہی۔" باواجی نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "تمہیں انسان کے جذبات کا احساس نہیں ہے، اسی لیے جلی کٹی سنا رہے ہو طرطوش۔ اگر تمہارے اندر بھی ایک محبت کرنے والے کا دل ہوتا اور تم پر بھی یہ قہر ٹوٹتا تو میں تجھ سے یہ پوچھتا۔"

"ہم پر بھی یہ قہر ٹوٹتے ہیں نہال شاہ!" طرطوش نے قدرے تلخی کے ساتھ کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو۔ یہ محبت و عشق صرف تم انسانوں کا وصف ہے۔ جنات بھی لطیف جذبات رکھتے ہیں۔"

"نہیں طرطوش! نہیں۔" باواجی نے اس کی بات جھٹک دی اور حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا: "جنات محبت کے لطیف جذبات سے ناآشنا ہیں۔ تم لوگوں کی محبت تو پتھروں جیسی ہے" جبکہ ہماری محبت پھولوں جیسی ہوتی ہے" پھر باواجی نے روشن کی یاد میں گزارے ہوئے ہفتوں کے حساب دیتے ہوئے کہا۔ "طرطوش! تم نے آتے ہی مجھ پر یہ طنز کیا ہے کہ میں ایک عورت کی محبت میں کیا کر رہا ہوں تو سنو طرطوش! میں روشن کی زندگی میں محبت کے جذبے سے اس قدر آشنا نہ تھا جتنا اس کے مرنے کے بعد آشنا ہوا ہوں۔ اس کے ہوتے ہوئے تو میں صرف اس لیے اسے پسند کرتا تھا کہ اس سی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ سے ہی مجھے حویلی اچھی لگنے لگی تھی، اس لیے کہ میں برسوں سے تنہا تھا، اس کی ذات نے مجھے اپنے بارے میں سوچنے کا موقع دیا۔ اب وہ نہیں رہی تو یوں لگ رہا ہے جیسے مجھ سے اپنا آپ چھن گیا ہو، میں پھر سے تنہا ہو گیا ہوں۔ اس کی موت نے مجھے نڈھال کر دیا ہے۔ لیکن طرطوش، مجھے زندگی کے اس تجربے نے عشق و محبت کی معراج تک پہنچا دیا ہے۔ عشق مجازی کا یہ روپ مجھے عشق حقیقی کی طرف گامزن کر گیا ہے۔ بزرگوں نے کیا سچ کہا ہے کہ نیکی کی قدر وہ کر سکتا ہے جو گناہ کی زندگی سے تائب ہو کر اس طرف آئے۔ اور عشق حقیقی کی اصل لذت بھی وہی اٹھاتا ہے جو عشق مجازی کا ذائقہ

چکھ لے اور اس کا کرب اٹھائے۔ میں ان دنوں ایسی ہی کیفیت میں مبتلا رہا ہوں، اس لیے روشن میرے لیے انتہائی معتبر عورت ہے۔ وہ بظاہر مر گئی ہے مگر میرے اندر زندہ ہے۔"

طرطوش سر گرائے باواجی کی باتیں سنتا رہا لیکن ان کے خاموش ہوتے ہی بولا: "نہال شاہ! اگر تم چاہو تو روشن ہمیشہ تمہارے سامنے رہ سکتی ہے۔ وہ صرف تمہارے لیے زندہ ہو گی اور صرف تمہیں نظر آئے گی۔ باقی دنیا کیلئے اس کا وجود غیر مرئی ہو گا۔"

"طرطوش!" باواجی ایک دم بھڑک اٹھے۔ "تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو۔ کیا میں سفلی علوم کے ذریعے اس کی روح کو قید کر لوں۔ مجھے تم سے اس قدر گھٹیا بات کی توقع نہیں تھی۔"

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟" طرطوش شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔ "آپ کے مسلمان بھائی بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ وہ بھی تو مردوں کی روحیں حاضر کرتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو طرطوش!" باواجی کا پارا چڑھ گیا۔ "میں ایسے مسلمانوں پر لعنت بھیجتا ہوں جو نام کے مسلمان ہیں مگر کرتوتوں میں کافروں سے بڑھ کر ہیں۔"

"مجھے یاد آیا نہال شاہ! میں نے تم سے کہا تھا کہ جانگلی وال میں ہندو عاملوں نے میلہ لگانا ہے۔ مگر تم اپنے سوگ میں یہ بھول ہی گئے۔ کل نوچندی جمعرات ہے۔ خدا کیلئے اب ہی ہوش کرو اور اٹھو۔"

باواجی کے ذہن کے تاروں میں ایک بجلی کوندی وہ شرمسار سے ہو گئے اور بولے: "طرطوش! میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے غم کی دنیا آباد کرنے کیلئے اتنے بڑے اور اہم کام سے روگردانی کی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور بولے۔ "انشاءاللہ کل کی رات۔ جانگلی وال کے کالے عاملوں کو کبھی نہ بھولے گی۔"

"آپ ان عاملوں کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ کیونکہ اس کام میں، میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ مجھے اپنے شاہ کے حکم پر کچھ کام کرنے ہیں۔"

باواجی دھیرے سے مسکرائے۔ "میرا کام کرنے والوں کی کمی نہیں۔"

طرطوش کو ایک دم کچھ یاد آ گیا۔ وہ بولا: "باواجی وہ آتوم کون تھا؟"

"پھر کبھی بتائوں گا"۔ باواجی بولے۔ "تم اب جائو۔ میں نوچندی جمعرات کیلئے کچھ تیاریاں کر لوں۔"

اس روز نوچندی جمعرات تھی۔ باواجی نے روزہ رکھا انہوں نے آج کی رات چوکی لگانے کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ عملیات کے ذریعے کوئی کام کرنے پر مائل ہوئے تھے۔ چوکی لگانے سے پہلے انہوں نے سرخ پوشاک زیب تن کی۔ شام ہوئی تو کھیر کے ساتھ روزہ افطار کیا اور ٹیلے سے اتر کر قبرستان کی جانب چل دیئے۔ ایک قبر کے پاس بیٹھ کر چوکی کا ساز و سامان نکالا اور ایک سایہ دار برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ انہوں نے زیتون کے تیل کا چراغ جلایا پھر پسی ہوئی شنگرف نکالی اور زمین پر اس کا سرخ گول سا دائرہ کھینچ کر حصار قائم کر دیا اور خود اس کے اندر بیٹھ گئے۔ چراغ کے پاس ہی انہوں نے انگیٹھی نکال کر دکھ دی تھی۔ جس میں خوشبویات بطور ایندھن جلائی جانی تھیں۔ خوشبویات کیلئے گوگل اور لوہاب کی انگیٹھی میں ڈال دیا اور پھر اس کو آگ دکھا دی۔

رات کا درمیانی پہر تھا۔ قبرستان کے سناٹے میں جھینگروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور کہیں سے کتوں کے رونے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ باواجی کو رات کے درمیانی پہر ہی تک چلا کاٹنا تھا۔ انہوں نے نوچندی رات کے طلسمات کو مفلوج کرنے کیلئے ستاروں کے صدقات دیئے اور پھر ہاتھ میں راکھ نما کالی مٹی لے کر اس پر وظائف پڑھنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد جب وظائف کی مقررہ تعداد ختم ہو گئی تو انہوں نے کالی مٹی کو آسمان کی طرف اچھال دیا۔ مٹی ایک طوفان کی طرح فضا میں بکھر گئی اور آسمان کی روشنیوں کو نگلنے لگی۔ جوں جوں یہ مٹی بلند ہو رہی تھی باواجی دم کی ہوئی مزید کالی مٹی اوپر اچھال رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالی مٹی نے باقاعدہ طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے ساتھ ہی تیز ہوائوں کے جھکڑ چلنے شروع ہو گئے، باواجی نے چھڑی کا رخ جانگلی دال کی طرف کیا تو کالی مٹی کے طوفان نے اپنا رخ اس طرف کر لیا۔

☆☆☆☆☆☆

دھواں یوں چاندنی رات کو نگل گیا جیسے یہ رات نوچندی نہ تھی بلکہ اندھیری منگل کی طرح پر ہول اور پر اسرار ہو۔ جانگلی وال وہاں سے چند میل کے فاصلے پر تھا مگر طوفان نے جونہی آسمان کو اپنے مہیب اندھیروں میں ڈھانپ لیا تو آہ و پکار کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا' نالے کے گرد پوجا پاٹ اور چلہ کاٹنے والے ہندوئوں کے سارے منتر الٹ ہو گئے۔ کیونکہ اندھیرا چھاتے ہی نوچندی رات کا طلسم ختم ہو گیا تھا اور وہ ساری ہوائی مخلوق جو نوچندی رات میں آزاد پھر رہی تھی' واپس اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹنے لگی۔

طلسمات کی دنیا کی روایات کے مطابق نوچندی رات کے دوران ہوائی مخلوق اندھی ہو جاتی ہے اور ان میں سے وہ جن' بھوت' چڑیل' دیو' موکلات وغیرہ جو اس وقت اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر گھوم پھر رہے ہوتے ہیں چاند کی روشنی میں آنکھوں کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کالا علم جاننے والے اس

رات فائدہ اٹھاتے ہیں اور عملیات کے زور پر بھٹکی ہوئی ہوائی مخلوق کو قبضہ میں کر لیتے ہیں۔ اندھیری منگل بھی طلسمات کی دنیا میں ایک ایسی ہی بھیانک رات ہوتی ہے جو کالے علم کے پجاریوں کے لئے خوشیوں کا سامان پیدا کرتی ہے۔ اندھیری منگل اس رات کو کہتے ہیں جب چاند پورے مہینہ کا سفر کرنے کے بعد کچھ دنوں کے لئے ڈوب جاتا ہے تو ان دنوں جو پہلی منگل آتی ہے 'نہایت تاریک ہوتی ہے۔ یہ رات ہوائی مخلوق کے جشن اور عید کی رات ہوتی ہے۔ یہ خرمستیاں کرتی ادھر سے ادھر آتی جاتی رہتی ہیں۔ کالے علم کے پجاری اس رات سے بھی خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔

برصغیر میں اندھیری منگل اور نوچندی رات کے عملیات صدیوں سے رائج ہیں۔ باواجی کے دور میں ان عملیات کا شیطانی دائرہ اور بڑھ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں مسلمان حکمرانوں کا زور ختم ہو رہا تھا اور ہندو سکھ راجے مہاراجے اپنی ریاستوں کو مضبوط بنا رہے تھے۔ ہندو عاملوں اور نجومیوں کو ان کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ پورے ہندوستان کے قبرستان 'ندی نالے 'شمشان گھاٹ اور گنگا جمنا میں راتوں کو ہندو عاملوں کا رن پڑ جاتا۔ اس دور میں مسلمان عامل بہت کم ہوا کرتے تھے۔ ہندو ہی اس علم پر چھائے ہوئے تھے۔ ویسے بھی کالے علوم ان کے مذہب کا حصہ ہیں۔ اس لئے وہ ان علوم کے لئے جن شیطانی ہدایات پر عمل کرتے 'اسے دیوی دیوتاؤں کی پرارتھنا (عبادت) سمجھ کر کرتے تھے۔ نوچندی اور اندھیری منگل کے عملیات آج بھی جاری ہیں' لیکن ظلم یہ ہے کہ ہندوئوں کے بعد عیسائیوں اور مسلمان عاملوں نے بھی اب ان راتوں کو اختیار کر لیا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے بڑے بڑے قبرستانوں اور شمشان گھاٹوں میں کالے علم کے پجاری بدمست ہو کر چلے کاٹتے ہیں۔ لاہور میں میانی صاحب اور دریائے راوی کے کنارے آج بھی ان راتوں میں طلسمات کے دیئے روشن کئے جاتے ہیں۔ سندھ کی سرزمین تو ویسے بھی ہندو عاملوں کے قبضہ میں آچکی ہے جہاں وہ اپنے شیطانی پنجے گاڑھ کر مکروہ روایات جنم دیتے رہتے ہیں اور پورے پاکستان کے کالے عامل سال میں ایک بار وہاں میلہ لگاتے ہیں۔ یہ تو خیر میں اگلی اقساط میں ان عاملوں کے آنکھوں دیکھے حالات بیان کروں گا۔ فی الحال باواجی نہال شاہ کی سنئے۔

جانگلی وال کے کالے عاملوں کو فی الفور تو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے چلوں نشٹ کس نے مارا ہے۔ ہر کوئی عملیات کے الٹ پڑنے سے بوکھلایا ہوا تھا اور اپنے اپنے بال نوچ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سبھی افراتفری میں مبتلا رہے مگر جونہی انہیں ہوش آیا تو وہ سب نالے کے کنارے اکٹھے ہو گئے اور مل بیٹھ کر وچار کرنے لگے کہ نوچندی رات یکایک اندھیری منگل کی طرح سیاہ کیسے ہو گئی ہے؟

جانگلی وال کے عاملوں کے وچار نے انہیں خاصی دیر تک شش و پنج میں مبتلا کئے رکھا۔ پھر سارے عامل اس بات پر متفق ہو گئے کہ دیوی دیوتاؤں کے شڑاپ (عذاب) سے بچنے کے لئے مسلمان کنیائوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ اس مرحلہ پر ان میں سے ایک نوجوان عامل اٹھا اور انہیں کہنے لگا:

"آپ سب اپنی اپنی شکستی میں مہان ہیں مگر آپ کے وچار نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ نوچندی رات کا نشٹ مارنے میں کسی اور کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔" وہ سب چونک کر اس نوجوان کی طرف دیکھنے لگے۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو منصور خان!" ان میں سے ایک بوڑھے پنڈت نے اس کی طرف دیکھا۔

"مہاراج! میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہنا چاہ رہا ہوں کہ اس رات کے تیور بگاڑنے میں نہال شاہ کا ہاتھ ہے"۔

منصور خان کی بات سنتے ہی ہندو عامل غصہ سے کھول اٹھے۔ وہ منصور خان اور نہال شاہ کے تعلق کو بھی جانتے تھے اور دشمنی کو بھی۔ انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ نہال شاہ نے کس طرح ان کے ایک مہان شکتی پنڈت رامانرائن کو بے بس کر کے مار دیا تھا۔ ان کے دل میں باواجی نہال شاہ کے لئے نفرت بھری ہوئی تھی اور یہ نفرت بڑھانے میں منصور خان کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہا تھا۔ وہ بدبخت انسان روشن کو پنڈت کے حوالے کرنے کے بعد گائوں سے فرار ہو گیا تھا۔ پنڈت نے اسے اپنے چند پنڈتوں کا پتہ دے دیا تھا کہ وہ ان کی پناہ میں چلا جائے۔ منصور خان کا کوئی دین ایمان نہیں رہا تھا۔ اس نے ہندو عاملوں کی پناہ میں جاتے ہی خود بھی مکروہ کالے علم سیکھنے شروع کر دیئے تھے اور ان کے رنگ میں پورا رنگا گیا تھا۔ وہ بھی جانگلی وال میں عملیات کے زور پر پراسرار طاقتیں قبضہ میں کرنے آیا تھا۔

منصور خان نے جب دیکھا کہ لوہا گرم ہے تو اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے دلیل دی:

"مہاراج! آپ سب تو اپنے اپنے چلوں میں مست تھے مگر میں اس لمحے آنکھیں کھولے ہوئے تھا۔ میں نے دیکھا کہ جب ہوائی مخلوق کو پکڑنے کا سماں بندھ رہا تھا تو میرے گائوں کی طرف سے ایک کالی آندھی اٹھ رہی ہے۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ جانگلی وال کی طرف بڑھ رہی تھی میں سمجھا کہ یہ موکلان کی فوج ہے جو ہمارے مہان شکتی عاملوں کے قبضے میں آگئی ہے۔ اگر مجھے اس وقت معلوم ہو جاتا کہ یہ کالی آندھی نوچندی رات کو ہڑپ کرنے والی ہے تو میں اسی سمے آپ کو بتا دیتا۔" منصور خان نے ایک بوڑھے پنڈت کو دیکھتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا: "مہاراج! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ نہال شاہ کے پاس بھی شکتی ہے۔ پہلے اس کا بندوبست کریں پھر عملیات کریں۔ مگر آپ نے اس وقت میری بات کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ یہ منصور خان کا خوف ہے جو اسے نہال شاہ سے ڈرا تا رہتا ہے"۔

بوڑھے پنڈت کا نام رگھومل مہاراج تھا۔ وہ کالی کا پجاری تھا۔ ایک عرصہ تک سومنات کے مندر میں بھی پوجا پاٹ کرایا کرتا تھا مگر اب اس نے کالی دیوی کے نام لیوائوں کی ایک الگ سے جماعت بنانی شروع کی تھی۔ وہ جادو ٹونہ کو ہندومت کا ہی حصہ سمجھتا تھا اس لئے اس نے ہوشیار پور میں اپنے چیلوں کو جادو ٹونے کی تربیت دینے کا مرکز بنا لیا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ جانگلی وال کے نالے کے گرد کالے جادو کے پجاری اور پنڈت چلے کاٹنے آتے ہیں تو وہ اپنے دو چیلوں کے ساتھ ادھر آ گیا تھا۔ یہیں پر اس کی ملاقات منصور خان سے ہوئی۔ منصور خان نے پہلے دن ہی سے گویا رگھومل مہاراج کے چرن دھو کر پی لئے تھے۔ وہ بدفطرت دین اسلام چھوڑ کر ہندومت میں داخل ہو گیا تھا لیکن ابھی اس نے مصلحتاً اپنا نام نہیں بدلا تھا۔ اسے جب سے رگھومل مہاراج کے بارے میں معلوم ہوا تھا وہ اس کے آگے پیچھے بچھ بچھ جاتا تھا۔ اس لئے کہ شاید وہ اس کی وساطت سے کالا جادو سیکھ کر باواجی نہال شاہ کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکے مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ ہندو کسی مسلمان کو ہندو بنانے کے باوجود اسے ملیچھ ہی سمجھتے ہیں۔ ان کی حیثیت اونچی ذات کے ہندوئوں کے نزدیک شودروں جیسی ہی ہوتی ہے۔ کالے علوم کے پجاری ہندوئوں نے منصور خان کو اپنے گروہ میں شامل تو کر لیا تھا مگر اندرون خانہ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف

باواجی نہال شاہ کے خلاف اسے استعمال کرنے کے لئے برداشت کر رہے تھے۔ لیکن اس وقت وہ سب منصور خان کی ذہانت پر عش عش کر اٹھے تھے۔ اس لمحے وہ انہیں بہت عزیز ہو گیا تھا۔

"منصور خان! تمہاری باتوں نے ہمیں قائل کر دیا ہے' اس لئے ہم کالی دیوی کے پجاری تمہیں وچن دیتے ہیں کہ اب پہلے ملیچھ نہال شاہ کا کریا کرم کریں گے۔ اس کے بعد کچھ اور ہو گا۔" رگھومل مہاراج نے اسے یقین دلایا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ سب اپنے اپنے جادو کے زور پر اس کو راکھ میں بدل دیں' اس نے ہمارے پنڈت جی کے ساتھ جو کیا ہے میں اسے بھول نہیں سکتا۔" منصور خان مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے بولا۔

"دھیرج منصور خان دھیرج۔ آج کی رات نشٹ ہونے کا مطلب ہے کہ اب یہ سمے ہمارا نہیں رہا۔" رگھومل مہاراج نے کہا۔ "لیکن سویر ہوتے ہی تم دیکھ لینا تمہارا یہ نہال شاہ کتنی عبرتناک موت مرے گا۔ اس پر دیوی دیوتاؤں کا شڑاپ نازل ہو گا"۔

پجاریوں نے وہ رات جیسے تیسے کاٹ تو لی مگر اگلی صبح ہی سب ہوشیار پور روانہ ہوتے ہوئے بڑے ہی بے چین تھے۔ ان کی بے چینی کا ایک بڑا سبب وہ مسلمان لڑکیاں تھیں جو انہوں نے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھانے کے لئے پکڑ رکھی تھیں۔ وہ تعداد میں پانچ تھیں۔ متناسب جسم اور تیکھے نین نقش والی یہ لڑکیاں انہیں منصور خان ہی نے فراہم کی تھیں۔ ان میں سے تین تو نمولیاں کی ہی تھیں جنہیں وہ بہلا پھلا کر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ جبکہ دو ہوشیار پور سے لائی گئی تھیں۔ پنڈتوں نے لڑکیوں کو ایک خاص قسم کا مشروب پلا کر ان کے حواس اپنے قابو میں کئے ہوئے تھے۔ وہ ان کے ہر حکم کو بڑی خوشدلی سے بجا لاتی تھیں۔ لیکن رات گزرنے کے ساتھ جونہی اس مشروب کا اثر ختم ہوا وہ دیوانی ہو گئیں۔ ان کے دماغ الٹ گئے تھے۔ عاملوں نے تو انہیں رات کو ہی بھینٹ چڑھا دینا تھا مگر وہ نوچندی رات کے طلسمات الٹ جانے سے اس قدر بوکھلا گئے کہ انہیں یہ یاد ہی نہ رہا کہ لڑکیوں کو دوبار مشروب نہ پلایا گیا تو وہ پہلے مشروب کا اثر ختم ہوتے ہی پاگل ہو جائیں گی۔ خدا کو ان لڑکیوں کو بچانا مقصود تھا' اس لئے پجاری ان سے غافل ہو گئے تھے۔ صبح سویرے جب وہ انہیں اپنے ساتھ واپس لے جانے کے لئے وہاں پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی لڑکیوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے' ان کے بال بکھرے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ پانچوں آپس میں لڑ لڑ کر نڈھال ہو چکی تھیں مگر پجاریوں کو دیکھتے ہی وہ مشترکہ قہقہے لگانے لگیں۔

پجاریوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ لڑکیاں دیوانی ہو چکی ہیں۔ انہوں نے یہ طے کیا کہ انہیں اسی حال میں چھوڑ کر چلے جائیں کیونکہ اب وہ ان کی قربانی نہیں کر سکتے تھے۔

سارے پجاری اپنا اپنا سامان سمیٹ کر رگھومل کے ساتھ ہوشیار پور چلے گئے۔

اگلی صبح باواجی نے طرطوش کی حاضری لگائی تو وہ دیوانہ وار قہقہے لگاتا ہوا حاضر ہو گیا۔ باواجی کو اس کا یوں ہنسنا اچھا نہ لگا مگر اسے کچھ نہ کہا' البتہ بڑے تعجب کے

ساتھ پوچھا: "طرطوش! کیا بات ہے بہت خوش نظر آرہے ہو۔"

"نہال شاہ بات ہی ہنسنے والی ہے۔" طرطوش کہنے لگا۔ "اصل میں نوچندی رات کا عمل الٹ جانے سے جہاں جانگلی وال کے میلے کا ناس ہوا ہے وہاں ہماری بھی ایک بلا ٹل گئی ہے"۔

باواجی نے حیرت سے پوچھا۔ "کیسی بلا...؟"

"نوچندی رات کو ہمارے شہنشاہ نے چڑیلوں کا ماتم دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔" طرطوش حسب معمول قہقہے لگانے لگا۔ جنات کے لئے عام انسانوں کی طرح مسکرانا اور ہنسنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انسان تو لبوں کی خفیف جنبش سے بھی مسکراہٹ اور خوشی کا تاثر دے سکتا ہے مگر جنات انسانی روپ میں ظاہر ہونے کے باوجود ایسی فطری مسکراہٹ کا اظہار نہیں کر سکتے۔ ان کی مسکراہٹ یا ہنسنا قہقہوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

"پھر کیا ہوا؟" باواجی نے اس کی باتوں میں دلچسپی ظاہر کی۔

"ہونا کیا تھا نہال شاہ! جن بدبخت چڑیلوں نے ماتم کرنا تھا وہ جانگلی وال کے پجاریوں کے ہتھے چڑھتے چڑھتے تو بچ گئیں لیکن بچنے کے باوجود وہ بری طرح گھائل ہو گئی تھیں۔ لہذا ہمارے شاہ کو یہ ماتم ملتوی کرنا پڑا"۔

چڑیلوں کا ماتم جنات کا ایک پسندیدہ جشن ہے۔ جس طرح انسانوں میں رقص و سرور کی محفلوں کے مختلف روپ اور اقسام ہوتی ہیں اسی طرح جنات کی دنیا میں بھی عیش و عشرت کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ چڑیلوں کا ماتم ایک ایسا رقص ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں بریک ڈانس یا اس طرز کے واہیات قسم کے رقص ہوتے ہیں۔

"مگر تم اس بات پر اتنے خوش کیوں ہو؟" باواجی نے طرطوش سے پوچھا۔

"میں اس لئے خوش ہوں کہ مجھے اس قسم کی واہیات پسند نہیں ہے۔ میں مسلمان جن ہوں۔ اس لئے ان فضولیات کو ناپسند کرتا ہوں۔ چونکہ اپنے شاہ کا درباری طبیب بھی ہوں۔ اس لئے مجھے شاہ سے ہمکلام ہونے کا بھی موقع ملتا ہے۔ شاہ نے جب اس خواہش کا اظہار کیا تو اس وقت اس کی طبعیت خراب تھی۔ میں نے اسے آرام کا مشورہ دیا تھا۔ مگر اس نے آرام کرنے کے بجائے چڑیلوں کے ماتم کی خواہش ظاہر کر دیں۔ میں نے اسے بہت منع کیا مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔ لیکن قدرت کی طرف سے یہ ماتم برپا ہونے سے رہ گیا"۔ طرطوش نے اپنی خوشی کی وجہ بتاتے ہوئے کہا:

"طرطوش! ایک بات تو بتائو۔" باواجی نے پوچھا۔ "تمہاری دنیا میں جب ایسے جشن منائے جاتے ہیں تو اس کی آوازیں ہمارے کانوں تک کیوں نہیں آتیں"۔

"ہم تمہاری آبادیوں کے قریب رہ کر ہی یہ جشن مناتے ہیں مگر یہ قدرت کا کمال ہے کہ اس نے ہماری اور تمہاری دنیا کے درمیان ایک غیر مرئی پردہ حائل کر رکھا ہے۔ یہ پردہ علم ربانی کے زور سے بند کیا گیا ہے۔" طرطوش بتانے لگا۔ "نہال شاہ جی! اللہ پاک نے ساری دنیا کو علوم سے باندھ رکھا ہے۔ زمین کی ساتویں تہہ سے لے کر آسمان کی ساتویں منزل تک جو کچھ بھی ہے سب علم سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دنیا جو نباتات' جمادات' حیوانات سے بھی بھری ہے' ہر ایک کا علم الگ الگ ہے۔ جس پردے کو بھی کھولنا چاہو گے اس کا علم حاصل کرو اور اسے کھول لو... ہمارے اور تمہارے درمیان جو پردہ ہے اسے کھولنا کون سا مشکل ہے۔ تم انسان تو اللہ کے خلیفہ ہو۔ اس روح عظیم نے اپنی روح کا کچھ حصہ تم مٹی کے پتلوں کے اندر ڈال رکھا ہے۔ اسی لئے تو تم اشرف المخلوقات ہو۔ تمہارے لئے کسی بھی چیز کا علم جاننا کونسا مشکل ہے۔ لیکن جہاں تک ہماری دنیا کے ہنگاموں کا تعلق ہے تو میں تمہیں یہ بات بتادوں کہ بعض اوقات ان ہنگاموں اور بھوت پریت اور جنات کی آوازیں شور شرابہ تم لوگوں تک بھی پہنچ جاتا ہے' لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب یہ مخلوق اپنی حدود قیود سے باہر آتی ہے۔"

"مجھے یہ بتائو کہ تمہارے ہاں جو قبائل ہیں ان میں بھی لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں؟"

"بہت زیادہ جھگڑے ہوتے ہیں۔" طرطوش نے بتایا۔ "جنات ساری دنیا میں اسی طرح پھیلے ہوئے ہیں جس طرح انسان... ان کے قبائل مذاہب اور بولیاں بھی الگ الگ ہیں البتہ عبرانی اور سامی دو زبانیں ایسی ہیں جنہیں جنات بآسانی بول لیتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ان کی مادری زبانیں ہیں۔ ویسے یہ جس خطے میں ہوں گے اس کی بھی زبانیں بول سکتے ہیں۔ لیکن ہر جن کے لئے عبرانی اور سامی زبان پڑھنا بہت ضروری ہے۔ مسلمان جنات تو عربی بھی بولتے ہیں خاص طور پر وہ جنات جو قرآن پاک حفظ کرتے ہیں وہ اس زبان کے بہت بڑے عالم ہوتے ہیں"۔

اس روز باواجی نے طرطوش سے جنات کی نفسیات اور ان کی تہذیب و تمدن کے بارے میں بہت سے سوالات کئے۔ طرطوش نے ان سب کے لئے بڑی تفصیل کے ساتھ جواب دیئے تھے۔ جب اس کی حاضری کا وقت پورا ہونے والا تھا تو باواجی نے اسے کہا: "طرطوش جانے سے پہلے ایک پھیرا جانگلی وال کا بھی لگا آئو"۔

طرطوش باواجی کی بات سمجھ گیا تھا۔ چند ہی لمحے بعد وہ جانگلی وال کی خبریں لے کر حاضر ہو گیا۔

"نہال شاہ! پجاری تو واپس جا چکے ہیں مگر بھینٹ چڑھانے کے لئے جو مسلمان لڑکیاں ساتھ لائے تھے وہ دیوانی ہو چکی ہیں۔ وہ انہیں جانگلی وال میں ہی چھوڑ گئے ہیں۔"۔

باواجی نے یہ خبر سنتے ہی کہا: "ٹھیک ہے۔ تم مجھے اس جگہ کی نشاندہی کر دو' میں ان کا علاج کر کے انہیں تندرست کر دوں گا۔"

طرطوش نے باواجی کو اس جگہ کی تفصیل سمجھا دی جہاں وہ لڑکیاں بند تھیں۔ باواجی نے اس وقت حویلی کے دو نوکر ساتھ لئے اور گھوڑی پر سوار ہو کر جانگلی

وال پہنچ گئے۔ جانگلی وال کے ہندوئوں کو جونہی باواجی کی آمد کا پتہ چلا وہ ان کے سواگت کے لئے گائوں سے باہر نکل آئے۔ وہ نمولیاں کے بڑے زمیندار نہال شاہ کو اپنے درمیان دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ اس سے قبل باواجی صرف ایک بار ہی جانگلی وال آئے تھے۔ وہ بھی اس وقت جب ان کے والد ابھی زندہ تھے۔

جانگلی وال کے مکینوں کو یہ بات معلوم تھی کہ نہال شاہ ہندو عاملوں اور پنڈتوں کے خلاف ہو چکے ہیں۔ انہیں یہ سن گن بھی ہو گئی تھی کہ پچھلی رات ان کے گائوں میں کالے پجاری چلے کاٹنے آئے تھے لیکن آندھی اور طوفان کی وجہ سے وہ بھاگ گئے۔ اصل صورتحال سے وہ بے خبر تھے۔

گائوں کے مکھیا دھرم داس کو جب باواجی نے بتایا کہ پچھلی رات کالے پجاریوں نے یہاں چلے کاٹے اور دیوی دیوتائوں کو خوش کرنے کے لئے مسلمان لڑکیوں کو بھینٹ چڑھانے کا منصوبہ بنایا تھا تو وہ پریشان ہو گیا۔ وہ باواجی کے پائوں چھو کر بولا: "چودھری صاحب! بھگوان کی سوگند میں نہیں جانتا کہ وہ کس مقصد کے لئے آئے تھے۔ مجھے تو بس یہ معلوم تھا کہ وہ اس رات پراتھنا کرنا چاہتے تھے۔"

"میں نے سنا ہے کہ گائوں کے نالے کے کنارے چڑیلوں کی پکھیاں آباد ہیں اس لئے کالے پجاری یہاں آتے ہیں اور انسانوں کی قربانیاں دیتے ہیں۔" باواجی نے اس سے سخت لہجے میں بات کی۔

"بھگوان کی سوگند میں نہیں جانتا کہ یہاں منش بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔" دھرم داس کپکپا کر بولا۔

"تو کیسا مکھیا ہے' تجھے اس بات کی خبر ہی نہیں۔" باواجی نے اسے ڈانٹا اور کہا۔ "چل آ میرے ساتھ' میں تجھے دکھاتا ہوں کہ کالے پجاری جن مسلمان لڑکیوں کو اپنے شیطان دیوتائوں پر قربان کرنے کے لئے یہاں لائے تھے وہ کس حال میں ہیں"۔

باواجی مکھیا کو ساتھ لے کر نالے کی طرف گئے وہاں ایک چھوٹی سی مندر نما عمارت تھی۔ دروازے پر کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ دھرم داس نے آگے بڑھ کر کنڈی توڑ دی اور باواجی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ مندر ایک ہی کمرے پر مشتمل تھا جس میں کالی کی ایک ہیبت ناک مورتی پڑی ہوئی تھی۔ پانچوں لڑکیاں مدہوش سی ہو کر فرش پر گری پڑی تھیں۔

"تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے دھرم داس!" باواجی نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "یہ ہماری بیٹیاں اور بہنیں ہیں جنہیں تمہارے دھرم داسوں نے اپنے دیوتائوں کی بھینٹ چڑھانا تھا۔"

دھرم داس کی آنکھیں شرم سے کالی دیوی کے قدموں میں گڑ گئیں۔

"تم لوگ بھی کس قدر معصوم ہو دھرم داس کہ تم نے کبھی سوچا ہے تمہیں مذہب کے نام پر جو کچھ سکھایا جاتا ہے وہ تمہارے مذہب کا حصہ نہیں ہے۔

تمہارے دھرم داس تو کہتے ہیں کہ کسی ملیچھ کا سایہ بھی تمہاری ان مقدس جگہوں پر پڑ جائے تو وہ پلید ہو جاتی ہیں مگر تمہارے یہ کالے پجاری پانچ معصوم مسلمان لڑکیوں کو دیوی دیوتاؤں پر قربان کرنا چاہتے تھے۔ دھرم داس یہ ضرور سوچنا کہ تمہارے کالے پجاری تمہارے دھرم کی خلاف ورزی کیوں کرتے ہیں۔ اگر اس کا جواب نہ مل سکے تو میرے پاس چلے آنا۔ پھر اس کا جواب میں تجھے دوں گا۔"

باواجی اپنے ملازموں کی مدد سے لڑکیوں کو لے کر واپس حویلی پہنچے تو پورا گاؤں حویلی میں امڈ آیا۔ وہاں آکر انہیں معلوم ہوا کہ ان میں سے تین لڑکیاں تو انہی کے گاؤں کی ہیں۔ باواجی نے دوپہر کو طرطوش کی حاضری دوبارہ لگائی اور اس کی مدد سے لڑکیوں کے لئے چند طبّی نسخے تجویز کئے۔ باواجی نے تین روز تک لڑکیوں کا علاج کیا۔ اس دوران انہیں حویلی میں ہی رکھا۔ تین روز بعد لڑکیوں کی دیوانگی ختم ہو گئی تو باواجی نے انہیں ان کے گھر والوں کے سپرد کیا۔ جو باقی دو لڑکیاں تھیں انہیں بھی خیریت سے ہوشیار پور پہنچا دیا۔ اس مقصد کے لئے باواجی خود ہوشیار پور گئے تاکہ لڑکیوں کے والدین کو ان کے بارے میں بدگمانی نہ ہو۔

گاؤں کی لڑکیوں نے باواجی کو یہ بتا دیا تھا کہ انہیں منصور خان نے حیلے بہانے سے گھروں سے نکالا اور اغوا کر کے جانگلی وال لے گیا تھا جہاں پنڈتوں کے ساتھ مل کر انہیں کوئی مشروب پلایا گیا تھا۔

منصور خان پھانس کی طرح باواجی کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ انہوں نے اس کی ماں کو اپنے پاس بلایا اور کہا: "چاچی تو منصورے کے کرتوت سن ہی چکی ہے اب بتا اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے"۔

"نہال شاہ پتر! اس بے دین اور کافر کو مار دے۔ جا میں نے تجھے اللہ نبیؐ کے واسطہ بخش دیا۔" چاچی نے بڑے حوصلے کے ساتھ کہا۔ "وہ میرا ایک پتر تھا مگر اس نے اب اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ دشمنی کر لی ہے۔ نہال شاہ پتر! خدا قسم اگر وہ تیرے ہاتھوں سے بچ گیا تو میں خود اس کے ٹوٹے کر دوں گی۔"۔

"نہیں چاچی! میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے ہاتھ اس کے گندے خون سے گندے ہو جائیں میں خود اس گندگی کو دور کروں گا۔" باواجی نے غصہ سے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "چاچی میرا علم مجھے انتقام لینے سے روک دیتا ہے۔ مگر میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی ذاتی دشمنی کو نظر انداز کر دوں گا مگر اللہ اور اس کے رسول پاکؐ کے دشمن کو نہیں چھوڑوں گا۔" پھر یہی ہوا۔ باواجی نے منصور خان کی تلاش کے لئے اپنے آدمی دوڑائے جو اسے ایک مہینہ تک تلاش کرتے رہے مگر وہ نہ ملا۔ پھر ایک روز انہوں نے اس کی ماں کو بلوایا اور اس سے کہا: "چاچی! میں نے منصور کو اپنے آدمیوں کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ نہیں ملا۔ اب میں اپنے علم کے زور پر اس کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ اس کام کے لئے تجھے میری مدد کرنی ہو گی"۔

"وہ کیا پتر؟" چاچی نے دریافت کیا۔

"تیرے پاس اس کا کوئی ایسا کپڑا ہو گا جو اس نے پہن کر اتارا ہو اور ابھی تک دھلا نہ ہو۔"

"میں نے اس کتے کے کپڑے اسی طرح رکھے ہوئے ہیں"۔ چاچی نے جواب دیا۔ "میں آج ہی تیرے پاس بھیج دیتی ہوں۔" چاچی نے تھوڑی دیر بعد منصور خان کا ایک پرانا کرتہ اور تہبند بھیج دیا۔

باواجی حویلی میں اپنے حجرے کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ انہوں نے طرطوش کو بلا کر منصور خان کے کپڑے دکھائے اور کہا: "طرطوش! اپنے شاگردوں کو ان کپڑوں کی خوشبو سونگھاؤ اور ان سے کہو کہ منصور خان کو تلاش کریں۔" طرطوش نے مستان اور دوسرے شاگردوں کو طلب کیا اور منصور خان کے استعمال شدہ کپڑے انہیں سونگھا دیئے۔

"مجھے آج شام تک یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ حرامی کہاں ہے؟"

طرطوش نے حسب وعدہ اسی روز باواجی کو مطلع کر دیا کہ منصور خان ہوشیار پور میں کالی کے بڑے مندر میں اپنے مہربانوں کے ساتھ موجود ہے۔ طرطوش نے باواجی کو ان پجاریوں کے بارے میں بھی بتا دیا کہ وہ ان کے خلاف کیا سازشیں کر رہے ہیں۔

"انشاءاللہ میں ان کی سازشیں ان پر ہی الٹ دوں گا"۔ باواجی جوش کے ساتھ اٹھے۔ انہوں نے انجیر کی شاخ اٹھائی اور کہنے لگے۔ "پہلے میں جانگلی وال کے نالے کو چڑیلوں سے صاف کر دوں' پھر ان کی خبر لیتا ہوں۔"

"میں ساتھ چلوں سرکار" طرطوش نے دریافت کیا۔

"آ سکتے ہو تو آ جائو... ورنہ کوئی مجبوری نہیں ہے" باواجی نے جواب دیا۔

بہر حال طرطوش بھی باواجی کے ساتھ ہو لیا جانگلی وال پہنچ کر انہوں نے دھرم داس کو طلب اور اسے اپنے ارادے سے باخبر کر دیا۔ وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا: "سرکار! یہ تو بہت ہی اچھا ہو گا۔ گائوں والوں کی زندگیاں عذاب بنی ہوئی ہیں۔ وہ ادھر نالے کی طرف آتے ہی نہیں ہیں۔ ادھر سے گزرنے والا ہر بندہ بیمار ہو جاتا ہے۔ ان چڑیلوں نے تو جانور بھی نہیں چھوڑے۔ پچھلے دنوں میری ایک بھینس نالے میں سے گزر رہی تھی کہ اس کے تھنوں میں سے خون ٹپکنے لگا۔ یہ تو بھگوان کا کرم ہوا کہ ادھر سے ایک سادھو جی مہاراج گزرے۔ میں نے ان کی سیوا کی تو انہوں نے جھاڑ پونچھ کر کے بھینس کو بھلا چنگا کر دیا۔ میری آپ سے یہی بنتی ہے کہ اس نالے کو چڑیلوں سے صاف کر دیں۔"

"آج کی رات ہم یہاں ٹھہریں گے' رات کو ان چڑیلوں کا صفایا کیا جائے گا۔" باواجی نے دھرم داس کو بتایا اور پھر وہ اس کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے۔

ہانڈی وار

یہ سہ پہر کا وقت تھا' باواجی نے ابھی دھرم داس کے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک مٹی کی ایک ہانڈی ان کے پاس آکر گری اور گرتے ہی دھماکے سے پھٹ گئی اور اس سے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے نکل کر صحن میں دور دور تک جا گرے۔ باواجی ایک دم رک گئے۔ دھرم داس جو باواجی کے دائیں جانب کھڑا تھا اپنی جگہ پر سن ہو کر رہ گیا۔

"سرکار! یہ کیا ہوا ہے اور یہ ماس۔" دھرم داس گھبراہٹ کے ساتھ بولا۔

"جس نے بھی ہانڈی کا وار کیا ہے۔ دھرم داس وہ ابھی سامنے آجائے گا۔" باواجی نے انجیر کی شاخ اس ہانڈی کی طرف بڑھادی۔

اسی لمحہ فضا میں ایک اور کالی ہانڈی نمودار ہوئی اور باواجی کے پاس آکر گرنے لگی۔ لیکن باواجی ے زیر لب کچھ پڑھ کر انجیر کی شاخ پر پھونک دیا اور اسے ہانڈی کی طرف کر دیا۔ ہانڈی یک لخت فضا میں یوں معلق ہو گئی جیسے اسے رکنے کے لئے کوئی سہارا مل گیا ہو۔

"دھرم داس! اب دیکھنا تماشا' میں یہ ہانڈی بھیجنے والے کو سود کے ساتھ واپس بھیج رہا ہوں"۔ یہ کہہ کر باواجی نے ہانڈی پر پھونک ماری اور جلال کے عالم میں بولے: "طرطوش یہ ہانڈی واپس کر دے۔" حکم ملتے ہی ہانڈی غائب ہو گئی۔ اس دوران باواجی نے انجیر کی چھڑی کی مدد سے ٹوٹی پڑی ہانڈی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس جگہ کو صاف کر دو۔"

دھرم داس بوکھلا کر بولا۔ "سرکار! ممم... ممم میں کیسے کروں"۔

"تمہیں نہیں کہہ رہا دھرم داس..." باواجی اس لمحے بے اختیار بولے تھے۔ باواجی نے جنہیں یہ حکم دیا تھا انہوں نے چند لمحے میں ہی صحن کو صاف کر دیا تھا۔

"سرکار! یہ کیسی ہانڈیاں تھیں..." دھرم داس باواجی کو صحن پر بٹھا کر پوچھنے لگا۔

"یہ جادو ٹونہ کا ایک خاص ہتھیار ہے دھرم داس۔" باواجی بتانے لگے۔ "کالے علم کے پجاری جب کسی کو مارنا چاہتے ہیں تو اس پر ہانڈی کا وار کرتے ہیں۔"

"مگر اس میں سے ماس نکلا ہے سرکار۔"

"ہو گا کسی بے چارے جانور کا گوشت..." باواجی افسوس کا اظہار کرنے لگے۔ "دھرم داس! تیرے مذہب کا پرچار کرنے والے کالے پجاری ہانڈی کے وار کر کے انسانوں کا قتل عام کرتے پھر رہے ہیں۔ لعنت ہو خدا کے ان دشمنوں پر... یہ کالے پجاری انسانی گوشت کے رسیا ہوتے ہیں اسی لئے کوئی بھی عمل کرتے ہوئے وہ شیطان کے نام پر گوشت کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ ہانڈی میں اور بھی بہت سی گندی چیزیں ملاتے ہیں۔ جسے مارنا ہو اس کا کوئی ایک بال یا کپڑا وغیرہ اس ہانڈی میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر عملیات کے ذریعے اس ہانڈی کو حکم دیتے ہیں کہ جاؤ اور جا کر اس شخص کو قتل کر دو۔ ہزاروں میل دور بیٹھا انسان بھی ہانڈی کے وار سے نہیں بچتا۔ مگر اللہ جسے چاہے زندہ رکھ سکتا ہے۔"

باواجی اور دھرم داس صحن میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے جب ایک بار پھر ان پر ہانڈی کا وار ہو گیا لیکن اس بار ہانڈی صحن میں گر کر پھٹنے کے بجائے فضا میں ہی پھٹ گئی اور اس میں سے گندا خون پھوار کی صورت میں پورے صحن میں برس گیا۔ باواجی اور دھرم داس پر بھی اس کے چھینٹے پڑے تھے۔

"طرطوش"۔ باواجی نے یک لخت چارپائی سے اٹھے اور دھاڑے۔ مگر ان کے بلاوے پر کوئی نہ آیا تو باواجی کا جلال بڑھ گیا۔ وہ چھڑی کو ہاتھ میں پکڑ کر فضا میں لہرانے لگے پھر تیزی کے ساتھ پورے صحن کا چکر کاٹ کر چھڑی کی مدد سے حصار باندھ دیا اور واپس آ کر بولے۔ "دھرم داس تیرے کپڑے بھی پلید ہو گئے ہیں اور میری طہارت بھی ختم ہو گئی مجھے جلدی سے غسل کرنے کے لئے پانی مہیا کر دے"۔

دھرم داس نے جلدی سے غسل کا اہتمام کیا اور باواجی نے غسل کے دوران اپنے کپڑے بھی دھو لئے اور پھر گیلے کپڑے پہن کر باہر آ گئے۔ لیکن صحن میں نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھے۔ دھرم داس اپنی پتنی اور بچوں کے ساتھ صحن میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

باواجی تیزی سے ان کی طرف بڑھے اور کچھ پڑھنے کے بعد ان پر پھونک ماری تو ان کا تڑپنا بند ہو گیا۔

"سرکار! ہمار آخری سمے آ گیا ہے کیا؟ دھرم داس نڈھال سا ہو کر پوچھنے لگا۔ "میری پتنی اور میرے بچوں کا کیا دوش ہے سرکار! میں نے تو آج تک کسی کا برا نہیں چاہا۔"

"اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا دھرم داس! شکر کر میں نے ابھی صحن کے گرد حصار قائم کر دیا ہے ورنہ ہانڈی کا یہ وار بہت جلدی اپنا اثر دکھاتا۔ اب تم لوگوں کو کچھ نہیں ہو گا"۔

دھرم داس کے علاوہ اس کی پتنی اور بچوں کے کپڑے بھی گندے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ باواجی نے ان پر دم کیا پھر انجیر کی چھڑی سے ان کے جسموں کو چھونے کے بعد کہا۔ "جاؤ اور باری باری نہا کر کپڑے بدل کر میرے پاس آ جاؤ۔..."

دھرم داس کی پتنی بچوں کو لے کر اندر چلی گئی اور دھرم داس باواجی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ باواجی نے اسے اٹھایا اور کہنے لگے۔ "دھرم داس! تو بھی نہا لے... اس دوران میں ہانڈی بھیجنے والوں سے حساب کتاب کر لوں"۔ دھرم داس نہانے چلا گیا اور باواجی صحن کے درمیان میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ وہ آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھتے رہے البتہ ساتھ ساتھ ہی چھڑی پر پھونکیں بھی مارتے جاتے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں اور طرطوش کو بلانے لگے۔ اس بار وہ پہلی ہی پکار پر ظاہر ہو گا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں نے آپ کی آوازیں سنی تھیں نہال شاہ جی۔ مگر اس وقت میں واپس پلٹ آتا تو آپ کا بہت زیادہ نقصان ہو جاتا۔" طرطوش بتانے لگا۔ "میں ہانڈی کے تعاقب میں ہوشیار پور کے اس کالی کے مندر میں جا پہنچا تھا جہاں آپ کی جان کے دشمن بیٹھے ہیں۔ ہانڈی تو جاتے ہی کالی کے پجاریوں کے سر پر گری تھی مگر ان کا بڑا پجاری رگھومل اس کے وار سے بچ گیا تھا۔ اس نے جھٹ سے دوسری ہانڈیوں کو حکم دیا اور وہ آپ پر حملہ کرنے کے لئے چلی گئیں۔ میں نے ان ہانڈیوں کو روکنا چاہا اور آپ کے سیکھائے علوم کی مدد سے ہانڈیوں پھر بھی میری پکڑ سے نکل گئی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ کالے پجاری شیطان کے پجاری ہیں۔ ان کے پاس کالے جادو کی شیطانی قوت ہے۔ رگھومل کو فوراً اندازہ ہو گیا تھا کہ ہانڈیوں کو واپس پلٹانے والے مندر کے گرد اکٹھے ہو چکے ہیں لہذا اس نے اپنے منتر جنتر شروع کر دیئے جس سے میرے کچھ کمزور شاگرد گھائل ہو گئے لیکن میں نے عمل پڑھ کر ان پر پھونک مار دی اور انہیں واپس بھیج دیا۔ پھر تن تنہا آپ کے دشمنوں کی ہانڈیاں توڑتا رہا ہوں۔ اس وقت مجھے آپ کی آواز سنائی تو دی تھی مگر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر آ جاتا تو یہاں قیامت برپا ہو جاتی۔ رگھومل نے ہزاروں ہانڈیوں تیار کی ہوئی تھیں۔ میں نے پہلی ہانڈی کالے پجاریوں پر پلٹی تھی۔ اس سے وہ اندھے ہو گئے تھے۔ منصور خان ہانڈی کا وار سہ ہی نہ سکا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ رگھومل نے کسی بھی پجاری کو بچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ میرے مقابلہ پر ڈٹا رہا۔ جب اس کے سارے حربے ناکام ہو گئے تو پھر اس نے اپنی حفاظت کے لئے لوہے کا ایک چھرا پکڑ لیا اور اس کی مدد سے اپنے گرد حصار باندھ کر بیٹھ گیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جب کوئی عامل لوہے کی معمولی سی چھری بھی ہاتھ میں پکڑے تو ہم اس پر حملہ نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں ہماری جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ لہذا اب میں واپس آ گیا ہوں۔

باواجی نے طرطوش کا شکریہ ادا کیا اور بولے: "اب تم بھی واپس جاؤ اور اپنے شاگردوں کی خبر لو۔ اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔"

"آپ کو اکیلے چھوڑ کر میں کیسے واپس جا سکتا ہوں۔" طرطوش بولا۔

"مجھے کچھ نہیں ہو گا۔" باواجی نے اسے یقین دلایا۔ "ان چڑیلوں کے لئے ایک آتوم ہی کافی ہے۔"

"آتوم... نہال شاہ جی یہ کون ہے۔ اگرچہ میں آپ کی زندگی کے بہت سے رازوں سے واقف ہوں لیکن پھر بھی میں نہیں جانتا آتوم کون ہے۔"

"آتوم بڑی طاقت ور چیز ہے طرطوش۔ ہے تو وہ تمہارا ہی ہم جنس مگر ہے بڑی عجیب چیز..." باواجی بتانے لگے۔ "تمہیں یاد ہو گا کہ میں بلاداد کی پہاڑیوں

میں جا کر عبادت کرتا ہوں۔ یہ کئی سال پہلے کی بات ہے' آتوم مجھے وہیں پر ملا تھا۔ اس روز موسم بہت جاندار تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے لیکن سورج بھی سر پر چمک رہا تھا۔ میں وظائف ختم کر کے قیلولہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا جب ایک دس سال کا بچہ پہاڑی راستے کے ذریعے مجھ تک پہنچ گیا۔ گول مٹول سا معصوم سا یہ بچہ مجھے بڑا پیارا لگا۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "بیٹے تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

وہ بولا "میں آپ سے ملنے آیا ہوں باوا جی سرکار۔" میں حیران ہو گیا کہ اس کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔

"بولو کیا کام ہے؟" میں نے دریافت کیا تو کہنے لگا۔ "میں ایک مدت سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں' میں آپ کے پاس رہ کر علم سیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ کو اپنے سے الگ نہ کیجئے گا۔"

خیر میں نے اس سے زیادہ سوال جواب نہ کئے اور اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ میرے ساتھ اللہ کی عبادت میں مصروف رہتا۔ لیکن جب میں نے کوئی چلہ کاٹنا ہوتا تو اسے اس چھوٹی سی کٹیا میں چھوڑ آتا تھا جو میں نے پہاڑی کے اوپر ہی بنائی تھی۔

ایک روز وہ بچہ مجھ سے کہنے لگا۔ "باوا جی سرکار! آپ مجھے کوئی خدمت کے لئے کیوں نہیں کہتے۔"

"بیٹے جب ضرورت ہو گی۔ کہہ دوں گا۔" میں نے اسے پیار کیا تو کہنے لگا۔ "میں آپ کے لئے مسواک لے کر آئوں۔"

"ہاں لے آئو..." وہ جانتا تھا کہ مجھے کیکر کی تازہ مسواک بہت پسند ہے۔ وہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے جب واپس آیا تو اس کے کاندھے پر کیکر کا ایک چھوٹا سا درخت رکھا ہوا تھا۔ میں حیران ہو گیا۔ "میں نے تم سے مسواک لانے کے لئے کہا تھا۔ تم درخت ہی اٹھا لائے"۔

"میں نے سوچا سرکار کہ نہ جانے آپ کو مسواک پسند نہ آئے لہذا میں پورا درخت ہی اٹھا لایا ہوں۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ "آپ اپنی پسند کی مسواک کاٹ لیں میں اسے دوبارہ اسی جگہ چھوڑ آئوں گا۔"

"تم کون ہو؟" میں نے اس عجیب و غریب بچے سے پوچھا۔ میں جان گیا تھا کہ یہ بچہ کوئی عام چیز نہیں ہے۔

"میں انسان ہی ہوں باوا جی سرکار۔" اس نے کیکر کا درخت کندھے سے نیچے گرا کر جواب دیا۔

"نہیں تم انسان نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "بہتر ہے کہ تم خود بتا دو ورنہ میں نے از خود پوچھنا شروع کیا تو یہ بات اچھی نہ ہو گی۔"

اس بار اس نے سچ سچ کہہ دیا۔ "میرا نام آتوم لا ہے۔ میں چین کی پہاڑیوں میں رہتا ہوں۔ میرا قبیلہ بوغزان ہے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ قبیلہ جنات میں چنگیز خان کے قبیلے کی طرح مشہور ہے۔ میں بوغزان کے شاہ ابوزابوغزان کا محافظ ہوں۔ میں اکثر ان پہاڑوں سے گزر کر دوسرے قبائل کے پاس جاتا رہتا

ہوں۔ لیکن برسوں سے آپ کو اس پہاڑی پر ریاضت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ کئی بار آپ کے پاس آیا بھی ہوں مگر آپ اپنے آپ میں غرق ہوتے تھے۔ میں آپ سے دوستی کر کے آپ سے کچھ علوم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بالآخر میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بچہ بن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائوں۔" یہ ہے آتوم کی کہانی۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق اسے علوم سکھائے۔ اسے قرآن پاک بھی پڑھایا۔ حکمت بھی سکھائی ہے۔ ابھی نوجوان ہے۔ عمر پانچ سو سال ہے۔ بڑی ہی دلچسپ اور طاقتور چیز ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ بوغزان کے شاہ کے ذاتی محافظ انتہائی دلیر جنات میں سے مقرر کئے جاتے ہیں آتوم ایک بہادر اور غیر معمولی طاقت کا حامل جن تھا مگر مجھ سے علوم سیکھنے کے بعد اس کی حیثیت اور بڑھ گئی ہے اور اب وہ اپنے شاہ کے حفاظتی دستے کا سردار ہے۔"

"میری اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔" طرطوش کہنے لگا۔ "آپ حیران تو ہوں گے کہ ایک جن ہونے کے باوجود آپ سے مدد طلب کر رہا ہوں۔ اپنے جن بھائی سے ملنا میرے لئے کیسے دشوار ہو گا' مگر حقیقت یہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بوغزان والے انتہائی غصیلے اور گھمنڈی قسم کے جنات ہیں۔ وہ ہمارے قبائل کو معمولی سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جس خطے میں آباد ہیں وہاں ان کی نسلیں لاکھوں سال سے آباد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جنات کے اصل وارث وہی ہیں۔ اس لئے وہ دوسروں کو کمتر سمجھتے ہیں۔ خیر ان کے سمجھنے سے کیا ہو سکتا ہے اگر یہ ملاقات ہو جائے تو میں آپ کا ممنون رہوں گا۔"

"میں جلد ہی تمہاری ملاقات کرا دوں گا۔ آج تو ہمیں اور بہت سے کام کرنے ہیں....." یہ کہہ کر باواجی نے طرطوش کو جانے کے لئے کہا اور پھر خود جانگلی وال کے نالے کے کنارے پر جا کر چوکی لگالی۔

رات کے وقت انہوں نے آتوم کو طلب کیا اور اس سے چند جڑی بوٹیاں منگوائیں۔ باواجی نے ان تمام جڑی بوٹیوں کو انگیٹھی میں رکھ کر سلگا دیا اور اپنے گرد حفاظتی حصار کر کے وظائف پڑھنے لگے۔ اس دوران آتوم سایہ بن کر باواجی کے حصار کے باہر کھڑا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد چڑیلوں کی پکھیوں میں آگ لگ گئی اور وہ جل جل کر مرنے لگیں۔ وہ اپنے بچائو کے لئے بہت ہاتھ پائوں مار رہی تھیں۔ لیکن آتوم انہیں پکڑ پکڑ کر انگیٹھی میں گراتا جاتا۔ جونہی کوئی چڑیل انگیٹھی میں گرتی ایک شعلہ سا ابھرتا اور وہ فلک شگاف چیخ مار کر بجھ جاتا۔ چڑیلوں کی ایک پکھی نے باواجی کا حصار توڑنے کی کوشش بھی کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

رات کے آخری پہر میں باواجی اس کام سے فارغ ہو گئے اور اسی وقت انہوں نے آتوم کو واپس بھیج دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر نمولیاں کی طرف چل دیئے مگر ابھی کچھ فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ انہیں ایک کام یاد آ گیا۔ انہوں نے گھوڑی کا رخ مال پور کی طرف کر دیا۔ مال پور نمولیاں سے دو تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہ بڑا قصبہ تھا۔ یہاں پر تھانہ بھی تھا۔ نمولیاں اور گردو پیش کے دوسرے گائوں اسی تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ باواجی مال پور کے تھانیدار سے ملنا چاہتے تھے۔ اب جبکہ انہوں نے گائوں واپس آ کر بڑے زمیندار کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لی تھیں تو ایسے میں ان کا اپنے تھانے کے ساتھ تعلق اور رابطہ انتہائی ضروری بلکہ قانونی ہوتا تھا۔

مال پور کے سیوک

مال پور سے اوپر اونا کے پہاڑ شروع ہو جاتے ہیں۔ انہیں اونا کے پہاڑی راستوں سے گزر کر مال پور جانا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ چاند آسمان پر ٹھہرا ہوا۔ دودھیا روشنی میں کالے پہاڑ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ باوا جی جب پہاڑی راستے کے درمیان تک پہنچے تو انہیں ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

"اوئے گھوڑی والے جوان ادھر ہی رک جا... بھاگا تو گولی مار دوگا۔"

باوا جی نے گھوڑی کی بھاگ کھینچ کر اسے روک لیا۔

باوا جی نے حکم کی تعمیل کی اور اس کے سامنے آکر پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ مجھے کیوں روکا ہے۔"

باوا جی کو بندوق کی نوک پر گھوڑے سے نیچے اتارنے والے نوجوان کا حلیہ بڑا ہی عجیب تھا۔ اس نے لنگی پہنی ہوئی تھی۔ سر کے بال بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے تھے۔ لمبی اور بھاری داڑھی مونچھوں نے اس کا دہانہ چھپا رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکتی تھی۔ وہ باوا جی کی بات سن کر عجیب انداز میں بولا۔ "کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں نے تجھے کیوں روکا ہے۔"

"نہیں۔ میں نہیں جانتا۔" باوا جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"پردیسی ہے کیا۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ نمولیاں کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام چوہدری نہال شاہ ہے۔" باوا جی کا نام سنتے ہی اس نے بندوق کا رخ نیچے کر دیا اور دو قدم آگے بڑھ کر بولا۔ "سرکار آپ۔"

"تم کون ہو۔" باوا جی نے دریافت کیا۔

میں گھبر سنگھ ڈاکو کا ساتھی ہوں سرکار! میرا نام بلدیو سنگھ ہے۔ میں اور میرے ساتھی اس راستے پر پہرہ دیتے ہیں۔ ہم نے آپ کا نام اور آپ کے چمتکاروں کی بڑی داستانیں سن رکھی ہیں"۔ اس دوران بلدیو سنگھ کے دوسرے ساتھی بھی آگئے۔

"یہ مہان رشی نہال جی سرکار ہیں۔" بلدیو سنگھ اپنے ساتھیوں سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ وہی سرکار ہیں جن کا ذکر سادھو نے بھی کیا تھا اور

ان کے گائوں والے بھی جن کے چمتکاروں کی داستانیں سناتے ہیں۔"

وہ سب باواجی کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنے لگے۔

باواجی کو ان سے کسی قسم کا خوف تو نہیں تھا البتہ پہلے انہیں یہ پریشانی ضرور لاحق ہوئی تھی کہ شاید یہ ڈاکو ان کے ساتھ کیا سلوک کریں' مگر اب انہیں اطمینان ہو چکا تھا۔

"میں اب واپس چلتا ہوں..."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سرکار! ہمیں سیوا کا موقع تو دیں۔ ہمارا سردار آپ سے مل کر بہت خوش ہو گا"۔ بلدیو سنگھ ان کی گھوڑی کی باگ تھام کر بولا۔ "آپ گھوڑی پر سوار ہو جائیں۔" پھر وہ باواجی کو اپنے ساتھ لے کر گنجان پہاڑوں کے اندر داخل ہو گیا اور ایک دشوار گزار راستے سے گزر کر ایک غار میں لے آیا۔ وہاں مشعلیں جل رہی تھیں جس سے راستہ قدرے دکھائی دیتا تھا۔ غار کے دہانے کے پاس ہی ڈاکو پہرہ دے رہے تھے۔

بلدیو سنگھ نے غار کے اندر جا کر گھبر سنگھ کو جگایا۔ وہ دارو پی کر سویا ہوا تھا مگر جونہی اسے معلوم ہوا کہ باواجی آتے ہیں تو لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا اور عقیدت کے ساتھ ان کے پائوں چھو کر کہنے لگا۔ "سرکار! ہم تو آپ کے درشن کو ترس رہے تھے۔ بھگوان کی دیا سے آپ خود ہی آ گئے۔"

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ باواجی نہال شاہ نمولیاں جیسے بڑے گائوں کے زمیندار ہونے کے باوجود اس بات سے آگاہ نہیں تھے کہ اونا کی پہاڑیاں ڈاکوئوں کی آماجگاہ بن چکی ہیں' اگرچہ اس دور میں ابھی ڈاکوئوں نے مار دھاڑ کا بازار گرم نہیں کیا تھا لیکن وہ کسی کو بھی انفرادی طور پر لوٹنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ڈاکوئوں کے خوف کی وجہ سے لوگ شام ڈھلے ادھر سے گزرنا چھوڑ چکے تھے۔ یہ ڈاکو صبح اور دوپہر کے وقت بھی لوگوں کو لوٹ لیتے تھے۔ اس دور میں ابھی بستیاں ڈاکوئوں کی دستبرد سے بچی ہوئی تھیں۔

گھبر سنگھ نے باواجی کی سیوا میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نے باواجی سے کہا کہ وہ اس کے حق میں دعا کریں۔ باواجی نے اسے یہ نصیحت کی کہ وہ ایک شریف انسان بن جائے اور لوگوں کو لوٹنا چھوڑ دے۔ یہ سن کر گھبر سنگھ کہنے لگا:

"سرکار! اب بندوق اور گولی میں ہی ہماری زندگی ہے۔ میں اسے چھوڑ بھی دوں تو یہ دنیا تب بھی مجھے جینے نہیں دے گی۔ اس لئے میں بندوق کے ساتھ ہی مرنا چاہتا ہوں۔" وہ بتانے لگا۔ "سرکار! مجھے اونچی ذات کے ٹھاکروں اور پولیس نے ڈاکو بنایا ہے۔ میرے یہ ساتھی بھی پولیس اور ٹھاکروں کے ستائے ہوئے ہیں۔ جب تک ہم اپنے دشمنوں کو مار نہیں دیتے' ہم کوئی اور کام کرنے کا سوچ نہیں سکتے۔"

گھبر سنگھ نے بتایا کہ مال پور کے تھانیدار نے گھبر سنگھ کی نوجوان بہن پاروتی اور اس کے بوڑھے باپ کو مال پور کے ٹھاکروں کے کہنے پر تھانے میں بند کر دیا

اور الزام لگایا کہ انہوں نے ٹھاکر کی حویلی میں چوری کی ہے۔ان دنوں گھبر سنگھ ہوشیار پور میں پانڈی کا کام کرتا تھا۔اسے جب معلوم ہوا تو مال پور کے تھانے گیا' تھانے دار نے اسے بھی دھر لیا اور خوب زدوکوب کیا۔وہیں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو مال پور ٹھاکروں کا ستایا ہوا تھا انہوں نے اس کی بہن کی عزت لوٹنے کے بعد اسے زندہ آگ میں جلا دیا اور الزام اس پر لگا دیا کہ اس نے اپنی بہن کو جان بوجھ کر آگ میں جلایا ہے۔

گھبر سنگھ کو اس کے باپ کے ساتھ تھانے میں بند کر دیا گیا تھا۔اس کا باپ جو پولیس کی مار کھانے کے بعد ادھ موا ہو چکا تھا بیٹے کو دیکھتے ہی تڑپنے لگا۔اس نے گبھر سنگھ کو ٹھاکروں کے مظالم کی داستان سنائی اور کہا:"گھبر پتر ! ٹھاکر رنجیت نے تیری بہن پاروتی کی عزت لوٹنی چاہی تھی مگر میری شیرنی دھی نے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا اور اس کے پنجے سے نکل بھاگی تھی۔اسی شام پولیس نے اسے اور مجھے پکڑ کر تھانے میں بند کر دیا اور ہم دونوں کو خوب مارا۔تھانے دار نے اس شام پاروتی کو حوالات سے نکالا اور اسے گھسیٹتا ہوا کہیں لے گیا۔پھر مجھے اس کی موت کی خبر سنا دی۔اوئے گھبر سنگھ...مجھے وچن دے کہ تو حوالات کی سلاخیں توڑ کر نکل جائے گا اور اس تھانیدار اور ٹھاکروں کا خون کر کے اپنی بہن کی عزت کا بدلہ لے گا۔"

گھبر سنگھ نے اپنے مرتے ہوئے باپ کے سر کی سوگند کھائی اور کہا۔"باپو ! جب تک تیرا یہ پانڈی پتر زندہ ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت حوالات میں بند نہیں کر سکتی۔"گھبر سنگھ کے باپ کی روح جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھی۔اسے اب قرار آ گیا تھا اور وہ اگلے جہاں سدھار گیا۔پولیس نے اس کی لاش کا لاوارثوں کی طرح کریا کرم کیا۔گھبر سنگھ روتا ہی رہا اور التجائیں کرتا رہا کہ ظالموں اسے اس کی بہن اور باپ کے کریا کرم کے لئے کچھ دیر کے لئے باہر نکال دو مگر تھانیدار نے اس کی ایک نہ سنی۔

اتفاق سے اس روز تھانے میں نفری کم تھی۔تھانیدار ہوشیار پور گیا تھا اور باقی سپاہی بلاداد گئے ہوئے تھے۔گھبر سنگھ حوالات سے فرار ہو گیا۔اس نے اپنے ساتھ اس مظلوم کو بھی لے لیا تھا جس کی بہن کو ٹھاکروں نے آگ لگا کر مار دیا تھا۔اس کا نام جیون داس تھا اس نے گھبر سنگھ کو اونا کی پہاڑیوں میں پناہ لینے کا مشورہ دیا اور بتایا کہ وہاں مان سنگھ ڈاکو رہتا ہے۔

مان سنگھ ڈاکو نے گھبر سنگھ کی کتھا سن کر اس کی مدد کا وعدہ کیا اور کچھ عرصہ بعد جب پولیس گھبر سنگھ کو تلاش کرنے کے بعد تھک چکی تھی اس نے ٹھاکر رنجیت کے بڑے بیٹے کو قتل کر دیا اور پھر ایک مہینے بعد اس نے مال پور کے تھانیدار کو بھی قتل کر دیا۔اس دور میں کسی بڑے آدمی کو قتل کرنا آسان کام نہیں کیا۔ان دو ظالموں کے قتل نے مان سنگھ اور گھبر سنگھ ڈاکو کی دہشت بڑھا دی۔چند سال پہلے مان سنگھ پولیس مقابلے میں مارا گیا تو گھبر سنگھ ڈاکوؤں کا سرغنہ بن گیا اور اس نے ٹھاکر رنجیب سنگھ کی حویلی کو اس وقت آگ لگا دی جب حویلی کے سارے مکین سوئے پڑے تھے۔ٹھاکر رنجیب سنگھ اور اس کے سارے بال بچے سب زندہ جل گئے۔جو لوگ حویلی سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے گھبر سنگھ کے ساتھی انہیں دوبارہ آگ میں پھینک دیتے۔گھبر سنگھ کے دل کو قرار تو آ گیا تھا مگر اب اس کی وحشت اور بڑھ گئی تھی۔اس نے ڈاکے ڈالنا شروع کر دیئے تھے مگر ان کا دائرہ کار صرف مال پور تک ہی محدود تھا' البتہ اونا کی پہاڑیوں میں سے گزرنے والے مسافروں کو ضرور لوٹ لیتا تھا۔

باواجی گھبر سنگھ کی سیوا کے بعد گائوں واپس آ گئے وہاں نیپال سے آنے والا ایک اجنبی سادھو ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے باواجی کو بتایا کہ مہاراجہ نیپال نے انہیں اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔

"مہاراجہ کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے۔" باواجی نے دریافت کیا۔

"سرکار! ہمارے مہاراجہ حضور سنیاسیوں' جوگیوں اور جوتشیوں کے بڑے قدردان ہیں۔ کسی نے آپ کے بارے میں انہیں بتایا ہے کہ آپ علم جوتش اور عملیات میں مہمان ہیں اور آپ حکیم بھی ہیں۔ اسی لئے مہاراجہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے اور یہ تھیلی آپ کی نذر کی ہے۔"

سادھو نے ایک تھیلی باواجی کو دی جس میں چاندی کے سکے بھرے تھے۔ اس نے کہا: "سرکار! راستے میں اونا کے ڈاکوئوں نے مجھے لوٹنا چاہا تھا۔ لیکن آپ کا نام سنتے ہی انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ ان کا سردار آپ کو پرنام کہہ رہا تھا۔"

باواجی نے اسے بتایا کہ وہ خود ان سے مل کر آ رہے ہیں۔ سادھو نے باواجی کے سامنے مہاراجہ نیپال کے دربار کا ایسا نقشہ کھینچا کہ باواجی کا دل وہاں جانے کے لئے مچلنے لگا۔ وہ سیلانی تو تھے۔ خاصے دیر سے گائوں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ اب انہیں نمولیاں سے ایک بار پھر باہر نکل کر دنیا دیکھنی چاہیے۔ لہذا انہوں نے سادھو سے کہا: "ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہی مہاراجہ نیپال کی خدمت میں چلتا ہوں۔" باواجی نے اپنی تیاریاں مکمل کر لیں اور اگلی صبح نیپال کے لئے رخصت ہونے کا قصد کیا لیکن اسی شام ایک عجیب بات ہوئی' اس وقت وہ اپنے حجرے میں ریاضت میں مصروف تھے جب طرطوش جن ایک عجیب و غریب خبر لے کر حاضر ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

باواجی کے لئے یہ خبر واقعی حیران کن تھی۔ انہوں نے بے یقینی کے عالم میں طرطوش کی طرف دیکھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں نہال شاہ! پولیس نے پورے گائوں کو گھیرے میں لے لیا ہے اور مال پور کا تھانیدار حویلی کی طرف آ رہا ہے"۔

"پولیس نے گائوں کو کیوں گھیر رکھا ہے؟" باواجی الجھن میں مبتلا ہو گئے۔ "میں نے کیا جرم کیا ہے؟"

"آپ نے واقعی کوئی جرم نہیں کیا سرکار! لیکن آپ کی جان کے دشمن آپ کو کسی جرم کے بغیر بھی رسوا کرنا چاہتے ہیں۔" طرطوش نے کہا۔ "تھانیدار کچھ

ہی دیر میں آپ تک پہنچنے والا ہے۔ لہذا آپ بذات خود اس کے استقبال کے لئے حویلی سے باہر آجائیں۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ کیوں آرہا ہے۔" باواجی نے طرطوش سے دریافت کیا۔

"فی الحال تو پتہ نہں ہے' اس بات کا پتہ تب ہی چل سکے گا جب وہ یہاں آنے کی وجہ بیان کرے گا۔ اس کی گفتگو سننے کے بعد میں اس کا پس منظر معلوم کرنے کی کوشش کروں گا"۔

نیپال کا سادھو تیار ہو کر حویلی کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے جب باواجی کو تیز قدموں کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھا تو حیران ہو گیا۔

"سرکار! کیا انہیں کپڑوں میں چلیں گے۔" وہ صورت حال سے بے خبر تھا۔

"سادھو جی! شاید ہم آج سفر نہ کر سکیں۔ آپ اندر جا کر آرام کریں۔ میں ذرا ایک مسئلہ نپٹالوں۔" سادھو کچھ سمجھا یا نہیں۔ بہر حال وہ آگے سے کچھ نہ بولا اور رام رام کرتا اپنی چٹیا سہلاتا ہوا اندر چلا گیا۔

باواجی حویلی سے باہر آئے تو اسی لمحے تھانیدار سفید گھوڑی سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے پیچھے گھوڑوں پر سوار چار سپاہی بھی نیچے اتر آئے تھے اور تھانیدار کے حکم پر اپنی جگہ پر ہی کھڑے ہو گئے تھے۔

"آیئے آیئے تھانیدار صاحب! میں آپ کے استقبال کے لئے ہی حاضر ہوا ہوں۔" باواجی احترام کے ساتھ آگے بڑھے۔

"چودھری صاحب! آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ ہم آرہے ہیں۔" تھانیدار نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔ اس کا نام گروبند سنگھ تھا اور ابھی نیا نیا مال پور میں آیا تھا' وہ باواجی کے مقام سے آگاہ نہیں تھا اور محض انہیں گائوں کا چودھری سمجھ رہا تھا۔

"سرکار! جونہی آپ کی گھوڑی کے سموں نے ہمارے گائوں کی زمین پر قدم رکھے تبھی ہمیں معلوم ہو گیا کہ مال پور تھانے کے مالک آرہے ہیں۔" باواجی نے انکساری سے جواب دیا۔

یہ سن کر تھانیدار کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "آپ اتنے باخبر ہیں تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ ہم کیا لینے آئے ہیں۔"

"آپ اندر تو تشریف لائیں سرکار! کیا ساری باتیں باہر کھڑے کھڑے ہی کریں گے۔" باواجی نے اسکی ناگوار بات کا جواب دیئے بغیر کہا۔

"ہم ادھر ہی بات کریں گے۔" تھانیدار نے رعونت کے ساتھ کہا۔ "چودھری نہال شاہ ہم نے سنا ہے کہ تم نے خونیوں اور بدمعاشوں کو اپنی حویلی میں پناہ

دے رکھی ہے۔انہیں ہمارے حوالے کر دو۔اس وقت سارا گائوں پولیس کے حصار میں ہے۔"

باواجی بڑے تحمل کے ساتھ بولے۔"تھانیدار صاحب! آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔ بھلا مجھ جیسے زمیندار کا ان خونی اور بد معاش لوگوں سے کیا واسطہ۔"

"جھوٹ نہ بولو نہال شاہ۔"تھانیدار بد تمیزی پر اتر آیا۔"تم اونا کے ڈاکوئوں سے ملے ہو اور آج تم نے بلاداد کے خونی کو پناہ دی ہے۔"

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہ میں کل رات گھبر سنگھ سے ملا تھا۔ مگر یہ ملاقات اتفاقیہ تھی۔ میں اس سے باقاعدہ ملنے نہیں گیا تھا۔ باقی جہاں تک بلاداد کے کسی خونی کا چکر ہے۔ تو میں ایسے کسی خونی کو نہیں جانتا۔"باواجی نے حیرت کے ساتھ وضاحت کر دی۔

"چلو تم یہ تو مان گئے کہ گھبر سنگھ سے ملے تھے۔اب یہ بھی بتا دو کہ وہ خونی کہاں ہے۔اگر شرافت سے بتا دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ ورنہ پولیس حویلی کی تلاشی لے کر اسے پکڑے گی۔"

"سرکار آپ کس خونی کی بات کر رہے ہیں۔ میں کسی خونی کو نہیں جانتا۔"باواجی کو اب تھانیدار کی باتوں سے الجھن ہونے لگی۔

"کیا تم بنتو چمار کو نہیں جانتے۔"تھانیدار گوروبند سنگھ نے اپنی آبرو کمان کی طرح تان کر پوچھا۔

"جانتا ہوں' بڑا ہی شریف انسان ہے۔اب تو وہ مسلمان ہو چکا ہے۔اس کا نام نوردین ہے۔ مگر اس کا کسی خونی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"باواجی نے اسے بتایا۔

"وہ خونی ہے۔اس نے گائوں کے ٹھاکر... اور اپنی بیوی روشنا کو قتل کر دیا ہے۔ ہماری تفتیش اور کھوجی کے مطابق اس نے پہلے اونا کی پہاڑیوں میں پناہ لینے کی کوشش کی تھی لیکن راستے میں پولیس کو دیکھ کر وہ نمولیاں کی طرف آ گیا تھا ظاہر ہے یہاں اس کا تمہارے سوا اور کون تھا لہذا اس نے حویلی میں پناہ لے لی ہے۔"

باواجی اسے پورے وثوق سے یقین دلاتے رہے کہ نوردین نے حویلی میں پناہ نہیں لی' مگر تھانیدار نے ان کی ایک نہ مانی اور زبردستی حویلی میں گھس گیا۔ باواجی نے پہلے تو سوچا کہ اس اکھڑ اور بدمزاج تھانیدار کا دماغ ٹھیک کر دیں لیکن پھر انہوں نے سوچا کہ انہیں ہر شخص کے ساتھ محاذ نہیں کھولنا چاہیے اور حتی الامکان تک اپنی انسانی اور شخصی خوبیوں کے ساتھ اس کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ پس تھانیدار نے حویلی کی تلاشی تسلی کے ساتھ لی۔اس نے تمام نوکروں اور اس سادھو کو بھی ایک جگہ اکٹھا کیا اور انہیں دھمکا دھمکا کر نوردین کے بارے میں پوچھتا رہا مگر ان میں سے کوئی اسے جانتا ہوتا تو تب جواب دیتا۔ تھانیدار اپنی ناکامی پر بپھر اگیا تھا۔اس نے حویلی کے چند ملازموں پر لاٹھیاں بھی برسائی تھیں۔ لیکن باواجی اسکے غیر انسانی رویے کو برداشت کرتے رہے۔

تھانیدار حویلی سے ناکام واپس لوٹنے لگا تو جاتے ہوئے بولا: "چودھری نہال شاہ! یہ نہ سمجھنا میں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ مجھے ابھی بھی پورا یقین ہے کہ تم نے نوردین کو پناہ دی ہے' ہمارے آنے کی خبر سنتے ہی وہ بھاگ گیا ہے۔ میں آج تو واپس جا رہا ہوں لیکن بہت جلد دوبارہ واپس آئوں گا۔"

"سرکار آپ جب چاہیں آئیں یہ آپ کی اپنی ہی حویلی ہے۔ لیکن آپ کو ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ میرا کسی خونی اور ڈاکوئوں سے تعلق نہیں ہے۔" باوا جی نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا مگر تھانیدار انہیں کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوا چلا گیا۔

تھانیدار کے جاتے ہی باوا جی سر تھام کر بیٹھ گئے تو طرطوش غصے میں کہنے لگا:

"نہال شاہ جی! آپ نے اس گستاخ تھانیدار کو اس کی بدتمیزی پر سزا کیوں نہیں دی۔ آپ مجھے حکم کریں میں ابھی اس کی گھوڑی کو سرکش بنا دوں وہ اس بدبخت کو اپنے سموں تلے روند ڈالے گی۔"

"نہیں طرطوش بالکل نہیں۔" باوا جی نے ناگواری کے ساتھ کہا۔ "طاقت رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں ہر انسان کو اس کی ذرا سی گستاخی پر سزا دینے لگ جائوں۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ مجھے اپنے انسانی اوصاف اور اوسان کو قائم رکھنا چاہیے۔"

"تو پھر آپ پریشان کیوں ہیں۔" طرطوش نے پوچھا۔

"میں نوردین کے بارے میں پریشان ہوں۔ اگر تھانیدار سچ کہتا ہے تو وہ کم بخت کہاں چلا گیا۔ اس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔" باوا جی نے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

"نوردین نے آخر کیا کیا ہے؟" طرطوش نے حیرانی ظاہر کی۔ "وہ تو بڑا مسکین شخص تھا۔"

"مجھے معلوم تھا وہ یہ حرکت کرے گا۔" باوا جی نے بتایا۔ "جب میں نے اسے مسلمان کیا تھا تو اسے بلاداد واپس بھیجنے سے پہلے شیر کی ہڈی کا تعویذ بنا کر دیا تھا جس سے اس کے اندر دلیری آ گئی تھی۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ اپنی فاحشہ بیوی کے ساتھ کیسے رہ سکتا تھا اور گائوں کے ٹھاکر کا ظلم کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس کی غیرت نے یقیناً اسے قتل پر اکسایا ہو گا۔" باوا جی کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے اور پھر آنکھیں بند کر کے کہنے لگے۔ "طرطوش میں نوردین کو تلاش کرنے لگا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ میرے موکلان کی راہنمائی میں اس تک پہنچ جائو۔" باوا جی جانتے تھے کہ دن کی روشنی میں طرطوش کے لئے یہ ممکن نہ ہو گا کہ یہ کسی سہارے یا مانوس بو (جس شخص یا انسان کو تلاش کرنا مقصود ہو جنات کو ان کی بو مہیا کرنے کے لئے ان کی کوئی اترن یا سر کا بال سونگھنے کے لئے دیا جاتا ہے) کے بغیر اس تک پہنچ سکے۔

باوا جی نے حجرے میں آ کر اپنے موکلان کو طلب کیا اور انہیں نوردین کی تلاش میں بھیج دیا۔ اس دوران باوا جی ایک وظیفہ کرنے لگے۔ جونہی ان کا وظیفہ

مکمل ہوا طرطوش اور موکلان حاضر ہو گئے اور انہوں نے بتایا کہ نوردین اونا کی پہاڑیوں میں پہنچ گیا ہے۔اس نے واقعی پہلے نمولیاں آنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا اور گھبر سنگھ کے پاس چلا گیا۔ باواجی نے طرطوش سے کہا کہ وہ نوردین کو ان کا پیغام پہنچادے کہ آج رات کو وہ حویلی پہنچ جائے۔

باواجی نے سادھو سے کہہ دیا تھا کہ وہ آج نیپال کے لئے روانہ نہ ہو سکیں گے لہذا ایک آدھ روز بعد اسے مطلع کر دیں گے کہ کب جانا ہے۔طرطوش نے نوردین کو باواجی کا پیغام پہنچادیا تھا لہذا وہ رات کو گبھر سنگھ کے دو ساتھیوں کی راہنمائی میں حویلی آگیا اور آتے ہی باواجی کے قدموں میں گر گیا۔

"نوردین! بالآخر قسمت تجھے اس ڈگر پر لے ہی آئی ہے۔" باواجی نے اسے اپنے قدموں سے اٹھایا اور سینے سے لگا کر کہا۔"لیکن یار تو سب سے پہلے میرے پاس کیوں نہیں آیا۔"

"سرکار! میں اس لئے واپس چلا گیا کہیں پولیس آپ کو تنگ نہ کرے اور پھر میں دو انسانوں کو قتل کرنے کے بعد آپ کا سامنا بھی نہ کر پاتا۔مجھے خوف تھا کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

"تم نے دو انسان نہیں دو شیطان مارے ہیں نوردین!" باواجی نے اسے تسلی دی۔"لیکن اب میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا کہ ایک بار خون کرنے کے بعد تم ایک ایسے گروہ کے ساتھ مل جاؤ جو اپنا کاروبار حیات چلانے کے لئے انسانوں کو مارتا اور لوٹتا ہے۔آج کے بعد تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔اونا کی پہاڑیاں جن کی ہیں انہی کے پاس رہنے دو۔" باواجی نے گبھر سنگھ کے ساتھیوں کی سیوا کی اور انہیں واپس بھیجتے ہوئے پیغام دیا۔"گبھر سے کہنا نوردین کو ہم نے رکھ لیا ہے ہمیں اس کی ضرورت ہے۔"

نوردین اب بہت بدل چکا تھا۔کہاں وہ بلاداد کا مریل سا بنتو چمار اور کہاں اب یہ ٹھوس بدن کا مالک نوردین۔اس کے ماتھے پر محراب بھی نمایاں تھی جو اس بات کی غماز تھی کہ نوردین کا نماز سے رشتہ مضبوط تھا۔ باواجی نے نوردین سے دریافت کیا کہ اس نے روشنا اور ٹھاکر کو کیوں قتل کیا ہے تو اس نے بتایا کہ اس نے بستی میں جاتے ہی روشنا سے قطع تعلق کر لیا تھا اور اسے بتادیا تھا کہ اب وہ مسلمان ہو گیا ہے لہذا اب وہ اسی صورت میں اس کے ساتھ رہ سکتی ہے جب خود بھی اسلام قبول کر لے اور اپنی فحش حرکات سے باز آجائے۔روشنا انتہائی چالاک تھی۔اس نے نوردین کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا لہذا اس نے اسلام قبول کر لیا مگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی اور ٹھاکروں کی حویلی میں جا کر داد عیش دیتی رہی۔نوردین کو باواجی سے بے حد عقیدت تھی لہذا وہ بھی اسی پہاڑی پر چلا جاتا تھا جس پر باواجی چلہ کاٹنے جاتے تھے۔وہ روزانہ صبح سویرے وہاں جاتا اور شام کو واپس لوٹتا تھا۔ایک شام جب واپس آیا تو اس نے روشنا اور ٹھاکر کو اپنے گھر میں نازیبا حرکات کرتے دیکھ لیا۔اس لمحے نہ جانے اس کے اندر کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ اس نے ٹھاکر کی کرپان چھین لی اور اسی سے ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد اس کے گھوڑے پر سوار ہو کر گاؤں سے بھاگ نکلا تھا۔

"نوردین! تمہاری غیرت اور اسلام کا تقاضا تو یہی تھا جو تم نے کیا مگر قانون تمہں معاف نہیں کرے گا۔اس لئے اب تم میرے ساتھ نیپال چلے چلو۔ یہاں رہو گے تو تمہیں چھپ کر رہنا پرے گا۔ شاید میں بھی تمہیں زیادہ دیر اندھے قانون سے نہ بچا سکوں۔اس لئے ہم ابھی روانہ ہو جائیں تو بہتر ہے۔" باوا جی نے نوردین کو اپنے فیصلے سے آگا کیا۔انہوں نے سادھو کو جگایا اور گھوڑوں پر سامان لاد کر نیپال کی طرف روانہ ہو گئے۔ کئی مہینوں کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے وہ بالآخر نیپال پہنچ گئے

شاہ نیپال کے دربار میں

مہاراجہ کو جونہی اطلاع ملی کہ باوا نہال شاہ تشریف لے آئے ہیں اس نے یاتری محل کے داروغہ سے انہیں اندر لانے کے لئے کہا۔ یہ داروغہ ایک خواجہ سرا تھا۔ وہ ٹھمک ٹھمک کرتا ہوا باوا جی کا سواگت کرنے کے لئے باہر نکلا اور پھر انہیں اپنی راہنمائی میں یاتری محل کے اندر لے گیا۔

مہاراجہ یاتری محل کے گرم حمام کے باہر بیٹھ کر دھوپ سینک رہا تھا۔ اس کے گرد حسین و جمیل کنیزوں کا جھرمٹ تھا جو اس پر چھتر سایہ بنی ہوئی تھیں' مہاراجہ نے مختصر لباس پہنا ہوا تھا۔ باوا جی محلات اور شاہوں کے مزاج سے ناآشنا تھے۔ انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ مہاراجہ نیپال انہیں اپنے یاتری محل میں ہی بلوا لے گا۔ "یاتری محل" کی دنیا دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ محل میں مہاراجہ کے سوا کوئی اور مرد دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف حسن و رعنائیوں کی بہاریں نظر آ رہی تھیں۔

باوا جی جب مہاراجہ کے قریب پہنچے تو مہاراجہ بڑے اشتیاق کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شاہ تھا مگر پنڈتوں' پجاریوں اور عاملوں کا بڑا ہی قدر دان تھا۔ اس نے باوا جی کا خود سواگت کیا۔ اس دوران کنیزوں نے ریشمی چادر سے مہاراجہ کا تن ڈھانپ دیا تھا۔ مہاراجہ نے باوا جی کا ہاتھ تھام لیا اور انہیں ساتھ لیتا ہوا پائیں باغ میں لے گیا۔

"آپ کو ہمارا یہ محل کیسا لگا ہے نہال شاہ جی۔"

مہاراجہ نے انہیں باغ میں بچھی مسند پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اللہ آپ کا اقبال بلند کرے اے شاہ نیپال!" باوا جی نے ادب کے ساتھ کہا۔ "مجھے تو اس ماحول سے وحشت سی ہونے لگی ہے۔ آپ نے اس فقیر کو یہاں بلا کر اس کا امتحان لیا ہے۔"

مہاراجہ نے قہقہہ لگایا اور کہا: "آپ تو دلوں کے بھید جانتے ہیں۔ اس لئے آپ سے کچھ چھپانا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی یہ پہلی ملاقات ہے۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کو دربار یا محل میں بلا کر بات کرنے سے بہتر ہے کہ یہاں کچھ باتیں کر لی جائیں۔ کیونکہ ایک یہی ایک جگہ ہے جہاں ہمارے دل کو سکون ملتا ہے۔"

مہاراجہ نے باوا جی کو بتایا کہ اس کے دربار میں کم از کم ایک سو پنڈت اور جوتشی موجود ہیں جو اپنے اپنے علم میں ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ مگر انمیں سے کوئی بھی مہاراجہ کے دکھ کا مداوا نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے بڑی آزردگی کے ساتھ کہا: "نہال شاہ! ہمیں اور کوئی دکھ نہیں ہے۔ اگر کوئی دکھ ہے تو یہ کہ

بھگوان نے ہمیں ولی عہد نہیں دیا۔ ہمارے لیکھوں میں لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں اگر آپ اپنے علم کے ذریعے یہ بتادو کہ ہمارے نصیب میں بیٹا بھی ہے کہ نہیں تو ہم آپ کا منہ موتیوں سے بھر دیں گے۔"

باواجی نہال شاہ بولے۔ "اعلیٰ حضرت! میں نمائشی جوتشی نہیں ہوں۔ بہر حال جو بھی کہوں گا' اپنے دین وایمان کے ساتھ صاف کہہ دوں گا۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہ آپ میری صاف گوئی پر ناراض ہو جائیں گے۔"

"نہال شاہ جی! ہم آپ کو ہر طرح کی آزادی دیتے ہیں۔ ہمارے فائدے کے لئے آپ جو بھی کہیں گے ہم سنیں گے۔" مہاراجہ نیپال نے کہا۔

"مہاراجہ حضور! اگر مجھے آج شام کا وقت مل جائے تو میں اگلی صبح آپ کے حضور حساب کتاب پیش کر دوں گا۔"

مہاراجہ نے باواجی کو اجازت دے دی اور اگلی صبح جب باواجی مہاراجہ کے روبرو ہوئے تو انہوں نے کہا۔ "مہاراجہ سرکار! آپ عمر کے پچاس سال گزار چکے ہیں۔ آپ کی رانیاں کتنی ہیں' یہ آپ خود نہیں جانتے۔ آپ کے یاتری محل میں نوجوان لڑکیوں کی تعداد کتنی ہے اور ان کے ساتھ داد عیش دیتے ہوئے آپ کو کتنا عرصہ گزر گیا ہے' یہ بھی آپ کو معلوم نہیں۔ آپ صرف وقت گزار رہے ہیں' مگر ستاروں کی نحوست کا ایک کڑا دور آنے والا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنی سرگرمیاں محدود کر لیں' اپنے محافظ بدلیں اور محافظوں اور مصاحبوں کے روپ میں چھپے ہوئے دشمنوں پر نظر رکھیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو یہ فرض مجھے سونپ دیں' اپنے تمام مصاحبوں' محافظوں کو ایک ایک کر کے میرے پاس بھیجتے جائیں میں ان کی اصلیت سے مہاراجہ سرکار کو آگاہ کرتا جاؤں گا۔"

مہاراجہ نے زندہ دلی کے ساتھ باواجی کی باتیں سنیں اور کہا: "میں اپنے ذاتی محافظوں کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ مگر آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ میری اولاد نرینہ بھی ہو گی یا نہیں۔"

"حضور اس کے لئے مجھے مہارانیوں کے ہاتھ اور زائچے دیکھنے ہیں۔" باواجی نے کہا۔

"کیا ہمارے ستاروں نے یہ نہیں بتایا کہ ہمیں اولاد نرینہ کا سکھ بھی ملے گا یا نہیں۔" مہارانہ نے تعجب کے ساتھ سوال کیا۔

باواجی مہاراجہ نیپال کے دکھ کو سمجھتے تھے۔ ان کا علم و گیان انہیں یہ بتا رہا تھا کہ مہاراجہ کے مقدر میں اولاد نرینہ کا سکھ ہے اور اس کی سلطنت میں اس کے ہوتے ہوئے ہی اس کا ولی عہد مہاراجہ بن جائے گا مگر مہاراجہ کی جنم کنڈلی اور ستاروں کی گردش نے اس کے اولاد کے خانہ میں نحوست پھیلائی ہوئی تھی۔ مہاراجہ کو اس نحوست کے عذاب سے بچانے کے لئے کچھ تدابیر کرنے کی ضرورت تھی لہذا باواجی نے مہاراجہ سے صاف صاف کہہ دیا:

"مہاراجہ سرکار! میرے اللہ نے چاہا تو آپ کو ولی عہد ضرور ملے گا۔ مگر مجھے اپنے علم کو استعمال کرتے ہوئے آپ کے ستاروں کی نحوست کو دور کرنا پڑے

گا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے آپ کی رانیوں کے زائچے بھی بنانے ہوں گے۔"

"ہم نے ایک ولی عہد کے لئے بہت سی شادیاں کر رکھی ہیں نہال شاہ۔ ہمارے جس جوتشی اور پنڈت نے جب بھی ہمیں شبھ گھڑی کی خوشخبری سنائی اور ہمیں یہ کہا گیا کہ ہمیں دیوی دیوتاؤں کی اچھا پوری کرنے کے لئے بھینٹ بھی چڑھانی ہے' ان کے پوتر استھانوں اور ان کی مقدس مورتیوں کو سونے کے پانی سے نہلانا ہے تو ہم نے اس خواہش کے بدلے میں یہ سب کچھ کیا۔ شادیاں بھی کیں اور اپنی ریاست کے کونے کونے میں قائم مندروں' بدھ گاہوں میں بھینٹ چڑھائی۔ ہم نے اپنے کسی جوتشی کا دل میلا نہیں کیا۔ کسی پنڈت سادھو اور گیانی کی بات نہیں موڑی۔ ہم ان کے وچاروں میں آکر بہت کچھ کر گزرے ہیں۔ یہ جو آپ یاتری محل دیکھ رہے ہیں۔ یہ بھی ہمارے جوتشیوں کے کہنے پر بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم پانچ سال تک لنگ دیوتا کے نام پر کنیائوں کے جھرمٹ میں اشنان کرتے رہے تو دیوتا ہمیں ایک نہیں بہت سی اولاد نرینہ دے گا۔ ہم دو سالوں سے روزانہ لنگ دیوتا کی پوجا کرنے کے بعد اشنان کرتے آرہے ہیں۔"

"لیکن آپ کے یہ جوتشی بہت بڑا پاپ کر رہے ہیں حضور" باواجی نے بے باکی کے ساتھ کہا۔ "میرے جوتش میں کایا پلٹنے کے لئے اس طرح کی کوئی بھی منت نہیں مانگی جاسکتی۔ البتہ کالے عملیات کے دوران شیطان کے پجاری اس کو خوش رکھنے کے لئے بہت سی گندی حرکتیں خود بھی کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کراتے ہیں۔ میرے علم اور عملیات میں یہ طور طریقے گناہ کہلاتے ہیں"۔

مہاراجہ کو باواجی کی بے باکی ناگوار گزری' کہنے لگا: "نہال شاہ! تم ابھی ہمارے مہمان ہو۔ اس لئے ہم تمہاری یہ گستاخی معاف کر رہے ہیں۔ مگر ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا ہم اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے جو چاہے طریقہ اختیار کریں تمہیں ان کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا ادھیکار نہیں۔ ہم صرف تم سے تمہارے علم کی بات کریں گے اور تم ہمارے لئے کیا کر سکتے ہو۔ یہ تمہیں کچھ حدود میں رہ کر کرنا ہوگا۔"

باواجی کو احساس ہو گیا تھا کہ فی الحال مہاراجہ کو اس کی بوالہوسی سے روکنا مشکل کام ہوگا لہذا انہوں نے ادب کے ساتھ کہا: "حضور! میں آپ کے معاملات میں دخل تو نہیں دوں گا۔ مگر میں اس وقت کچھ کہنے سے باز نہیں رہ سکوں گا جب میرا علم مجھے یہ بتائے گا کہ یہ فلاں حرکت یا کام آپ کے لئے بہتر نہیں ہے۔ اگر حضور کو میری یہ بات منظور نہیں ہے تو مجھے اجازت دیں۔ میں آج ہی اپنے دیس چلا جاتا ہوں۔"

"نہال شاہ! ہم نے تمہارے علم کے چرچے سن رکھے ہیں۔ ہم تم جیسے گیانیوں کے قدردان ہیں۔ اس لئے ہمیں تمہاری بات منظور ہے۔ آج سے ہم تمہیں اپنے دربار کے مہاجوتشی کا خطاب دیتے ہیں۔ اب تم اپنا کام کرو اور اس کے لئے جس چیز کی ضرورت ہو ہمیں بلا جھجک بتادو۔ البتہ یہ بات یاد رکھنا' ہمیں اس سمے کا انتظار ہے کہ ہماری ریاست کو اس کا ولی عہد کب ملے گا۔ اپنے گیان سے ہمیں اس سمے کے بارے میں جلد سے جلد بتادو۔"

اس روز باواجی نے مہاراجہ کی اجازت سے اس کی تمام رانیوں کے زائچے بنائے اور اس سلسلے میں انہوں نے طرطوش سے بھی مدد لی۔ مہاراجہ کی رانیوں کی

تعداد بیس سے اوپر تھی۔ان میں سے کئی اب بوڑھی ہو چکی تھیں اور کچھ تو بالکل نوخیز تھیں۔ان رانیوں میں سے مہاراجہ کی اولاد تو تھی مگر صرف لڑکیوں نے ہی جنم لیا تھا۔مہاراجہ کو اپنی بیٹیوں سے سخت چڑ تھی اس لئے وہ وہ ان رانیوں کا منہ دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔البتہ اس نے سبھی رانیوں کو محلات دیئے ہوئے تھے۔ان کے رتبے بھی قائم کئے ہوئے تھے اور وہ پورے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ زندگی گزار رہی تھیں۔

وہ ہری شاہ نلوہ کی بیوہ تھی

مہاراجہ ہر سال کم از کم باقاعدہ دو شادیاں کرتا تھا۔اس نے چھ مہینے پہلے جس عورت سے شادی کی باواجی اس کے محل میں آخر پہنچے۔وہ رانی اٹھارہ انیس برس کی تھی۔سرخ و سپید رنگت 'دراز قامت 'تیکھے نقوش والی اس رانی کا نام روپارانی تھا۔اس کی آنکھوں میں بلا کی کشش اور تکبر تھا۔اسے معلوم ہو چکا تھا کہ باواجی کس مقصد کے تحت اس کے پاس آئے ہیں۔روپارانی کو جوتشیوں سے نفرت تھی اور وہ اپنا زائچہ بنوانے کے حق میں نہیں تھی۔لیکن مہاراجہ کا حکم تھا لہذا اس نے بامر مجبوری اپنے کوائف باواجی کو مہیا کر دیئے۔باواجی نے کچھ دیر میں ہی زائچہ بنالیا لیکن زائچہ کے نتائج سامنے آتے ہی باواجی حیران و پریشان ہو گئے۔انہوں نے ایک بار پھر روپارانی کا زائچہ بنایا مگر اس بار بھی نتائج حسب سابق تھے۔اس دوران باواجی نے رانی کے ہاتھوں کی ریکھائوں کو بھی دیکھ لیا تھا۔انہیں رانی کے ہاتھوں اور زائچہ میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا لیکن اس کے باوجود وہ دوپہر تک اس زائچے کو مختلف طریقوں سے بناتے رہے۔

روپارانی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ باواجی زائچہ بنا کر فکر مند ہیں لہذا وہ ان کے پاس آئی اور انتہائی نخوت سے کہنے لگی:"میں تو پہلے ہی تمہارے جنتروں منتروں اور ستاروں کو نہیں مانتی تھی۔لو اب خود دیکھ لو۔تم نے جو زائچہ بنایا ہے اس نے تمہیں خود ہی پریشان کر دیا ہے۔اب بھلا میں اس پر کیسے یقین کر لوں۔لہذا ب تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ اپنا بوریا بستر گول کرو اور میری نظروں سے دور ہو جائو۔"

باواجی نے ایک نظر زائچہ پر ڈالی پھر رانی کی سحر انگیز آنکھوں میں نظریں ڈال کر بولے۔"رانی میرا علم جھوٹا نہیں ہے۔"

"ہوں..... جھوٹا نہیں ہے تو اور کیا ہے۔"روپارانی کہنے لگی۔"اگر یہ سچا ہوتا تو مجھے اب تک میرے حالات بتا چکے ہوتے۔"

"رانی۔میں یہ بات کہتے ہوئے معافی چاہتا ہوں کہ آپ نے جو کوائف دیئے ہیں اس کے مطابق آپ کی جگہ اس محل میں نہیں ہونی چاہیے تھی۔ان کوائف کے مطابق تو آپ ستاروں کی ایک ایسی منحوس گھڑی سے گزر رہی ہیں جو یہ بتاتی ہے کہ اس عورت کو اب تک مر جانا چاہیے تھا۔یہ زائچہ ایک سال پہلے بند ہو جاتا ہے اور ایسی عورت زہر کھا کر مر جاتی ہے۔"

یہ سنتے ہی رانی کے سرخ و سپید چہرے پر زردی سی چھا گئی مگر وہ بولی:"لیکن میں تو زندہ ہوں۔"

"یہی تو میں سمجھ نہیں پا رہا۔"باواجی الجھتے ہوئے بولے۔"یا تو آپ نے مجھے اپنے کوائف غلط دیئے ہیں یا پھر..."

"پھر کیا..." اس بار رانی نے تجسس سے پوچھا۔

"یہ کہ اگر یہ کوائف درست ہیں تو پھر رانی جی کو یقیناً کسی کی دعاؤں نے سلامت رکھا ہوا ہے۔"

یہ بات رانی کے دل میں اتر گئی مگر اس کا تکبر اسے کوئی بات کہنے سے روک رہا تھا۔

"مگر آپ ہمارے ہاتھوں کے بارے میں بھی کچھ کہہ رہے تھے۔" رانی نے پوچھا۔

"آپ کے یہ ہاتھ اس بات کی علامت کو ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کو اسی مقام پر ہونا چاہیے تھا۔ آپ راجکمار کو جنم دے سکتی ہیں مگر آپ کے ہاتھوں پر آپ کا ماضی بھی کندہ ہے۔" یہ کہتے ہوئے باواجی نے رانی کو عجیب انداز میں دیکھا تو روپارانی ان کی نظر پاش آنکھوں کی تاب نہ لا سکی۔ وہ اپنی روشن اور مقناطیسی آنکھیں چرانے لگی۔

"رانی جی! آپ مجھے کچھ نہیں بتائیں گی تو میں پھر بھی آپ کو آپ کا ماضی بتا سکتا ہوں۔" باواجی نے پراسرار لہجے میں کہا۔ "آپ بے شک میری ان باتوں کو جھٹلا دیں۔ مگر آپ کو جب میں پورے ثبوت کے ساتھ آپ کے ماضی کا آئینہ دکھاؤں گا تو پھر آپ کے لئے اس سے نظریں چرانا مشکل ہو جائے گا۔"

باواجی نے رانی کا زائچہ ایک طرف رکھ دیا اور کہنے لگے: "رانی جی! مجھے اب اجازت دیجئے۔"

رانی باواجی کی باتوں کے سحر میں کھو سی گئی تھی۔ وہ یہ سنکر جلدی سے بولی۔ "نہال شاہ جی! آپ کا گیان... آپ کا گیان سچا ہے۔ میں نے اپنے کوائف غلط بتائے ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں اور مجھے میرے مقدر کے بارے میں بتائیے۔ میں کچھ دیر بعد آئوں گی۔" یہ کہہ کر روپارانی چلی گئی۔

اس بار باواجی نے رانی کا جو زائچہ بنایا تو ساری حقیقت کھل کر سامنے آگئی لیکن رانی کو اس کے زائچے کے بارے میں بتانے سے پہلے باواجی نے طرطوش کو طلب کر لیا اور روپارانی کے زائچہ اور اس کے ہاتھوں کی لکیروں کے بارے میں بتانے کے بعد بولے۔

"میں ابھی تک الجھن میں ہوں کہ یہ عورت وہ نہیں ہے جو نظر آرہی ہے۔ میرا علم یہ کہہ رہا ہے کہ یہ عورت کسی کی بیوہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم رانی کے ماضی کے بارے میں چھان بین کر کے بتائو۔"

باواجی نے طرطوش کو روپارانی کا ماضی تلاش کرنے کے لئے چند ہدایات دیں پھر اپنے دو موکل رانی کے پیچھے لگا دیئے۔ کچھ ہی دیر بعد باواجی کو رانی کے ماضی کے بارے میں مطلع کر دیا گیا۔ اس دوران روپارانی نے اپنی خاص خادمہ کو باواجی کے پاس بھیجا اور کہا کہ رانی جی نے آپ کو اپنے کمرے میں طلب کیا ہے۔

باواجی اس کی راہنمائی میں رانی کے کمرۂ خاص تک پہنچے تو رانی نے دروازے میں آکر ان کا استقبال کیا اور بولی۔ "مہاراج پدھاریئے۔"

باواجی رانی کے رویہ میں یہ تغیر دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور آنکھوں میں نرمی آچکی تھی۔

"جوگی مہاراج آپ نے ہمارے زائچے میں کیا کچھ دیکھا ہے۔" رانی نے پوچھا۔

"مہارانی۔ میں جوگی نہیں جوتشی ہوں۔" باواجی مسکراتے ہوئے معنی خیز بات کہہ گئے۔ روپارانی باواجی کے منہ سے مہارانی کا لفظ سن کر حیرت سے بولی:
"آپ نے ہمیں مہارانی کیوں کہا ہے۔"

"اس لئے کہ مہاراجہ بہت جلد آپ کو مہارانی کا خطاب دینے والے ہیں۔" باواجی نے کہا۔ "میرا علم یہی کہتا ہے۔ کیونکہ آپ راجکمار کو جنم دیں گی۔ اس لئے مہاراجہ سرکار صرف آپ کے ہو کر رہ جائیں گے تو ظاہر ہے یہ خطاب پھر آپ کو ہی ملے گا۔ مگر اس سے پہلے رانی جی آپ کو ہمارا تجسس بھی ختم کرنا ہو گا۔"

"کیسا تجسس۔" رانی ابرو کی کمان تان کر پوچھنے لگی۔

"یہی کہ آپ کون ہیں؟"

"کیا آپ کو معلوم نہیں ہو چکا کہ ہم کون ہیں۔" رانی نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

"ہمارے علم کے مطابق تو آپ بیوہ ہیں۔ زائچہ کے مطابق آپ کا تعلق کشمیر سے ہے۔ آپ کسی جرنیل کی بیوی تھیں۔ اور کچھ بھی کہوں یا آپ خود بتانا پسند کریں گی۔" باواجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں سکھوں کے مشہور جرنیل ہری شاہ نلوہ کی بیوہ ہوں۔" یہ کہتے ہوئے روپارانی کا شاداب چہرہ غموں سے اٹ گیا۔ "یہ کہانی سن کر آپ کیا کریں گے۔ بس یہی سمجھیں کہ میرے مقدر میں یہی کچھ لکھا تھا۔ میری داستان ایسی ہے کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے میرا جی کٹ جاتا ہے۔"

باواجی رانی کے چہرے پر کرب و اضمحلال کی کیفیت دیکھ کر کہنے لگے۔ "مہارانی میں جانتا ہوں یہاں کے لوگوں کو آپ کا ماضی معلوم نہیں ہے۔ اس لئے میں بھی اپنی زبان بند رکھوں گا۔"

روپارانی ہری شاہ نلوہ کی آخری بیوی تھی مگر وہ اسے زیادہ دیر تک اپنے ساتھ نہیں رکھ سکا تھا۔ ایک جنگ میں مارے جانے کے بعد روپارانی کشمیر سے نیپال آ گئی تھی اور یہاں آکر اس نے مہاراجہ نیپال تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ یہ ایک لمبی داستان ہے کہ وہ مہاراجہ کی رانی کیسے بنی؟ بہر حال یہ بات طے ہے کہ

وہ مہاراجہ کی دوسری رانیوں میں سے سب سے جوان' تعلیم یافتہ اور خوبصورت تھی۔ باواجی نے تمام رانیوں کے زائچے دیکھنے کے بعد مہاراجہ کو اس بات کا مشورہ دیا کہ وہ اپنی تمام رانیوں سے قطع تعلق کر کے صرف روپارانی کے ہو کر رہ جائیں۔ مہاراجہ نے باواجی کے کہنے پر تمام رانیاں چھوڑ دیں اور روپارانی کو اپنے محل میں رکھ لیا۔ تقدیر کا کرنا یہ ہوا کہ ایک سال بعد روپارانی نے راجکمار کو جنم دیا۔ بوڑھے مہاراجہ کے تو زمین پر پائوں نہیں لگ رہے تھے۔ اس نے باواجی کا منہ موتیوں سے بھر دیا اور انہیں سونے اور جواہرات سے لاد دیا۔ مہاراجہ نے باواجی کے مشورے پر راجکمار کا نام شمشیر سنگھ رکھا جو بعد میں مہاراجہ شمشیر سنگھ کی حیثیت میں نیپال پر حکمرانی کرتا رہا۔

شاہ نیپال پر جادو

باواجی مہاراجہ کے مقرب خاص بن گئے تھے۔ راجکمار کی پیدائش کے بعد مہاراجہ نیپال شدید بیمار پڑ گیا اور اس کے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے درباری جوتشیوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ دیوتاؤں نے راجکمار کے بدلے مہاراجہ کی جان لینے کی ٹھان لی ہے۔ بستر مرگ پر پڑے مہاراجہ تک یہ اطلاع پہنچی تو وہ سرتاپا لرز کر رہ گیا۔ اس کے تمام درباری اور ریاست میں موجود وید حکیم مہاراجہ کا علاج معالجہ کرنے میں ناکام ہو کر رہ گئے تھے۔ باواجی ان دنوں واپس نمولیاں آ گئے تھے۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ مہاراجہ نیپال بیمار پڑ چکا ہے۔ مہاراجہ کو معلوم نہیں تھا کہ باواجی ایک جید طبیب بھی ہیں۔ مہاراجہ کی بیماری اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ ان حالات میں مہارانی روپا نے ایک قاصد کو نمولیاں بھیجا اور باواجی کو اطلاع بھجوائی کہ وہ فوراً نیپال پہنچیں۔

جونہی باواجی کو معلوم ہوا کہ مہاراجہ بستر مرگ پر ہے تو انہوں نے اسی وقت چلہ کاٹا اور عملیات کے زور پر مہاراجہ کے حالات معلوم کئے تو انہیں معلوم ہوا کہ مہاراجہ پر جادو کیا گیا ہے اور کسی بیمار شخص کا مسان کھلایا گیا ہے۔ انہوں نے اپنا سامان اٹھایا اور چل پڑے البتہ چلنے سے پہلے طرطوش کو بلا کر سفوف سے بھری ایک پوٹلی دی اور اسے کہا کہ وہ یہ پوٹلی مہاراجہ کے بستر کے گرد جا کر کھول دے اور اس کے اندر موجود راکھ کو پورے کمرے میں بکھیر دے۔

باواجی کو احساس ہو گیا تھا کہ اگر وقتی طور پر جادو ٹونہ کا توڑ نہ کیا گیا تو مہاراجہ اس دنیا کو چھوڑ جائے گا۔ طرطوش نے واپس آ کر باواجی پر انکشاف کیا کہ مہاراجہ نیپال کی رانیوں نے درباری جوتشیوں اور جادوگروں سے مل کر مہاراجہ کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔

طرطوش نے سفوف سے بھری پوٹلی مہاراجہ کے کمرے میں بکھیر دی جس سے مہاراجہ حصار میں آ گیا تھا۔ یہ حصار اس وقت تک قائم رہ سکتا تھا جب تک اسے کوئی بہت طاقتور عامل توڑ نہ دیتا۔ لہذا باواجی نے ان خدشات کے تحت اپنی پراسرار قوتوں کو استعمال کیا اور بہت جلد نیپال پہنچ گئے۔

مہاراجہ سدھ بدھ کھو چکا تھا۔ وہ سیدھے مہارانی روپا کے پاس گئے اور اسے آگاہ کر دیا کہ مہاراجہ کو زہریلا مسان کھلایا گیا ہے۔ روپا ایک وفا شعار اور انتہائی ذہین مہارانی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ دوسری رانیاں مہاراجہ کو کیوں مارنا چاہتی ہیں۔

باواجی مہاراجہ کے کمرے میں پہنچے تو مسہری پر ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے مہاراجہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ مہاراجہ کی پائنتی کی طرف ایک درباری طبیب اور جوتشی کھڑا تھا۔ مہاراجہ کی بڑی رانی بھی وہاں موجود تھی۔ روپا مہارانی نے باواجی کے کہنے پر کمرہ خالی کرنے کا حکم دیا تو بڑی رانی' جوتشی اور طبیب ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ باواجی نے ان کی آنکھوں کی میں نفرت حسد اور کینہ دیکھ لیا تھا۔ انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہی وہ تین لوگ ہیں جو مہاراجہ

کو موت سے ہمکنار کر رہے ہیں۔

باواجی نے اب روپا مہارانی کو بھی کمرہ چھوڑنے کا کہہ دیا اور کہا: "مہارانی جی! مجھے اکیلے کو یہاں رہنے دیں۔ میں چند عمل کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے آپ یہاں سے چلی جائیں۔"

"کیا آپ کو وشواس ہے کہ ہمارے پتی مہاراجہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" مہارانی کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"مجھے یقین ہے۔ میرے اللہ نے چاہا تو مہاراجہ سرکار بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

مہارانی نے کمرہ چھوڑنے سے پہلے مہاراجہ کے پائوں چھوئے اور چلی گئی۔ باواجی نے مہارانی کے جاتے ہی دروازہ بند کیا اور طرطوش کی حاضری لگانے لگے۔ وہ چند لمحوں میں حاضر ہو گیا اور آتے ہی اس نے مہاراجہ کی نبض دیکھی اور باواجی سے کہنے لگا: "نہال شاہ! مہاراجہ کا دم ٹوٹنے والا ہے۔ لہذا اپنا کام جلدی شروع کریں۔"

باواجی نے آگے بڑھ کر مہاراجہ کی نبض تھام لی مہاراجہ کا بدن یخ ہو چکا تھا اور نبض ڈوب رہی تھی انہوں نے طرطوش کے مشورے پر چند ترقیات مسان اور عرقیات مہاراجہ کے منہ میں ٹپکائے۔ کچھ دیر بعد عرقیات نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ مہاراجہ کے بدن میں حرارت آنے لگی تھی۔

"اب میں مسان کی حاضری لگائوں گا طرطوش۔ تم مہاراجہ کے پاس بیٹھو۔" باواجی نے

جلدی سے مسہری کے پاس چوکی لگائی اور عملیات کا دور شروع کر دیا۔ باواجی کوئی دس منٹ بعد ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور وہ مسان اپنی خباثت کے ساتھ ظاہر ہو گیا جو مہاراجہ کو کھلایا گیا تھا۔ باواجی نے عملیات کے زور پر اسے جلا دیا البتہ اسے جلانے سے پہلے یہ بات پوچھ لی کہ اسے کس نے قید کیا تھا۔

باواجی شام گئے تک چوکی میں ہی بیٹھے رہے۔ انہوں نے مہاراجہ کے مسان کا سحر تو ختم کر دیا تھا مگر اب مہاراجہ کے ناتواں بدن میں توانائی کی لہر دوڑانے کا مسئلہ تھا۔ طرطوش نے اپنی حکمت کے زور پر مہاراجہ کو ایسی ایسی نایاب ادویات کھلا دی تھیں جن کے باعث مہاراجہ کے اندر جان سی آ گئی تھی اور اس نے دھیرے دھیرے سے آنکھیں کھولنا شروع کر دی تھیں۔

مہاراجہ آنکھیں کھول کر بے یقینی سے ارد گرد دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ رہا تھا جیسے مرنے کے بعد دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہے مگر جب باواجی نے اسے پوری صورت حال بتائی کہ اسے کیسے اور کن حالات میں موت کے منہ سے بچا کر لے آئے ہیں تو اس کی آنکھیں تشکر سے بھر گئیں۔ باواجی نے مہارانی روپا کو بھی اندر بلا لیا۔ رانی مہاراجہ کو جیتے اور جاگتے ہوئے دیکھ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور اپنے گلے سے موتیوں کی مالا اتار کر باواجی کو پیش کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"نہال شاہ جی! آپ نے ہمارے راج پاٹ کو ایک نیا جیون دیا ہے۔ ہمارے پتی مہاراج کی اس نئی زندگی نے ہمیں آپ کا احسان مند بنا دیا ہے۔ آپ تو ہمارے لئے پہلے بھی مہربان تھے مگر اب آپ کی قدر ہمارے دل میں اور بڑھ گئی ہے۔ ہم مہاراج کی صحت یابی پر بہت بڑا جشن منائیں گے اور آپ کی جھولی ہیرے جواہرات سے بھر دیں گے۔"

مہاراجہ نقاہت کے مارے ابھی صحیح طرح سے بول نہیں پا رہا تھا لیکن اس نے ٹوٹے پھوٹے ہوئے الفاظ میں اپنے دل کی خواہش بیان کی: "نہال شاہ! ہمارے جیون پر تمہارا ابھی ادھیکار ہے۔ اب تم ہمارے اپنے ہو۔ اس لئے ہم نہیں چاہیں گے تم ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ۔ ہم تمہیں اپنی ریاست میں جاگیر عطا کریں گے۔ اب تم ہمارے مصاحب خاص ہو گے۔"

"میں اس پر مہاراج سرکار کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" باوا جی نے کہا۔ "لیکن میں اپنے دیس سے زیادہ دیر تک دور نہیں رہ سکتا۔ میں سال میں کچھ مہینے یہاں رہ لیا کروں گا اس کے بعد واپس چلا جایا کروں گا۔"

"تمہارا وہاں ہے کون... نہ بیوی' نہ بہن' نہ باپ' نہ بھائی۔ کون ہے وہاں۔" مہارانی روپا پیار بھرے لہجے میں بولی۔ "اس لئے تم یہاں ہمارے پاس رہو۔ ہمارے بھائی بن کر اور پھر ویسے بھی اب تمہیں ان تمام پاجیوں اور شیطانوں کا مقابلہ کرنا ہے جو ہمارے راج سنگھاسن کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ ان پر بھگوان کی مار ہو۔ جنہوں نے ہمارے مہاراجہ کو زہر دیا ہے۔ نہال شاہ جی ہم تمہیں اس وقت تک یہاں سے نہیں جانے دیں گے جب تک تم ہمارے اور ہماری پتی مہاراج کے دشمنوں کا نشٹ نہیں مار دیتے۔"

"مجھے تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ تم بہت بڑے طبیب بھی ہو۔" مہاراجہ کہنے لگا۔ "ہمارے تمام سنیاسی' ویدا اور عامل جھوٹے پڑ گئے ہیں۔ آج سے تم ہمارے طبیب بھی ہو۔ اس لئے ہمیں چھوڑ کر نہ جانا۔"

باوا جی نے فی الحال انہیں تسلی دی اور کہا: "مہاراج سرکار میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔"

باوا جی نے اس دوران طرطوش کو کہہ کر کچھ اور دوائیں منگوالی تھیں اور پھر دو دن تک مہاراجہ کا علاج کرتے رہے۔ تیسرے روز مہاراجہ کا جشن صحت منایا گیا اور مہاراجہ نے بھرے دربار میں باوا جی کو شاہی نجومی اور طبیب کا درجہ دیا اور اعلان کیا کہ وہ ان تمام عاملوں اور سنیاسیوں کو سرعام قتل کر دے گا جنہوں نے اس کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا اور یہ ذمہ داری باوا جی پر ڈال دی گئی کہ وہ ایسے دشمنوں کو بے نقاب کریں' مہاراجہ نے باوا جی کو شاہی محل سے کچھ فاصلے پر ان کی رہائش کے لئے حویلی دے دی تھی۔

باوا جی کو کسی کا ڈر خوف تو نہیں تھا مگر وہ کسی سے انتقام نہیں لینا چاہتے تھے۔ البتہ انہوں نے مہاراجہ کی جان کی حفاظت کے پیش نظر طے کر لیا کہ وہ احتیاطی تدابیر کے تحت مہاراجہ کے دشمنوں کو ایسا سبق سکھا دیں گے۔ جس کے بعد وہ کبھی بھی مذموم سازش نہیں کریں گے۔ لہذا انہوں نے مہاراجہ کے دربار کو

سازشوں سے پاک کرنے کے لئے ایک بڑے چلے کا اہتمام کیا۔ انہوں نے طرطوش اور آتوم کی یہاں ملاقات بھی کرائی۔ دونوں جن ایک دوسرے سے مل کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ آتوم نے جب طرطوش کو بتایا کہ عنقریب طرطوش کے قبیلہ میں شادی کرنے والا ہے تو طرطوش بے حد خوش ہوا۔ آتوم اور طرطوش نے باواجی کو اپنے حفاظتی حصار میں لے کر ان کا چلہ پورا کرایا تھا۔ باواجی نے چلہ پورا کرنے کے بعد ایک سو پچیس کالے بکروں کی قربانی دی اور ان کا گوشت ویرانوں اور قبرستانوں کے درختوں کی جڑوں میں رکھ دیا۔ کچھ گوشت انہوں نے محل کے اونچے برجوں پر بھی رکھ دیا جو پرندے آکر کھانے لگے۔ باواجی نے چلے کا مزید صدقہ اتارنے کے لئے آٹھ من چھوٹی مچھلیاں منگوائیں اور انہیں دریائوں اور ندی نالوں میں چھوڑ دیا۔ مچھلیوں کی خوراک کے لئے انہوں نے پوری ریاست کے ہر گھر سے مٹھی مٹھی بھر خوراک حاصل کی۔ یہ عوام کی اپنے مہاراجہ کی زندگی اور صحت کے لئے خیرات تھی۔ یہ ساری خوراک مچھلیوں کے لئے پانیوں میں پھینکنے سے پہلے باواجی نے خصوصی عمل پڑھے اور حکم دیا کہ صبح کاذب کے وقت یہ خوراک پانیوں میں پھینکی جائے۔ ان سارے صدقہ و خیرات کا مقصد مہاراجہ کو آسیبی اور شیطانی قوتوں کے شر سے بچانے کے لئے ان کے حق میں چرندوں اور پرندوں اور مچھلیوں کو بھی شامل کرنا تھا۔ پاکستان اور بھارت میں آج بھی بہت سارے مسلمان عامل کسی کی نظر اتارنے کے لئے ایسے ہی صدقہ خیرات کرتے ہیں۔ ان کے بقول یہ معصوم مخلوق شر پسند ہوائی مخلوق کو بری حرکات سے روکنے کے لئے ان کے راستے میں آکر کھڑی ہو جاتی ہیں اور صاحب حاجت سے بدی کی مخلوق کو دور رہنے پر آمادہ کرتی ہے۔

درباری جوتشیوں اور ان عاملوں کے علاوہ بڑی رانی کو بھی علم ہو گیا تھا کہ باواجی مہاراجہ کے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے چلہ کاٹ چکے ہیں لہذا رانی نے ان عاملوں سے کہا کہ وہ اپنے بچائو کے علاوہ باواجی کو مارنے کی کوشش کریں۔ لہذا کالے عاملوں نے مل بیٹھ کر باواجی کے خلاف محاذ کھول دیا۔ اس دوران انہوں نے ہوشیار پور سے کالی کے مہا پجاری پنڈت رگھومل کو بھی بلا لیا۔

طرطوش اور باواجی کے موکلان انہیں پل پل کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ باواجی کو یہ خبر ملی کہ رگھومل بھی نیپالی عاملوں کے ساتھ آملا ہے تو انہوں نے آتوم اور طرطوش سے مشورہ کیا کہ انہیں اب کیا کرنا چاہیے؟

"کرنا کیا ہے باواجی سرکار! جس مندر میں بیٹھ کر یہ سارے کالے عامل سازش کر رہے ہیں کہیں تو اسے زمین سے اٹھا کر پلٹ دوں۔" آتوم جوش سے کہنے لگا۔

"آتوم ہمیں جذباتی ہونے کے بجائے باواجی کے تدبر کے مطابق کرنا ہو گا۔" طرطوش نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور سمجھایا۔ "اگرچہ تم بہت طاقت رکھتے ہو مگر یہ نہ بھولنا کہ ان کالے عاملوں نے اگر کوئی خطرناک جادو یا عمل کر دیا تو تم بھی اس سے نہ بچ سکو گے۔"

آتوم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ باواجی نے طرطوش کی ہاں میں ہاں ملا کر کہا۔

"طرطوش صحیح کہہ رہا ہے۔ اگر ہم نے مندر کو اس طرح الٹ دیا تو پوری ریاست میں خوف وہراس پھیل جائے گا۔"

باواجی کو آتوم کی طاقت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ واقعی اکیلا سارے عاملوں پر بھاری ہو سکتا ہے لیکن حکمت عملی کے تحت انہوں نے کھلی جنگ کرنے سے گریز کیا البتہ انہوں نے ان عاملوں کے خلاف حتمی قدم اٹھانے سے پہلے مہاراجہ کو ساری صورت حال بتادی اور کہا۔ "مہاراج سرکار! اس معاملے میں بڑی رانی ملوث ہے۔ وہ اس وقت بھی مندر میں ان عاملوں کے پاس موجود ہے جنہوں نے مہاراج سرکار کو زہریلا مسان کھلایا ہے۔"

یہ سنتے ہی مہاراجہ ہتھے سے اکھڑ گیا اور کڑک کر بولا۔ "نہال شاہ! تم اپنے کام کرو اور ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ راج پاٹ کے معاملے میں ہمیں معلوم ہے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ اس لئے ہم ابھی اور اسی وقت سپاہیوں کو مندر میں بھیج کر ان پاپیوں کا نشٹ مار دیں گے۔"

اس سے قبل کہ باواجی مہاراجہ کو کچھ سمجھاتے 'مہاراجہ نے تالی بجا کر دربان کو طلب کیا اور اسے محافظ اعلیٰ کو بلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ آگیا اور مہاراجہ کا حکم پاتے ہی اس نے سپاہیوں کو ساتھ لیا اور مندر پر حملہ بولنے چلا گیا۔

اس دوران باواجی واپس حویلی میں چلے گئے تھے۔ موکلان نے انہیں عجیب وغریب اطلاعات دیں لہذا انہوں نے طرطوش اور آتوم کو بلا کر مہاراجہ کے فیصلے سے آگاہ کیا اور انہیں بتایا۔ "مجھے یقین ہے سپاہی ان کالے عاملوں پر قابو نہیں پاسکیں گے۔"

"پھر کیا ہوگا؟" طرطوش نے پوچھا۔

"مجھے ان عاملوں کے خلاف قدم اٹھانے سے پہلے بہت سوچ بچار کرنی ہے۔ کیونکہ ابھی تک انہوں نے مجھ پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ اگر تو وہ کوئی ایسی حرکت کر دیتے تو اب تک میں انہیں جواب دے چکا ہوتا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ انہوں نے ابھی تک حملہ کیوں نہیں کیا؟" طرطوش نے ایک بار پھر دریافت کیا۔

"میرے موکلان نے مجھے آگاہ کیا ہے کہ رگھومل نے نیپالی عاملوں کو میری قوتوں سے آگاہ کر دیا ہے اور انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ ورنہ وہ پھر وہی آزمودہ طریقے استعمال کر کے مجھے مارنے کی کوشش کرتے۔"

"اگر سپاہی ناکام لوٹ آئے اور مہاراجہ نے آپ سے حتمی قدم اٹھانے کے لئے کہا تو پھر کیا کریں گے؟" اس بار نوردین نے سوال کیا تھا۔ باواجی جب پہلی بار یہاں آئے تھے تو نوردین کو ادھر ہی چھوڑ گئے تھے۔ وہ اب حویلی میں باواجی کے پاس ہی رہنے لگا تھا۔

"نوردین! تب مجھے واقعی آخری قدم اٹھانا پڑے گا۔ لیکن اس بار مجھے یقین ہے کہ یہ نیپالی عامل آسانی سے قابو میں نہیں آئیں گے۔ آتوم نے مجھے بتایا ہے کہ

ان عاملوں نے اپنے گرد حصار قائم کر لیا ہے اور اس کے لئے کافر جنات اور چڑیلوں کو بلا لیا ہے۔"

"اس سے کیا ہو گا سرکار! آپ پہلے بھی تو جانگلی وال کی چڑیلوں اور نمولیاں کے مندر کا حصار توڑ چکے ہیں اب کیا دشواری ہے۔" نور دین نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"اصل مسئلہ آتوم اور طرطوش کی وجہ سے پیش آ سکتا ہے۔" باوا جی نے انکشاف کیا۔ "یہ بھی جنات ہیں اور بے تحاشا علم اور طاقت رکھتے ہیں جبکہ کالے عاملوں کے کافر جنات بھی طاقتور قبیلوں سے لئے گئے ہیں۔ اس لئے اگر آتوم اور طرطوش نے حملہ کیا تو کافر جنات کالے عاملوں کا دفاع کریں گے جس سے قیامت آ جائے گی۔ پھر اس خونریز جنگ کو روکنا ممکن نہیں ہو گا۔ آتوم اور طرطوش اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ اگر یہ جنگ جنات کے درمیان چھڑ گئی تو ان کے قبیلے بھی اس جنگ میں کود پڑیں گے۔ پھر ظاہر ہے پوری ریاست طوفانوں کی زد میں آ جائے گی۔ لہذا ہمیں اس معاملے پر خاصی سوچ بچار کرنی ہو گی۔"

اسی لمحہ باوا جی کا ایک موکل حیرت انگیز خبر لے کر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کالے عاملوں نے مندر پر حملہ کرنے والے سپاہیوں کو اندھا کر دیا ہے۔ سپاہی جونہی مندر کے دروازے پر پہنچے تو سلگتی راکھ کا ایک سیاہ طوفان اٹھ کھڑا ہا تھا جس نے سپاہیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ سارے اندھے ہو گئے ہیں۔ مہاراجہ کو جونہی یہ اطلاع ملی وہ مزید سپاہی لے کر مندر کی طرف جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن مہارانی روپا نے اسے سمجھا بجھا کر روک لیا ہے اور اپنے محافظ کو آپ کی طرف بھیجا ہے جو کچھ ہی دیر تک یہاں پہنچنے والا ہے۔

اس سے پیشتر کہ مہاراجہ کا محافظ حویلی پہنچتا باوا جی نے اپنی پراسرار طاقتوں کو ساتھ لیا اور محل کی طرف چل دیئے۔ اس خبر نے ان کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔

محل میں پہنچتے ہی انہوں نے مہاراجہ سے کہا۔ "میں نے کہا تھا یہ کام سپاہیوں کے کرنے کا نہیں ہے۔ لیکن مہاراج سرکار نے ہماری بات نہیں مانی۔"

"مگر تم نے بھی تو اب تک کچھ نہیں کیا۔ ہمارے دشمن ہمارے ارد گرد پھیلتے جا رہے ہیں اور ابھی تک تمہارے چلے ہی پورے نہیں ہو رہے۔" مہاراجہ باوا جی کی بات سن کر بھڑک اٹھا۔ مگر باوا جی نے تحمل کے ساتھ جواب دیا:

"سرکار! وہ معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ان کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے مجھے بہت سے حفاظتی حصار قائم کرنے تھے جواب میں کر چکا ہوں اس کے باوجود مجھے آخری قدم اٹھانے سے پہلے بہت کچھ کرنا ہے۔"

"تم نے جو بھی کرنا ہے کرو۔ اس کے لئے جتنا دھن چاہیے ہمیں بتا دو۔" مہاراجہ نے اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "راج پاٹ کا پہلا اصول یہ ہے کہ

جونہی یہ معلوم ہو کہ مہاراج کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں تو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ان سازشوں کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ ہم اپنے راج سنگھاس کو زیادہ دیر تک دشمنوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔"

کالے کبوتروں کا ایک من خون

باواجی کے پاس اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ مہاراجہ کے دشمنوں پر حملہ کرنے کے لئے قدم اٹھائیں لہذا انہوں نے حویلی پہنچتے ہی اپنا سامان اٹھایا اور اس مندر کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سارے کالے عامل موجود تھے۔ آتوم اور طرطوش بھی ان کے ساتھ تھے۔ نوردین نے بھی ساتھ چلنے کی کوشش کی تھی مگر باواجی نے اسے حویلی میں ہی رہنے کا حکم دیا تھا۔

مندر سے ایک کوس کے فاصلے پر ویران سی جگہ تھی۔ یہ پہاڑی کا ایک ہموار قطعہ تھا جو دو میل تک پھیلا ہوا تھا۔ جابجا جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ وہاں سے مندر کا کلس دکھائی دیتا تھا۔ شام کا پہر تھا۔ باواجی نے وہاں چوکی لگانے کے لئے جگہ تیار کی اور پھر ایک بڑا سا دائرہ کھینچ کر حصار قائم کر دیا اور پھر خود اس کے اندر بیٹھ گئے۔ انہوں نے حصار کے باہر اپنے موکلان کو بٹھا دیا تھا جبکہ آتوم' طرطوش اور مستان باواجی کے پاس دائرے میں بیٹھ گئے تھے۔

باواجی نے آتوم سے کہا کہ وہ ایک بڑا سا تندور بنا دے اور اس میں مشک کافور چھڑک دے۔ آتوم نے پلک جھپکنے میں تندور بنا دیا اور ان میں مشک کافور چھڑک دی۔ ویرانے میں عجیب سی مہک چھا گئی۔ پھر انہوں نے صندل کی لکڑی جلانے کا حکم دیا اور کہا۔

"اس آگ میں اس وقت تک لکڑی ڈالتے رہنا جب تک ہم روک نہ دیں۔" طرطوش نے آگ جلانے کی ذمہ داری مستان پر ڈال دی اور وہ خود باواجی کے ساتھ مل کر چوکی لگانے لگے۔

جونہی صندل کی لکڑیوں نے آگ پکڑی۔ باواجی نے پڑھائی شروع کر دی۔ تندور کی آگ کسی آتش فشاں کی طرح اوپر اٹھنے لگے اور دائرے کے اندر اس کی حدت بڑھنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ آگ یونہی جلتی رہی تو کچھ ہی دیر میں آگ کا طوفان آجائے گا۔

باواجی نے پڑھائی کا ابتدائی دور ختم کیا اور طرطوش سے جلالی انداز میں کہا۔ "مجھے کالے کبوتروں کا ایک من خون چاہیے۔"

طرطوش نے عجیب سی نظروں سے باواجی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں سرخ آگ کا طوفان سا نظر آرہا تھا۔ اس نے آج سے پہلے باواجی کو جلال کی اس کیفیت میں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جھٹ سے گیا اور دس پندرہ منٹ بعد واپس آگیا۔ اس نے بڑا کنستر اٹھایا ہوا تھا۔ باواجی نے کچھ پڑھنے کے بعد کنستر پر پھونک ماری اور کہا۔

"اسے اب آگ میں پھینک دو۔" باواجی نے آنکھیں بند کر کے طرطوش کو حکم دینے لگے۔ "خود آگ کے قریب نہ جانا ورنہ جل جائو گے۔ خون کو کنستر

سمیت ہی پھینک دو۔"

"آتوم باواجی کے اس عمل کو سمجھتا تھا وہ جانتا تھا کہ باواجی نے کافر جنات کو مارنے اور ان کی طاقتیں سلب کرنے کے لئے یہ عمل کیا ہے۔

"آتوم اور طرطوش تم دونوں حصار سے باہر چلے جائو۔ مستان کو بھی لے جائو۔ جب میں آواز دوں تب آنا۔"

آتوم اور طرطوش مستان سمیت حصار سے باہر چلے گئے اور باواجی خود آگ کے تندور کے پاس جا کر یوں بیٹھ گئے جیسے آگ تاپنے کے لئے بیٹھے ہوں۔ وہ مسلسل پڑھائی کر رہے تھے اور ساتھ آگ پر پھونکیں مارتے جا رہے تھے۔ پھر وہ کھڑے ہو گئے اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر یوں کھڑے ہو گئے جیسے آگ سے گلے ملنے کے لئے اسے پکار رہے ہیں۔

"آئو کالے بدبختو آئو... کافرو ادھر آئو۔ آج میں تمہیں تمہاری آگ سے ہی جلا دوں گا۔" ان کا یہ کہنا ہی تھا کہ ویران خطے میں جیسے بھونچال آ گیا۔ جدھر سے مندر کا کلس دکھائی دے رہا تھا۔ سیاہ چمگادڑوں کا ایک بہت بڑا غول اس طرف آنے لگا۔ ان کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ لمبی لمبی زبانیں بھی سرخ تھیں اور ان سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ چیختی ہوئی کہہ رہی تھی: "ہم آ رہی ہیں آج ہم تمہارا خون پی جائیں گی۔' لیکن ان بدبخت سیاہ چمگادڑوں کی یہ حسرت ہی رہی۔ وہ جونہی حصار کے قریب پہنچیں ایک دم دیوانی سی ہو گئیں۔ فضا میں یکلخت ایک عجیب سی سرانڈ اٹھی تھی اور اس کے ساتھ ہی تندور کی آگ کئی سو فٹ تک بلند ہو گئی۔

"آئو اور میرا خون پیو حرامزادیو۔" باواجی دھاڑے تو سیاہ چمگادڑیں دیوانگی میں کہنے لگیں:

"نہال شاہ! ہمیں راستہ دیدو۔ تمہیں تمہارے رب کا واسطہ۔" وہ دیوانہ وار حصار کے گرد چکرانے لگیں۔ یہ سرانڈ کالے کبوتروں کے خون سے پیدا ہوئی تھی۔ سیاہ چمگادڑیں جو دراصل چڑیلیں تھیں انہیں یہ سرانڈ بہت بھاتی ہے۔ وہ اس کی بو لینے کے لئے دیوانی ہو جاتی ہیں۔

باواجی نے اپنی انجیر کی پرانی شاخ کو حصار کیطرف کیا اور کہا۔ "انہیں اندر آنے کا راستہ دے دو۔"

باواجی کا حکم پاتے ہی ان کے موکلان نے حصار کا ایک دروازہ کھول دیا اور دیوانی سیاہ چمگادڑیں اپنے بھیانک اور اصل روپ میں آ گئیں۔ ان کی بس یہی غلطی تھی۔ حصار سے باہر انہیں آگ دکھائی نہیں دی تھی۔ لہذا جونہی وہ حصار میں داخل ہوئیں باواجی نے موکلان کو حکم دیا۔ "دروازہ بند کر دو۔"

حصار کا دروازہ بند ہوتے ہی چڑیلیں بے بسی کے عالم میں یوں فلک بس آگ ہیں گرنے لگیں جیسے اونچے اونچے پہاڑوں سے کوئی پتھر گرتا ہے تو نیچے گرتا چلا جاتا ہے۔ چڑیلوں کا سارا غول تندور کی آگ کی نذر ہو گیا اور اس کی آگ خون آشام درنگی کے ساتھ بے صبری کے ساتھ اور بڑھنے لگی۔

ادھر مندر میں بیٹھے کالے عاملوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ کالی چڑیلیں نہال شاہ کی چوکی کی نذر ہو گئی ہیں لہذا انہوں نے اپنے جنات کو حکم دیا کہ وہ حصار کو توڑ کر نہال شاہ کو اٹھا لائیں۔ کافر جنات کا ایک جتھہ باوا جی کے حصار کی طرف بڑھا تو آتوم انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور طرطوش سے کہنے لگا: "میں ان کو جانتا ہوں۔ یہ ناگر قبیلے کے جن ہیں۔ ان کو مارنا کوئی مشکل نہیں ہے آئو ان سے دو دو ہاتھ کریں۔"

"نہیں آتوم۔ باوا جی نے ہمیں منع کیا ہوا ہے۔" طرطوش نے کہا۔ "وہ اس بات پر ناراض ہوں گے۔ ممکن ہے ہمارے لڑنے سے ان کا کوئی عمل الٹ پڑ جائے۔"

"میں باوا جی کو سمجھا لوں گا۔ تم اگر ان کے ساتھ نہیں لڑنا چاہتے تو نہ لڑو۔ مگر میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔" آتوم یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور کافر جنات کے جتھے کو دیکھ کر للکارنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ برق کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ باوا جی نے جونہی دیکھا کہ آتوم ان کی اجازت کے بغیر جنات سے لڑنے چلا گیا ہے تو انہیں بے تحاشا غصہ آیا۔ وہ جلال کے عالم میں اٹھے اور بے اختیار ہو کر حصار سے باہر نکل گئے۔ باوا جی نے جونہی حصار سے باہر قدم رکھا تندور کی آگ یکدم بجھ گئی اور ہر سو اندھیرا چھا گیا اور چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ باوا جی کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ حصار سے باہر آ کر جنات کا مقابلہ کریں۔ لیکن باوا جی کے لئے کھلے عام جنات کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ اس دوران طرطوش اور مستان نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا اور ان کے گرد حصار قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر کافر جنات کی بھاری جمعیت نے وہ حصار توڑ دیا اور باوا جی پر ہلہ بول دیا۔

باوا جی نہال شاہ نے خود کو بچانے کی بے حد کوشش کی اور طرطوش کو حصار کے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ لیکن طرطوش نے انہیں بتایا کہ حصار کے اندر اب جانے کا کوئی فائدہ نہیں رہا کیونکہ تندور کی آگ بجھ چکی ہے۔ یہ سن کر باوا جی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور پژمردگی کے تاثرات ابھرے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ انجیر کی شاخ کو اپنے ارد گرد گھما کر خود کو کافر جنات سے بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے زیادہ دیر تک جم کر نہ لڑ سکے۔ کافر جنات نے باوا جی کی ٹوٹتی ہوئی مزاحمت سے فائدہ اٹھایا اور جھٹ سے ان کی چھڑی چھین لی پھر انہیں پکڑ کر فضا میں غائب ہو گئے۔ باوا جی کو یوں لگا جیسے وہ کسی پہاڑ کی سر بفلک چوٹی سے کسی گہری تاریک کھائی میں گرتے چلے جا رہے ہوں۔ وہ خود کو بچانے کے لئے ہاتھ پائوں چلا رہے تھے۔ اس لمحے وہ کسی کلام سے بھی استفادہ نہ کر سکتے تھے۔ ان کا سر چکرانے لگا تھا اور وہ بیہوش ہو گئے۔

باوا جی کی آنکھ کھلی تو انہوں نے خود کو بے بس حالت میں پایا۔ ان کے ہاتھ پائوں باندھ دیئے گئے تھے اور منہ کے اندر بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا تاکہ وہ کوئی علم نہ پڑھ سکیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کافر جنات ان پر غلبہ پا لیں گے 'لیکن اپنی ذرا سی جذباتی غلطی کے باعث وہ ان کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ اگر وہ حصار سے باہر نہ آتے تو یقیناً اپنے دشمنوں پر غالب آ جاتے مگر آتوم کے غلط فیصلے نے انہیں بھی حصار سے باہر آنے پر مجبور کر دیا۔ طلسمات کی دنیا کا سب سے بڑا اور بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ جب بھی کوئی عامل چلہ کاٹتا ہے یا چوکی لگاتا ہے تو وہ اپنے گرد حصار قائم کر لیتا ہے۔

حصار

حصار کیا ہوتا ہے اور یہ کیوں ضروری ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں چند انتہائی اہم معلومات پیش کر رہا ہوں... حصار پراسرار نادیدہ دنیا اور ظاہری دنیا کے درمیان ایک غیر مرئی دیوار قائم کر دیتا ہے۔ جب بھی کوئی انسان مخفی علوم سیکھنے کیلئے چلہ یا مراقبہ کرتا ہے تو اپنے مرشد یا گرو کی اجازت یا اسکی موجودگی میں اپنے گرد ایک دائرہ کھینچ لیتا ہے اور خود اس کے اندر بیٹھ کر عمل یا وظائف ادا کرتا ہے۔ جب تک یہ عمل یا وظائف پورے نہیں ہو جاتے وہ شخص حصار سے باہر نہیں آتا۔ بعض اوقات کوئی عامل یا روحانی علوم کا ماہر شخص مجلس کے درمیان کسی پراسرار قوت کو ظاہر کرنے کیلئے بھی ایک بڑا حصار کھینچ دیتا ہے تاکہ وہ غیر مرئی مخلوق (بے شک وہ مسلمان ہو یا کافر) مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو گزند نہ پہنچا سکے۔

اللہ تعالیٰ کے انتہائی برگزیدہ بندوں کی ایسی بے شمار مثالیں ہیں جو یادالٰہی میں مستغرق رہتی تھیں مگر وظائف سے قبل اپنے گرد حصار قائم کر لیتی تھیں۔ اس بارے میں بزرگوں کا کہنا ہے کہ جب ایک برگزیدہ شخص وظائف کا ورد کرتا ہے تو اس پر ظاہری اور مخفی دنیا آشکار ہو جاتی ہے۔ اس کے علوم کی طاقت اور لہریں اس مخلوق کو تنگ بھی کرتی ہیں اور انہیں طاقت بھی دیتی ہیں۔ (مسلمان جنات قرآنی علوم کے ورد اور تلاوت سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔) لہٰذا ان حالات میں اگر اس برگزیدہ شخص نے اپنے گرد حصار قائم نہ کیا ہو تو بعض اوقات طاقتور شیطانی قوتیں اسے تنگ بھی کرتی ہیں۔

مسلمان عاملین اور اللہ کے برگزیدہ بندے کلام الٰہی کی مدد سے حصار کھینچتے ہیں، جبکہ غیر مسلم عاملین حصار بنانے کیلئے انتہائی مکروہ اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ مسلمان عاملین حصار بنانے کیلئے جہاں وظائف کا استعمال کرتے ہیں وہاں یہ تاریخی مثال بھی پیش کرتے ہیں کہ ایک بار رسول پاک ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے گرد بھی حصار قائم کیا تھا۔ طبرانی اور ابو نعیم کی روایات کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپسی میں نخلہ میں ٹھہر گئے تھے۔ نصف شب کے قریب حضور پاک ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ نصیبین (جنات کا قبیلہ) کے سات جن حسا، مسا، شاصرہ، ناصرہ، ابن الارب، امین، اخضم آئے اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت سنی اور اسلام لے آئے۔ پھر واپس جا کر اپنی قوم میں تبلیغ اسلام کرنے لگے (قرآن کریم میں سورۂ جن میں اس واقعے کا ذکر ہے) جنات میں یہ پہلے ساتھ افراد تھے جو سب سے پہلے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔

کعب احبار کے مطابق جب نصیبین کے یہ سات جن اسلام قبول کر کے بطن نخلہ سے اپنی قوم میں واپس آئے تو تین سو جنوں کا وفد حجون میں آ کر رکا۔ احقب نامی جن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام کیا اور عرض کیا:

"یارسول اللہ ﷺ" ہمای قوم کا ایک وفد آپ ﷺ سے ملاقات کیلئے حجون میں حاضر ہوا ہے۔ شرف باریابی عطا فرمایئے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"رات کو حجون میں ملاقات ہو گی"

حضرت انس اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جنوں کا ایک وفد مکہ میں آیا تو رسول پاک ﷺ نے فرمایا:"میرے ساتھ صرف وہ شخص چلے جس کے دل میں ذرہ بھر آلودگی نہ ہو۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیذ سے بھرا ہوا ایک برتن لیا، یہاں تک کہ جب ہم حجون پہنچے تو آنحضرت ﷺ نے مجھے ایک جگہ بٹھا کر میرے ارد گرد خط (حصار) کھینچ دیا اور فرمایا:

"جب تک میں واپس نہ آئوں، یہیں ٹھہرے رہو"۔اس کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جنات کی طرف تشریف لے گئے۔ میں نے دیکھا جنات آپ ﷺ کے پاس ہجوم کر رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ ان سے رات بھر باتیں کرتے رہے۔ صبح کے وقت حضور ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے دریافت فرمایا:"تم رات بھر کھڑے رہے ہو؟"

میں نے عرض کیا"یارسول اللہ ﷺ آپ نے حکم فرمایا تھا۔"

پھر سرکار دوجہاں ﷺ نے پوچھا"تمہارے پاس وضو کے لئے کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا"یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس صرف نبیذ ہے۔"

فرمایا:"کھجور بھی پاک ہے اور پانی بھی پاک ہے۔"پھر آپ ﷺ نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کیلئے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں جنات کے دو آدمی آپ ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا:

"یارسول اللہ ﷺ! ہم اس امر کو درست سمجھتے ہیں کہ نماز میں آپ ﷺ ہماری امامت کریں۔"

رسول خدا ﷺ نے نماز فجر میں جنات کی امامت کی۔ آپ ﷺ نے نماز میں تبارک الذی اور سورہ جن تلاوت کیں۔

اس واقعے سے حصار کی افادیت مسلمہ ہو جاتی ہے کہ جب رسول پاک ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو جنات کے شر سے بچانے کیلئے دائرے کے اندر رہنے کا حکم دیا تھا تو اس میں کوئی حکمت ہی شامل تھی۔

ہندو اور عیسائی عاملین عملیات کے دوران جب حصار قائم کرتے ہیں تو عموماً کسی ناپاک جانور کے کولہے کی ہڈی اور اس کا سفوف استعمال کرتے ہیں۔ اس ہڈی پر کالے جادو کے منتر پھونکے ہوتے ہیں۔ چونکہ ہندو اور عیسائی عاملین کا سارا علم ہی کالے علوم پر مبنی ہوتا ہے، لہٰذا انہیں کوئی بھی چلہ کاٹنے یا عمل

کرنے سے پہلے شیطان کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ یہ عاملین جانور کی ہڈی کی مدد سے ایک دائرہ نما لکیر کھینچ کر اس کے اندر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر جاپ میں لگ جاتے ہیں۔

عملیات اور پراسرار دنیا میں حصار کے حوالے سے یہ بات بڑی عجیب ہے کہ جب کوئی کالے علم کا پجاری اپنے گرد حصار قائم کر کے خود کو بلاؤں سے محفوظ کر لیتا ہے تو اس کا یہ حصار کوئی بھی مسلمان (اگر اس کا ایمان پختہ ہے) توڑ دیتا ہے جبکہ کسی باعمل مسلمان عامل (جو غیر شرعی احکامات بجا نہ لایا) یا اللہ کے نیک بندے کا حصار توڑنا کالے علم کے پجاریوں کے بس کی بات نہیں۔ کالے علم کے پجاری اپنی اس کمزوری سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں مگر شیطان انہیں حصار کو مضبوط بنانے کیلئے زیادہ سے زیادہ مکروہ حرکات کرنے پر مجبور کرتا ہے اور انہیں قائل کرتا ہے کہ وہ اگر فلاں مکروہ حرکت کریں تو ان کی شکتی میں اضافہ ہو گا۔ شیطان کے یہ بہکاوے ہی دراصل کالے علم کے پجاریوں کا دھرم ہوتے ہیں۔

ہمارے باواجی ہمیشہ سے چلے اور چوکی کے پکے تھے مگر انسان تو خطا کا پتلا ہے، کبھی نہ کبھی اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ سونیپالی عاملوں نے انہیں حصار سے باہر آنے پر مجبور کر ہی دیا تھا۔

باواجی ایک تاریک اور انتہائی بدبودار جگہ پر قید تھے۔ گھپ اندھیرے میں انہیں اپنے وجود کا کوئی حصہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس متعفن ماحول میں سانس لینا بھی دوبھر ہو چکا تھا۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اس تاریکی میں کسی کی بوجھل سانسوں کا احساس ہوا تو انہیں اندھیرے میں کچھ سائے حرکت نظر آنے لگے۔ جب انہوں نے ارتکاز توجہ سے کام لیا تو وہ سارے ہیولے واضح ہو گئے۔ باواجی بول نہیں سکتے تھے مگر جب ان کی آنکھوں نے تاریکیوں کو پڑھنا شروع کیا تو ان کے قلب و ذہن میں ہم آہنگی اور یکسوئی پیدا ہوئی اور انہوں نے دل میں وظائف کا ورد شروع کر دیا۔ نوری اور نورانی علوم کے ماہر عاملوں پر خدا کا سب سے زیادہ فضل ہی یہ ہوتا ہے کہ مسلمان ہونے کے ناتے ان کے قلب و ذہن کی عبادت بھی قبول ہوتی ہے۔ ان کیلئے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ جن علوم کا ورد کرنا چاہتے ہیں انہیں زبان سے ہی ادا کریں۔ اگر وہ قلب و ذہن میں یکسوئی کے ساتھ وظائف و عملیات کا ورد کریں تو ان کے اثرات ظاہر ہونے لگتے ہیں جبکہ کالے عاملوں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کفر کا قفل لگا دیتا ہے۔ انہیں اپنے عملیات کیلئے زبان چلانی پڑتی ہے۔ اگر کسی کالے جادو کے عامل کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا جائے تو اس کا سارا علم بے کار ہو جاتا ہے۔ منہ بند ہونے کی وجہ سے وہ اپنی پراسرار قوتوں کو پکارنے کیلئے جاپ نہیں کر سکتا۔

باواجی جوں جوں دل میں وظائف پڑھ رہے تھے تاریکیوں میں اجالے پیدا ہونے لگے اور حیرت انگیز طور پر وہ رسیاں ڈھیلی پڑنے لگیں جن سے ان کو باندھا گیا تھا۔ انہیں یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ انہیں طلسماتی دھاگوں سے باندھا گیا ہے، لہٰذا انہوں نے خود کو ان کے سحر سے مکمل طور پر آزاد کرانے کیلئے وظائف جاری رکھے اور پھر ان طلسماتی دھاگوں کو ذہن میں لا کر خیالی پھونک مار دی۔ اس کے ساتھ ہی طلسماتی دھاگے ٹوٹ گئے۔ باواجی نے خود کو آزاد کراتے ہی سب سے پہلے اپنے منہ سے کپڑا نکال کر دور پھینک دیا اور اپنے پورے جلال کے ساتھ اندھیرے میں چوکی لگا کر بیٹھ گئے۔

پدمنی کا پیار

تاریکیوں میں لہراتے ہوئے سائے باواجی کو آزاد ہوتے ہوئے دیکھ کر چیخ وپکار کرنے لگے۔اس کے ساتھ ہی عجیب سی گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر یوں لگا جیسے بہت سارے لوگ اشلوک پڑھتے ہوئے اس اندھیری کوٹھڑی کی جانب دوڑے چلے آرہے ہوں۔ باواجی اب ہر غیر متوقع صورتحال سے نمٹنے کیلئے تیار بیٹھتے تھے۔اس سے قبل کہ اندھیری کوٹھڑی کا کوئی دروازہ کھلتا،انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے جلالی موکلین کو طلب کر لیا۔

ہر عامل چاہے وہ کالے علم کا پجاری ہو یا نوری علم کا،اس کے موکلین ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ پانچ قسم کے ہوتے ہیں۔ موکل علوی جمالی، موکل علوی جلالی، موکل سفلی جمالی، موکل سفلی جلالی اور موکل قدسی۔ موکل قدسی کو اہل تقویٰ اور انتہائی برگزیدہ لوگ ہی تابع کر سکتے ہیں جبکہ موکل علوی جلالی اور جمالی کو صحیح العقیدہ مسلمان تابع کر سکتے ہیں۔ دوسرے موکلین کو کوئی بھی تابع کر سکتا ہے۔ موکل اپنے مخصوص کلمات کے تحت ہی تابع ہو سکتے ہیں اور عامل کا حکم بجالاتے ہیں۔

باواجی نے موکل علوی جلالی و جمالی تابع کیے ہوئے تھے اور وہ ان کا ہر حکم بجالاتے تھے۔ یہ موکلین بعض حالات میں جنات سے بھی زیادہ طاقتور ہوتے ہیں، خاص طور پر کافر جنات تو انہیں دیکھتے ہی بھاگ جاتے ہیں۔

موکلین کے حاضر ہوتے ہی باواجی نے انہیں حکم دیا"مجھے بتائو میں اس وقت کہاں ہوں؟"

موکل علوی جمالی نے قہر آلود نظروں سے اپنے گرد و پیش میں دیکھا تو اس کی نظریں دیواروں کو چیرتی ہوئی دور دور تک چلی گئیں۔اس نے گرجدار آواز میں کہا:"باواجی سرکار! آپ کالے عاملوں کے قبضے میں ہیں اور یہ مندر کا ایک تہہ خانہ ہے جہاں اس وقت آپ موجود ہیں۔"

اشلوک اور گھنٹیوں کی آوازیں اب بہت قریب آگئی تھیں۔ باواجی موکل علوی جلالی سے مخاطب ہوئے:"پتہ کرو یہ کون لوگ ہیں"

اس سے پیشتر کہ موکل کچھ بتاتا،اندھیری کوٹھڑی یک لخت روشن ہو گئی اور بدروحوں کا ایک غول اندر وارد ہو گیا۔ان سب کے ہاتھوں میں روشن دیئے تھے۔انہیں دیکھتے ہی باواجی نے ایک عمل پڑھا اور ان کی طرف منہ کر کے پھونک مار دی۔ ہوا کا ایک بگولا سا پیدا ہوا اور آناًفاناً تمام دیئے بجھ گئے لیکن دوسرے ہی ثانیے میں ایک بار پھر جل اٹھے۔اس بار ان کی روشنی پہلے سے تیز تھی۔ باواجی نے ایک بار پھر روشن دیئے بجھانے کیلئے پھونک مارنی چاہی تو ان کے کانوں میں ایک کرخت نسوانی آواز پڑی:

"نہال شاہ! تم ساری عمر بھی پھونکیں مارتے رہو گے تو یہ دیئے نہیں بجھ سکتے۔ یہ پھر جل اٹھیں گے۔"

باواجی نے دوسری بار پھونک مارنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سخت لہجے میں پوچھا: "تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو؟"

"میں دیوتائوں کی داسی ہوں۔ میرا نام پدمنی ہے۔" وہ تمام حشر سامانیوں کے ساتھ باواجی کے قریب آئی تو اس کے گرد کھڑی چڑیلوں نے دیئے اوپر کر دیے۔ پدمنی سیاہ لبادے میں ملبوس تھی۔ دیئے کی روشنیوں میں اس کا چہرہ نمایاں ہو گیا وہ غیر معمولی حسن کی مالک تھی۔ باواجی دم بخود اسے دیکھتے رہ گئے۔

"کیا تم انسان ہو؟" باواجی نے خیال انگیز لہجے میں پوچھا۔

"نہال شاہ! کیا تم یہ نہیں جان سکتے کہ میں گوشت پوست کی بنی ہوئی ایک عورت ہوں" پدمنی نے طنز کیا۔ "یقین کرنا چاہتے ہو تو مجھے چھو کر دیکھ لو۔" اس نے اپنا مخروطی ہاتھ آگے کر دیا۔

باواجی بے اختیار اس کا ہاتھ چھونے لگے تو ان کے موکل جلالی نے ان کا ہاتھ اپنے قابو میں کر لیا۔ "باواجی! یہ کیا کرنے لگے ہیں۔ آپ شیطان کی پجارن کو چھو کر اپنے نفس کے جھانسے میں آجائیں گے۔"

پدمنی نے یہ سنا تو مکروہ قہقہہ لگا کر بولی: "نہال شاہ! تمہارا موکل بڑا چالاک ہے، اس نے تجھے بروقت بچا لیا۔ اگر تم مجھے چھو لیتے تو میں تم پر غالب آجاتی۔"

اس لمحے باواجی کو خود پر بے تحاشا غصہ آیا کہ وہ اس عورت کی صرف ایک بات پر بے بس کیوں ہو گئے تھے۔ انہیں اپنے مرتبے اور حالات کی سنگینی کا احساس ہوا تو انہوں نے پدمنی سے سخت انداز میں باز پرس کرنا چاہی مگر پدمنی نے انہیں چکرا کر رکھ دیا اور انہیں بتایا:

"نہال شاہ! مجھے تمہاری سیوا کیلئے بھیجا گیا ہے۔ ہمارے مہمان پجاری چاہتے ہیں کہ تم ان کے راستے سے ہٹ جائو اور خاموشی سے اپنے دیس چلے جائو۔ اگر تم نے یہ بات نہ مانی تو وہ تمہیں یہاں ترسا ترسا کر مار دیں گے۔"

باواجی بولے: "مجھے تمہاری سیوا کی ضرورت نہیں اور نہ میں شیطان کے پجاریوں کے آگے جھک سکتا ہوں۔ تم اپنے پجاریوں کو یہ بات بتا دو کہ نہال شاہ کو قید کرنا اس قدر آسان نہیں۔" پھر انہوں نے اپنے موکل سے کہا: "تم جائو اور جا کر طرطوش اور آتوم کی خبر لائو۔"

اس پر موکل جلالی کہنے لگا: "باواجی! جنات ہماری مدد نہیں کر سکیں گے۔ اگر انہوں نے مندر میں گھسنے کی کوشش کی تو وہ جل کے راکھ ہو جائیں گے۔"

باواجی کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا کہ جنات پراسرار قوتوں کے حامل ہونے کے باوجود اپنے قبائل اور مافوق الفطرت عناصر کے پابند ہوتے ہیں۔ اگر انہوں نے مندر کی پراسرار حدود میں گھسنے کی کوشش کی تو ابلیسی قوتیں ان سے ٹکرا جائیں گی جس سے ان کے دوستوں کی زندگیاں ختم ہو جائیں گی۔ انہیں

اس لمحے آتوم پر بے تحاشا غصہ آیا کہ اس نے ان کے حکم کی خلاف ورزی کر کے انہیں دشمنوں کے ہتھے چڑھا دیا تھا۔ انہوں نے اپنے حالات کا جائزہ لینے کے بعد پدمنی سے کہا: "تم یہاں سے چلی جاؤ، مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔"

"میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جا سکتی جب تک میرے گرو مجھے واپس نہیں بلا لیتے۔"

"تم یہاں رہ کر کیا کرو گی؟" باواجی نے ناگواری سے پوچھا۔

"میں تمہیں ہر اس عمل سے روکوں گی جو تم ہمارے دیوتاؤں کے خلاف کرو گے۔" پدمنی ٹھوس لہجے میں بولی تو باواجی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے پوچھا: "کیا تمہارے پاس اتنی قوت ہے کہ تم مجھے وظیفہ کرنے سے روک سکو؟"

"ہاں... میں کالی کی پجارن ہوں۔ میں تمہیں پلید کر دوں گی۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے پدمنی!" باواجی ہاتھ جھٹک کر بولے۔ "اگر تم نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں رہو گی۔ تمہیں مارنے کے بعد میں سمجھوں گا کہ شیطان کی پجارن ایک عورت میرے ہاتھوں ماری گئی ہے۔"

"تو پھر اپنی شکتی آزما کر دیکھ لو۔" پدمنی نے باواجی کو اکسایا۔

باواجی نے جلالی انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "دیکھو میں شعبدہ باز نہیں۔ مجھے آزمانے کی کوشش نہ کرو۔" لیکن پدمنی بھی اپنی ہٹ کی پکی تھی۔ وہ باواجی سے چند قدم کے فاصلے پر دھرنا مار کر بیٹھ گئی۔ اس کی چڑیلیں اس کے گرد حصار بنا کر کھڑی ہو گئیں۔

باواجی کیلئے اب چوکی لگا کر پدمنی کے مقابل بیٹھنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ چوکی لگانے سے پہلے وہ اپنے گرد حصار کھینچنے لگے تو وہ عجیب ہذیانی انداز میں قہقہے لگانے لگی۔ باواجی نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ تمسخر اڑاتے ہوئے بولی:

"نہال شاہ! مندر کی جگہ پر حصار کھینچ رہے ہو۔ یہ پلید مٹی تمہاری حفاظت نہیں کرے گی۔ اپنی حفاظت کیلئے کوئی اور طریقہ اختیار کرو۔" باواجی عملیات کی دنیا کے خوگر تھے۔ وہ پدمنی کی بات سن کر گویا ہوئے:

"خبیث عورت! مٹی کبھی پلید نہیں ہوتی۔ تو مجھے گمراہ کرنے کی کوشش نہ کر۔" یہ کہہ کر وہ حصار کا دائرہ لگانے لگے تو یک لخت انہیں محسوس ہوا کہ جیسے ان کے بدن پر کوئی گیلی چیز آ گری ہو۔ دیئے کی روشنی میں انہیں اپنے کپڑوں پر گرنے والا سیاہی مائل سیال مادہ نظر آ گیا۔ انہوں نے انگلی لگا کر اسے دیکھنا چاہا تو ایک بدبودار جھونکا ان کے نتھنوں سے ٹکرایا اور وہ بے اختیار تھوک کر چلائے:

"بدبخت عورت اپنی گندی چڑیلوں سے کہو اپنا گند یہاں نہ پھیلائیں۔"

پدمنی نے جواب میں مکروہ قہقہہ لگایا اور کچھ نہ بولی۔ باواجی کے سفید کپڑوں پر چڑیلوں نے اپنا فضلہ پھینک دیا تھا۔ یہ گندگی سیاہی مائل چکنی مٹی کی طرح ہوتی ہے۔ بہت سے کالے عامل کسی گھر میں نحوست اور نجاست پھیلانے کیلئے چڑیلوں کی گندگی (فضلہ) اور ناپاک جانوروں اور پرندوں کا خون (کتے، سور اور الو کا لہو جادو ٹونہ کیلئے استعمال کیا جاتا ہے) جسے جادو کروانے والے اپنے دشمن کے گھر میں پھنکواتے ہیں۔ لوگ اسے خون کی بارش سمجھتے ہیں۔ خون کے یہ چھینٹے یا چڑیلوں کی گندگی کے چھینٹے کسی انسان پر پڑ جائیں تو عاملوں کے حساب سے وہ نحوست کا شکار ہو جاتا ہے اور پاکیزہ ہونے کیلئے باقاعدہ طہارت کرائی جاتی ہے۔

پدمنی نے باواجی پر بڑا اوچھا وار کیا تھا، لہٰذا وہ بے بسی سے تلملا کر رہ گئے کیونکہ وہ نجاست کے باعث قرآنی آیات کا ورد نہیں کر سکتے تھے۔ نوری علم کے عاملوں کو ہر وقت باوضو رہنا ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں ان کا علم کمزور پڑ جاتا ہے۔ باواجی نے چوکی لگانے کا ارادہ موقوف کیا اور اپنے جلالی موکل سے پوچھنے لگے: "تم اس وقت کیا محسوس کر رہے ہو؟"

جلالی موکل بھی ان کی طہارت کے ختم ہونے کے باعث کمزور ہو گیا تھا۔ موکلان جنات کی طرح کی مخلوق نہیں ہوتے۔ یہ دراصل عامل کے علوم کے تابع ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پراسرار دنیا کا نظام بھی نہایت پراسرار بنایا ہے مگر انسان کو اس پر برتری دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی انسان مخفی علوم کی طاقت حاصل کر لیتا ہے وہ حسب استطاعت اپنے ہمزاد یا موکلان پیدا کر لیتا ہے۔ عملیات کرنیوالے اکثر عامل حضرات اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ جنات کے ذریعے سائل کے مسائل حل کراتے ہیں، حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہوتا ہے۔ جنات پر قابو پانا بہت مشکل کام ہے، البتہ یہ عامل موکلان کو اپنا مطیع کر لیتے ہیں جو ان کیلئے خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔

باواجی اپنے موکل کی مجبوری سمجھتے تھے، لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اگر ان کی طہارت کا وقت گزر گیا تو ان کا موکل جلالی بھی کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ اس لیے انہوں نے موکل جلالی کی حاضری ختم کر دی اور خود تنہا طلسم کدے میں پدمنی کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرنے لگے لیکن ان کے ذہن میں کوئی ایسی تدبیر نہ آئی جس کے باعث وہ فوری طور پر ان خبیثوں سے نجات حاصل کر پاتے۔

اس سوچ بچار میں ایک پہر کٹ گیا۔ پدمنی اس دوران باواجی کے ساتھ شرارتوں میں الجھتی رہی اور باواجی اس سے اپنا دامن بچاتے رہے، البتہ اس کشمکس کے باعث انہیں چلبلی اور دیومالائی حسن کی مالک پدمنی کی قربت گوارا لگنے لگی تھی، اسلیئے کہ پدمنی نے ابھی تک کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس سے ان کی جان کو خطرہ لاحق ہوتا۔ وہ اس بات پر حیران بھی تھے کہ پدمنی اور مندر کے پجاری ان کے ساتھ کوئی حتمی فیصلہ کیوں نہیں کر رہے۔ اصولی طور پر تو انہیں اب تک باواجی کو مار دینا چاہیے تھا مگر کافی وقت گزر جانے کے باوجود وہ باواجی سے رعایت برت رہے تھے حالانکہ اب وہ طلسمی بندشوں سے بھی آزاد ہو چکے تھے۔ باواجی نے اس بارے میں بہت کچھ سوچا مگر انہیں کچھ سمجھ نہ آئی کہ کالے پجاری ان کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اس دوران دوسرا پہر بھی

کٹ گیا۔ لیکن سوائے پدمنی کے ابھی تک کوئی اور شیطان ان تک نہیں پہنچا تھا۔ باواجی اب اپنے اندر نقاہت بھی محصوس کرنے لگے تھے، اگرچہ انہیں اپنی بھوک پر قابو تھا مگر بدن میں بڑھتی ہوئی ناتوانی کے باعث اپنے دشمنوں سے مقابلہ کرنے میں دشواری محسوس کر سکتے تھے۔ باواجی نے اپنی قوتوں کو مجتمع کیا اور مکمل یکسوئی کے ساتھ عملیات پڑھنے لگے لیکن دوسرے ہی لمحے انہیں ذہنی طور پر شدید دھچکا لگا اور یہ انکشاف ہوا کہ وہ علوم کی پراسرار قوتوں سے فیض یاب نہیں ہو رہے۔ انہیں محسوس ہوا جیسے ان کے دل کی طہارت بھی ختم ہو گئی ہے۔

وہ سوچنے لگے کہ کہیں ان سے کوئی ایسی غیر شرعی حرکت تو سرزد نہیں ہو گئی جس کی وجہ سے غیبی طاقتیں ان کی مدد نہیں کر رہیں۔ باواجی نے ایک بار پھر یکسوئی کے ساتھ اپنا محاسبہ کیا تو انہیں یہ خیال ترک کر دینا پڑا کہ ان کے علوم کی طاقتیں جواب دے چکی ہیں۔ یہ ان کا واہمہ تھا۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے ہی انہوں نے طلسمی دھاگوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے علوم سے استفادہ کیا تھا اور اپنے موکل کو بھی طلب کر لیا تھا۔ اگر ان کے علوم بے بس ہو چکے تھے تو وہ طلسمی دھاگوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی موکل جلالی کو بلا سکتے تھے۔ آخر اب ان کے علوم کی طاقت سلب کیوں ہو گئی تھی۔ کیا چڑیلوں کی گندگی کے باعث وہ ناپاک ہو گئے تھے اور اس کی نحوست کے باعث غیبی طاقتوں کی پاکیزگی ختم ہو گئی تھی۔ باواجی جوں جوں اس بارے میں سوچتے ان کا ذہن الجھتا چلا گیا۔ وہ خود کو پدمنی کے سامنے لاچار سمجھ چکے تھے۔ ان پر اب بھوک نے بھی غلبہ پالیا تھا اور وہ نقاہت محسوس کر رہے تھے۔ بھوک کے باعث انکی یکسوئی کا عمل بھی متاثر ہو رہا تھا۔ ایک بار ان کے دل میں آیا کہ پدمنی سے کہہ کر کھانے کیلئے کچھ منگوالیں، مگر انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اگر انہوں نے ایک بار بھی اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیا تو پدمنی اور کالے پجاری انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ کئی پہر گزر چکے تھے۔ باواجی بھوک کے ہاتھوں بالکل نڈھال ہو گئے تھے اور اب قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو جاتے کہ اچانک پدمنی اور چڑیلیں سرشاری کے ساتھ جھومنے لگیں۔ پدمنی سے باواجی کی حالت چھپی نہ رہ سکی تھی، وہ جھومتی ناچتی قہقہے لگاتی ہوئی ان کی طرف بڑھی اور باواجی کے بالکل قریب جا کر بولی:

"نہال شاہ! تجھے تو بھوک نے ہی مار دیا ہے، ہمارا مقابلہ کیا کرو گے؟"

باواجی نے اپنے وقار کو سلامت رکھنے کی خاطر خود کو سنبھالا اور بولے: "پدمنی تم اور تمہارے کالے پجاری بڑی ذلت آمیز موت مرو گے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں مر گیا تو تم زندہ رہو گی۔ تمہارا حشر کالے پجاریوں سے بھی بدتر ہو گا۔" جواب میں پدمنی نے مکروہ قہقہہ لگایا اور اپنی چڑیلوں کے ساتھ باواجی کو تنہا چھوڑ کر قید خانے سے نکل گئی۔

باواجی اب تنہا تھے، وہ اپنے بے قابو ذہن کو آخری بار قابو کرنے کیلئے جتن کرنے لگے۔ انہیں ایک امید ہوئی تھی کہ پدمنی اور چڑیلوں کے چلے جانے سے ان کی نحوست اب کچھ دیر کیلئے ٹل گئی ہو گی۔ لہٰذا انہوں نے جب خود کو سنبھالنے کیلئے وظائف کا سہارا لیا تو قدرت نے ان کے بجھے چراغوں کو روشنی عطا کر دی اور باواجی کے دل کی قندیلیں روشن ہونے لگیں۔ وظائف نے ان کی روح اور بدن کو حرارت مہیا کر دی تھی اور کچھ ہی دم میں وہ حیرت انگیز طور پر اپنے اندر توانائی محسوس کرنے لگے۔ نحوست کے بادل چھٹ چکے تھے۔ باواجی نے کسی تاخیر کے بغیر اپنے موکلان جلالی کو طلب کر لیا۔ موکلان کے حاضر

ہوتے ہی قید خانے میں ہلچل سی مچ گئی اور مندر میں نامانوس سی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ گھنٹیوں کے بجتے ہی پدمنی اپنی چڑیلوں کے ساتھ قید خانے میں وارد ہو گئی، لیکن اس سے قبل کہ وہ حالات سے آگاہ ہوتی۔ باواجی نے عملیات کے زور پر اسے بے بس کر دیا اور موکلان نے اسکی چڑیلوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔

باواجی نے پدمنی کو ایک موکل کے حوالے کیا اور کہا: "تم اس پر پہرہ دو۔ اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے تو اس کا گلا دبا دینا۔"

پدمنی کی نظروں میں حیرانی تھی۔ وہ ایک عورت تھی مگر کالے پجاریوں اور دیوتاؤں کی داسی ہونے کے ناتے وہ خود کو بے حد طاقتور سمجھتی تھی لیکن اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے یہ کالے پجاری اور دیوتا کس قدر بے بس ہیں۔ باواجی نے کچھ ہی دیر میں مندر میں طوفان برپا کر دیا تھا اور آتوم اور طرطوش کو بھی مندر میں بلانے پر قادر ہو گئے تھے اور انہوں نے رگھومل اور نیپالی عاملوں کو ان کی ابلیسی قوتوں سمیت جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

باواجی نے یہ کہہ کر پدمنی کو زندہ چھوڑ دیا کہ وہ ایک عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ اب انہیں اس بات کی بھی فکر نہیں تھی کہ پدمنی کے پاس اگر کوئی پراسرار طاقت ہے بھی تو وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

باواجی نے مندر سے باہر آکر سب سے پہلے غسل کیا اور وضو کے بعد نوافل ادا کیے۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اس کے بعد آتوم کی خبر لی اور اپنے ناراضگی کا اظہار کیا مگر جب آتوم نے معافی مانگ لی تو باواجی نے اسے معاف کر دیا۔

اس بار باواجی نے گائوں میں آتے ہی شادی کر لی۔ اب انہوں نے گھریلو ذمے داریوں سے عہدہ برا ہونے کیلئے زمینوں پر بھی توجہ دینی شروع کر دی۔ اس دوران نیپالی دربار سے انہیں بار بار بلاوا بھی آتا رہا تھا۔ ایک سال بعد اللہ نے انہیں بیٹا عطا کیا تو انہوں نے اس کا نام گل شیر رکھا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد باواجی ایک بار پھر نیپال چلے گئے اور تین مہینے وہاں رہنے کے بعد جب واپس آرہے تھے تو راستے میں انہیں پدمنی مل گئی۔ وہ ایک سنسان علاقے میں چلہ کاٹنے جا رہی تھی۔ اس نے باواجی کو بتایا کہ وہ کالا جادو سیکھنے کیلئے چلے کاٹ رہی ہے۔ باواجی کو اس پر بے حد غصہ آیا اور کہا: "پدمنی کیا تو کالے پجاریوں کی طرح شیطان کی پیروکار بننا چاہتی ہے؟"

پدمنی ایک خوبصورت عورت تھی مگر اسے پراسرار علوم سیکھنے کی لت پڑ گئی تھی۔ اس نے باواجی سے کہا: "پربھو! میں ان علوم کو ایک شرط پر چھوڑ سکتی ہوں۔"

"شرط کیا ہے؟" باواجی نے دریافت کیا۔

"آپ مجھے اپنے ساتھ رکھ لیں اور مجھے اپنے عملیات کی تربیت دیں۔ یقین کریں میں آپ کی داسی بن کر رہوں گی۔" باواجی پدمنی کی باتوں میں آگئے اور اسے اپنے ساتھ لے کر نمولیاں آگئے۔ پدمنی کیلئے باواجی نے گائوں سے باہر ایک مکان بنوا دیا جہاں وہ رہنے لگی تھی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ باواجی نے پدمنی کو کبھی بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت نہیں دی تھی اور نہ ہی پدمنی نے اسلام قبول کرنے میں دلچسپی لی تھی۔ باواجی نے پدمنی سے اس کے دھرم کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ البتہ اسے اخلاقیات کی تعلیم دیتے رہے۔ گائوں کے لوگ دبی زبانوں میں کہتے تھے کہ پدمنی نے باواجی کو اپنے پیار کے جال میں پھانس لیا ہے۔ اس دوران مہاراجہ نیپال نے باواجی کو نیپال میں بلا لیا اور انہیں کچھ عرصے کیلئے وہاں رہنے کیلئے کہا۔ باواجی چار پانچ سال بعد نمولیاں لوٹے تو اس بار وہ اپنے ساتھ خاصی دولت لے کر آئے تھے۔ انہوں نے یہ دولت اپنے خاندان کے علاوہ پورے گائوں کی ترقی کیلئے خرچ کر دی۔

پدمنی نمولیاں ہی میں رہ رہی تھی۔ وہ مندر میں باقاعدگی سے جاتی تھی۔ اس کی بعض حرکات سے گائوں کے مسلمان نالاں تھے۔ انہوں نے باواجی کو بتایا کہ پدمنی مسلمان عورتوں کو توہم پرستی میں مبتلا کرتی ہے اور ان کے مسائل حل کرانے کیلئے مال بٹورتی ہے۔ باواجی نے جب تحقیق کی تو انہیں معلوم ہو اپدمنی کالا جادو سیکھنے کیلئے قبرستان میں بھی جاتی ہے۔ لیکن کوئی گرو نہ ملنے کے باعث وہ ابھی تک کسی قسم کا علم حاصل نہیں کر پا رہی۔ باواجی نے پدمنی کو طلب کیا اور گائوں والوں کی شکایات اس کے سامنے رکھ دیں تو وہ صاف مکر گئی۔ باواجی نے اس رات طرطوش کو پدمنی کی جاسوسی پر مامور کر دیا، اس نے باواجی کو مطلع کر دیا کہ پدمنی طاغوتی قوتوں کے حصول کیلئے کوشاں ہے۔

جانے کیا بات تھی کہ باواجی پدمنی کو راہ راست پر لانے کیلئے سنجیدگی اختیار نہیں کر رہے تھے۔ البتہ انہوں نے پدمنی پر واضح کر دیا تھا کہ وہ مسلمان عورتوں کو تنگ نہ کیا کرے ورنہ وہ اسے سزا دیں گے۔

پدمنی نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ باواجی اس کے ساتھ سختی نہیں کر رہے لہٰذا وہ ہٹ دھرم عورت اور کھل گئی اور اس کی شرارتوں نے گائوں کے مسلمانوں کا ناک میں دم کر دیا۔

باواجی پدمنی کی شرارتوں سے باخبر ہو گئے تھے لیکن بدقسمتی سے انہی دنوں مہاراجہ نیپال ایک بار پھر بیمار پڑ گیا اور انہیں نیپال جانا پڑا۔ مہاراجہ نیپال اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ باواجی نے مہاراجہ سے کہا کہ وہ ولی عہد کو راج سنگھاسن پر بٹھا دیں۔ لہٰذا شمشیر سنگھ کو مہاراجہ نیپال بنانے کے بعد باواجی نمولیاں واپس لوٹ آئے۔ ان کے آتے ہی پدمنی کی شکایتوں کا انبار ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ باواجی نے پدمنی کے معاملے میں سختی کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے بلا کر کہا:

"پدمنی میں نے تمہارے معاملے میں بہت نرمی برت لی ہے۔ میرا خیال تھا تم شرارتوں سے باز آ جائو گی مگر تم نے میری رعایت سے فائدہ اٹھا کر گائوں کے لوگوں کی زندگی وبال کر دی ہے۔ اب تم ہی کہو تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں۔"

باواجی کی بات سن کر پدمنی رونے لگی اور مکر سے بولی: "باواجی! گائوں والے تو مجھ سے جلتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے میں جیون بھر آپ کی داسی بن کر یہاں رہوں۔"

"لیکن اب تمہارا یہاں رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔" باواجی نے دوٹوک کہا۔

"باواجی! میں آپ سے الگ رہ کر جی نہیں سکوں گی۔" پدمنی نے پینترا بدلا اور کہنے لگی:

"اگر آپ نے مجھے اپنے سے الگ کیا تو میں آتماہتیا کرلوں گی۔"

باواجی سوچ میں پڑ گئے۔ "پھر میں کیا کروں... تم اپنی شرارتوں سے باز آجاؤ تو میں تمہیں یہاں رکھ سکتا ہوں..." باواجی کو پدمنی سے غیر محسوس طریقے سے لگاؤ بھی تھا لہٰذا انہوں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

یہ سن کر پدمنی کا دل بلیوں اچھلنے لگا اور وہ بولی: "باواجی سرکار! میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں، مگر آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں اور مجھے عملیات کی طاقت بخش دیں۔"

باواجی اب عمر کے آخری دور میں داخل ہو چکے تھے۔ گل شیر کے علاوہ اور بھی ان کے بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ انہیں اس بات کا قلق تھا کہ ان کی اولاد عملیات اور جوتش سیکھنے میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ البتہ ان کے مسلسل اصرار اور سختی کے باعث گل شیر نے کچھ علوم سیکھ لیے تھے۔ باواجی چاہتے تھے ان کے علم کی قندیل روشن رہے۔ لہٰذا انہوں نے پدمنی سے ایک عجیب و غریب وعدہ لیا۔ بظاہر تو باواجی نے اپنے علم کو اپنی نسلوں تک منتقل کرنے کیلئے پدمنی کا سہارا لیا تھا لیکن اس لمحے وہ یہ بھول گئے تھے کہ جس علم کو وہ پدمنی تک پہنچانا چاہ رہے تھے وہ ان کی نسلوں کو کن مصائب سے دوچار کردے گا۔ باواجی نے ایک ہندو اور کالے علم کی پجارن عورت کا بھروسہ کرکے بہت بڑی غلطی کی تھی۔

باواجی نے پدمنی سے وعدہ لیا: "پدمنی میں تجھے عملیات کا درس دوں گا مگر تم وعدہ کرو کہ میرے مرنے کے بعد تم میرے بچوں تک اس علم کو منتقل کرو گی۔" پدمنی نے وعدہ کرلیا۔

بالآخر باواجی نے پدمنی کو عملیات اور جوتش کی تعلیم دینی شروع کردی۔ ایک سال بعد انہوں نے پدمنی کو ایک بڑے چلے کیلئے آمادہ کیا اور اسے لے کر جنگل میں چلے گئے۔ پدمنی ایک ہفتہ تک وہاں چلہ کشی کرتی تھی۔ باواجی اس چلے کے دوران پدمنی کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ پدمنی اس چلہ سے باہر آنے کے بعد بہت سی پراسرار قوتوں کی حامل ہو جاتی۔

بدقسمتی سے پدمنی جب چلے کی دوسری رات پوری کر رہی تھی انہیں نیپال سے بلاوا آگیا، انہیں بتایا گیا کہ مہاراجہ نیپال اس دنیا سے سدھار گیا ہے لہٰذا اس کی رسومات میں شرکت کیلئے فوراً نیپال پہنچیں۔ باواجی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ بالآخر وہ اپنے دو موکلان کو پدمنی کی حفاظت پر مامور کرکے نیپال چلے گئے۔ ابھی وہ نیپال پہنچے ہی تھے کہ ان کے موکلان نے انہیں اطلاع دی کہ پدمنی ایک عمل کو الٹا پڑھنے کی وجہ سے طاغوتی قوتوں کے ہتھے چڑھ کر مر گئی ہے اور

شیطانی قوتوں نے اس کی لاش کے ساتھ بد سلوکی کی ہے۔

پدمنی کا پہلا وار

حکیم شمشیر محمد سدھو نے اپنے ہاتھوں سے اپنی نسل کیلئے تباہی و بربادی کا گڑھا کھود ڈالا تھا اور سب سے پہلے میرے والد کو پدمنی جیسی خوں آشام اور زہریلی بدروح کے سپرد کر دیا تھا۔ میرے دادا کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا مگر تقدیر نے انہیں زیادہ مہلت نہ دی۔ اس زمانے میں تحریک پاکستان عروج پر پہنچ چکی تھی۔ میرے دادا نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور اپنے علاقے میں تحریک پاکستان کیلئے کام شروع کر دیا تھا۔ نمولیاں اور گردونواح کے دیہات میں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت تھی۔ ہندو اور سکھ ہمارے مزارع تھے مگر حکیم شمشیر سدھو کی تحریک پاکستان میں شمولیت نے مزارعوں اور علاقے کے بااثر سکھوں کو ان کے خلاف کر دیا۔ تقریباً ایک صدی سے ہمارے خاندان کی اس علاقے میں حکمرانی تھی، اس لیے چھوٹے چھوٹے زمیندار اور مزارعوں کو اب اپنی دشمنیاں نکالنے کا موقع مل گیا۔

میاں صاحب تو اپنے بھائی کے ساتھ فوج میں شامل ہونے کے بعد برما بھیج دیئے گئے تھے۔ ایک سال بعد جب وہ واپس نمولیاں آئے تو دادا نے ان دونوں کی شادیاں کر دیں لیکن فوج نے انہیں جلد ہی دوبارہ طلب کر لیا اور وہ 1945ء میں ایک بار پھر برما چلے گئے۔ ان کے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد میرے دادا پراسرار حالات کا شکار ہو گئے۔

پدمنی طاغوتی قوتوں کی حامل تھی۔ اس کی آتما کی شیطانی خواہشیں پوری کرنا میرے دادا کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ایک بار غلطی کر چکے تھے، لہٰذا اس غلطی کا بار بار اعادہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اب پدمنی کی آتما کو جب تک جلا نہیں دیا جاتا، یہ اپنی شیطانی حرکتوں سے باز نہیں آئے گی۔ تحریک پاکستان کے دنوں میں انتہائی سرگرم ہونے کے باعث میرے دادا باوا جی کی گدی پر کئی روز تک نہ بیٹھ پائے تھے۔ اس اثنا میں پدمنی نے حویلی میں اپنی نحوست پھیلا دی اور سب سے پہلے ہماری دادی اس کا شکار ہو گئی۔ اس کے بعد ہماری پھوپھیاں اور چچا اور گھر کے بچے بیمار پڑنے لگے۔ دادا پہلے تو ادویات سے ان کا علاج کرتے رہے مگر جب گھر میں ایک دو اموات ہو گئیں تو انہوں نے چوکی لگا کر حالات معلوم کیے۔ تب ان پر انکشاف ہوا کہ یہ سب پدمنی کی شرارتیں ہیں۔

یہ اتفاق ہے کہ جس روز میرے دادا نے پدمنی کو قابو کرنے کا فیصلہ کا اس رات انہیں ہوشیار پور میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں شرکت کیلئے جانا تھا۔ ان دنوں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جھگڑے شروع ہو چکے تھے اور مسلمان نوجوانوں کو جیلوں میں ٹھونسا جا رہا تھا۔ لہٰذا دادا اور ہوشیار پور کے چند اور بااثر زمینداروں نے اپنی ایک یوتھ فورس بنانے کا منصوبہ بنایا جس کے تحت وہ ہندوؤں اور سکھوں کی فتنہ بازیوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

حکیم شمشیر سدھو کو ایک رات دو محاذوں پر لڑنا تھا۔ یہ نوچندی رات تھی، لہٰذا انہوں نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ صبح سویرے ہوشیار پور چلے جائیں گے اور شام ڈھلے ہی واپس آ جائیں گے۔ جو سیاسی معاملات رات کو نپٹائے جانے تھے، انہوں نے انہیں پہلے وقت میں انجام دینے کا ارادہ کیا اور ہوشیار پور کی طرف روانہ ہو گئے مگر بدقسمتی سے ان کا منصوبہ فاش ہو گیا۔ وہ جب مال پور پہنچے تو انہیں پولیس نے گرفتار کر لیا۔ تھانے والوں نے سہ پہر کے وقت انہیں رہا کر دیا اور کہا کہ انگریز سرکار کے حکم کے مطابق اب وہ اپنے گاؤں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اگر گاؤں سے باہر آئے تو انہیں غداری کے الزام میں قید کر لیا جائے گا۔

میرے دادا گاؤں آئے تو انہیں شدید رنج اور افسوس تھا کہ یوتھ فورس کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا تھا۔ اس جھلاہٹ میں انہوں نے پدمنی کو قابو میں کرنے کیلئے اپنا ساز و سامان تیار کیا اور رات کو قبرستان میں باوا جی نہال شاہ کی قبر کے پاس چلے گئے۔ تقریباً چھ سات مہینے کے تعطل کے بعد وہ چوکی لگا رہے تھے۔ چوکی لگانے کے بعد جب وہ پڑھائی کرنے لگے تو معاً انہیں خیال آیا کہ انہوں نے پدمنی کی آتما کو قابو کرنے کیلئے جو خوشبویات پاس رکھنی تھیں وہ لانا بھول گئے تھے۔

انہوں نے چوکی کا سامان لپیٹا اور حویلی سے خوشبویات لینے روانہ ہو گئے مگر جونہی قدم قبرستان سے باہر رکھا ان پر ایک برق سی گری۔

''حکیم جی نمسکار!'' پدمنی اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ ان کے سامنے نمودار ہوئی۔

''تم..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا حرامزادی! تو نے میرے ہی گھر والوں کو مارنا شروع کر دیا ہے۔'' میرے دادا غصے میں تپتے ہوئے بولے۔

''حکیم جی! تم باوا جی نہال شاہ تو ہو نہیں جن کا میں ادب بھی کروں اور ڈروں بھی لہٰذا یہ بھول جاؤ کہ میں تم سے ڈر جاؤں گی۔ میں تو خود تمہاری موت ہوں۔'' پدمنی زہر آلود لہجے میں کہنے لگی۔

''پدمنی تو نے باوا جی کو وچن دیا تھا کہ تو ان کے علم کی حفاظت کرے گی اور انکی نسلوں تک یہ علم پہنچائے گی مگر تو تو مجھے اور میرے خاندان ہی کو مارنے پر تل گئی ہے۔'' میرے دادا نے تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، میں نے انہیں وچن دیا تھا۔'' وہ چیخی میں ان سے انتقام لینا چاہتی تھی لہٰذا یہ کہہ دیا کہ میں ان کا علم ان کے خاندان سے ختم نہیں ہونے دوں گی مگر باوا جی میرے انتقام کو نہ سمجھ سکے۔ میں آج بھی ان کی داسی ہوں مگر میرا انتقام اپنی جگہ ہے۔ تم نے مجھے آزاد اس لیے کیا تھا کہ تمہارے باغی بیٹوں کو واپس لے آؤں اور انہیں یہ فن سیکھنے پر مجبور کروں مگر حکیم جی ہر کام کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ تم نے تقاضے پورے کیے نہ میں نے۔ تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے انسانی خون پلا کر میری کمزور آتما کو پروان چڑھاتے، جب تم نے یہ کام نہیں کیا تو میں نے تمہاری بیوی اور بچوں کا خون پی کر اپنی شکتی بڑھانی شروع کر دی۔ اگر تم آج بھی مجھے انسانی خون پلا دو تو میں تمہاری پجارن بن کر تمہاری رکھشا کروں گی۔''

میرے دادا اسے شیطانی خوراک مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں یہ بات بھی یاد تھی کہ باوا جی نہال شاہ نے وفات سے پہلے یہ نصیحت کی تھی کہ عملیات کے دوران کبھی ایسی شیطانی حرکت نہ کرنا جس سے نوری علم کی پاکیزگی ختم ہو جائے۔ باوا جی نے زندگی میں بے شمار کالی چڑیلوں اور بد روحوں کو ختم کیا تھا لیکن انہوں نے ایک بار بھی انسانی خون اور پلید اشیاء استعمال نہیں کی تھیں۔ لہٰذا میرے دادا نے پدمنی سے کسی قسم کا سمجھوتا نہ کیا اور کہا :

''پدمنی! میں تجھے آزاد کرا کے ایک غلطی کر چکا ہوں، اب دوسری غلطی نہیں کروں گا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں اور تم شیطان کی پجارن۔ مجھے تمہاری رکھشا قبول نہیں۔ میں اب پہلے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر لوں، پھر تمہاری خبر لوں گا''۔

پدمنی نے یہ سنا تو وہ شعلہ انتقام بن گئی اور بولی: ''حکیم جی! تم بہت بھولے ہو، شاید تم یہ بھول چکے ہو کہ ہوشیار پور کے مندروں میں کالے عامل کیا منصوبے بنا رہے ہیں۔ وہ منتر پر منتر پھونک رہے ہیں۔ مسلمانوں کی شکتی چھیننے کیلئے وہ سکھوں اور ہندوؤں کو ایک کر چکے ہیں۔ کالی کے پجاری جو باوا جی نہال شاہ کے زخم خوردہ ہیں وہ تمہارے خلاف اب کچھ کرنے ہی والے ہیں۔ جانگلی وال میں چڑیلوں کا مسکن پھر سے آباد ہو چکا ہے۔ حکیم جی! اب تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ تمہاری شکتی ختم ہونے والی ہے۔ پدمنی کو کیا قابو کرو گے۔'' یہ کہہ کر اس بدروح نے اپنے دونوں بازو کھول دیئے اور پھر فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے کہنے لگی: ''حکیم جی! میں جا رہی ہوں اب تم سے آکاش پر ملاقات ہو گی۔''

میرے دادا اپنے موکل کی حفاظت میں حویلی میں پہنچے اور اس رات انہوں نے احتیاطاً پوری حویلی کے گرد حصار قائم کر دیا اور خود سونے کیلئے چلے گئے۔

رات کا آخری پہر تھا جب کسی نے زور زور سے ان کا دروازہ پیٹا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ پڑے اور دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔ حویلی کا ایک چوکیدار ہاتھ میں بلم لیے کھڑا تھا۔ میرے دادا کو دیکھتے ہی بتانے لگا: ''سرکار! سکھوں نے حویلی پر حملہ کر دیا ہے۔''

''یا اللہ خیر.....'' میرے دادا کے منہ سے نکلا اور وہ اس سے کہنے لگے: ''باقی ملازم کہاں ہیں؟''

''سرکار، وہ ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔'' حویلی کے باہر بندوق چلنے کی بھی آواز آ رہی تھی۔ دادا نے بندوق اٹھائی اور حویلی کی چھت پر چڑھ کر اپنے محافظوں سے کہنے لگے: ''لڑائی بند کر دو، مجھے ان سے پوچھنے دو، وہ کیا چاہتے ہیں۔''

انہوں نے حویلی کی چھت سے نیچے دیکھا تو دروازے کے پاس درجنوں سکھ گھوڑوں پر سوار نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ ان میں کئی چہرے ایسے تھیں جنہیں دادا اچھی طرح پہچانتے تھے۔

''تم لوگ کیا چاہتے ہو؟'' میرے دادا نے حویلی کی چھت سے پوچھا۔

ایک سکھ گالی دے کر بولا ''اوئے نیچے آ کر بات کر پھر تجھے بتاتے ہیں کیا چاہتے ہیں۔''

دادا نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بلوائی ان سے بات نہیں کریں گے، انہوں نے اپنے ملازموں سے کہا ''یہ لوگ اس طرح واپس نہیں جائیں گے ان کا مقابلہ کرنا پڑے گا'' یہ کہہ کر دادا نے بندوق میں کارتوس ڈالا اور حملہ آوروں سے کہا ''دیکھو! میں خون نہیں بہانا چاہتا، تمہاری شرافت اسی میں ہے کہ واپس چلے جاؤ''.....

دادا اپنی بات مکمل بھی نہ کر پائے تھے کہ یکایک انہیں اپنے کاندھوں پر بوجھ سا محسوس ہوا اور انہوں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اس لمحے دو باتیں ہوئیں، نیچے کھڑے سکھوں نے اوپر کی طرف ایک فائر مار دیا تو چھت کے کنارے پر کھڑا حویلی کا ایک ملازم چیخ مار کر چھت سے نیچے جا گرا۔ دادا نے جونہی پلٹ کر دیکھا تو پدمنی انہیں اپنی خون آشام نظروں کے حصار میں لیے کھڑی نظر آئی۔

''پدمنی تو.....'' میرے دادا کے منہ سے نکلا۔

''حکیم جی! تمہارا سے آ گیا ہے۔ وہ دیکھو نیچے کالی کے پجاریوں نے تمہاری موت بھیجی ہے۔''

اس سے قبل کہ وہ پدمنی سے بچاؤ کا کوئی عمل کرتے، اس بدبخت نے انہیں اس قدر زور سے دھکا دیا کہ بندوق ان کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ حویلی کی چھت سے نیچے جا گرے۔ پدمنی کا ایک مکروہ قہقہہ گونجا، نیچے گرتے ہی میرے دادا کی چیخ سنائی دی تھی لیکن اس کے فوری بعد سکوت چھا گیا تھا اور روشن مشعلیں یکدم بجھ گئی تھیں۔ اسی لمحہ بلوائیوں نے اپنے گھوڑوں کی راسیں کھینچ لیں اور جس تندوہی سے وہ حملہ کرنے آئے تھے اسی رفتار سے واپس ہو لیے۔ ان کے جاتے ہی حویلی کے دروازے کھل گئے اور گھر کے ملازم اور عورتیں دوڑ کر باہر نکلے۔ باہر گھپ اندھیرا تھا، کسی نے ایک لالٹین جلائی اور اس کی روشنی میں وہ جگہ دیکھنے گئے جہاں میرے دادا چھت سے گرے تھے لیکن وہاں حویلی کے ایک ملازم کی لاش تھی۔ میرے دادا حکیم شمشیر محمد سدھو کی لاش غائب تھی۔ سب چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ لاش کہاں جا سکتی ہے۔ پھر کسی نے اپنا خیال پیش کیا: ''مجھے شبہ ہے کہ حکیم جی کی لاش کو بلوائی اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

''مگر کیوں؟'' کسی نے پوچھا

''شاید حکیم جی زندہ ہوں گے تبھی تو وہ انہیں اٹھا کر لے گئے ہیں۔'' اس بات نے حویلی کی عورتوں اور مردوں کو حوصلہ تو دیا مگر کئی روز گزرنے کے بعد بھی میرے دادا کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سکھوں کے نرغے میں زندہ تھے یا مار دیے گئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد پورے علاقے میں مسلمانوں کے خلاف سکھوں اور ہندوؤں کی خونیں کارروائیاں بڑھنے لگیں۔

نمولیاں کے خونی

میرے والد اور چچا ان حالات سے بے خبر تھے۔ وہ 1946 میں چند روز کی چھٹی پر گاؤں آئے تھے۔ میرے چچا تو نمولیاں ہی میں رہ گئے تھے مگر والد ایک بار پھر برما چلے گئے۔ تین ماہ بعد چچا بھی واپس چلے گئے تھے۔ تحریک پاکستان میں خاندان کے سارے مرد شامل رہے تھے۔ لہٰذا پولیس آئے روز انہیں کسی نہ کسی الزام میں گرفتار کر لیتی اور ان میں سے بے بیشتر افراد سکھوں کے ساتھ لڑائی میں مارے بھی گئے۔ اب پیچھے ہمارے خاندان میں صرف چند مرد رہ گئے تھے۔ میرے نانا اور ماموں سب مردوں سے بڑے تھے، لہٰذا انہوں نے خاندان کی عورتوں اور بچوں کو ہندوؤں اور سکھوں کی شر انگیزیوں سے بچانے کیلئے فیصلہ کیا کہ نمولیاں کو چھوڑ دیا جائے۔

اگر اس وقت میرے والد گاؤں میں ہوتے تو شاید یہ آگ اور بھڑک اٹھتی کیونکہ وہ جلالی طبیعت کے مالک تھے اور فوج میں پیشہ ورانہ تربیت حاصل کرنے کے بعد ان کے لیے ہندوؤں اور سکھوں کے جور و ستم سہنا بڑا مشکل تھا مگر وہ تو پدمنی کی سازشوں کا شکار ہو کر برما میں ہی قید ہو کر رہ گئے تھے۔

نانا اور ماموں کے ارادوں کی بھنک سکھوں اور ہندوؤں کو بھی ہو گئی۔ ان حالات میں نانا نے گھر کے سب افراد کو حویلی میں اکٹھا کیا اور انہیں سمجھایا کہ کوئی بھی شخص گاؤں سے باہر نہ نکلے۔ نانا نے اپنے طور پر تو احتیاطی تدابیر اختیار کر لی تھیں مگر تقدیر نے ہمارے خاندان کو ایک کڑے امتحان میں مبتلا کر دیا۔

وہ جولائی 1947ء کی ایک خون آشام رات تھی۔ برسات کے دن شروع ہو چکے تھے۔ ہمارے خاندان کی دو لڑکیاں ایک بوڑھی ملازمہ کے ساتھ کھیتوں میں رفع حاجت کیلئے گئی ہوئی تھیں۔ فسادات کے پیش نظر نانا نے حویلی میں ہی غرقیاں بنا دی تھیں، لہٰذا اب گھر کی خواتین کھیتوں میں نہیں جاتی تھیں مگر ان دنوں برسات کے باعث غرقیاں بھر گئی تھیں اور ان سے تعفن اٹھ رہا تھا اور وہ رفع حاجت کیلئے استعمال نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اس روز میرے نانا اور ماموں سمیت باقی مرد حضرات مال پور میں مسلم لیگ کے ایک ہنگامی اجلاس میں شرکت کیلئے گئے ہوئے تھے جنہیں سہ پہر تک واپس گھر آ جانا تھا مگر وہ رات گئے تک واپس نہیں آئے تھے۔

دونوں لڑکیاں کھیتوں سے واپس آ رہی تھیں بوڑھی ملازمہ ان کے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ ابھی گاؤں سے آدھ فرلانگ پر تھیں جب پہاڑوں کی سمت سے سکھوں کا ایک جتھا ادھر آتا دکھائی دیا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل تیر رہے تھے۔ چاند بھی نکلا ہوا تھا۔ قرب و جوار کے مناظر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ لڑکیوں نے سکھوں کا جتھا دیکھتے ہی گاؤں کی طرف دوڑ لگا دی۔ سکھوں نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا لہٰذا انہوں نے گھوڑے کھیتوں میں ڈال دیے۔ دھان کی فصل کیلئے تیار کھیتوں میں بارشوں کا پانی کھڑا تھا، اس لیے گھوڑے تیز رفتاری سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لڑکیاں گاؤں کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ اسی دوران گاؤں کے مندر کا پجاری اپنے چیلوں کے ساتھ پوجا پاٹ کیلئے قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ باوا جی نہال شاہ کے خاندان کی دو لڑکیاں بدحواسی میں گاؤں کی طرف آ رہی ہیں تو اس کی شیطینیت جاگ اٹھی اس نے اپنے چیلوں کو اشارہ کیا: ''دیوتاؤں نے اپنی بھینٹ بھیج دی ہے۔ جاؤ انہیں پکڑ لو۔''

پجاری کے چیلے پہلے تو حیران ہوئے اور پجاری سے پوچھا: ''گرو! چودھریوں کی لڑکیاں ہیں، انہیں پکڑ لیا تو غضب ہو جائے گا۔''

پجاری نے غصے سے انہیں دیکھا اور دہاڑا: ''بدبختو! تم کن چودھریوں کی بات کر رہے ہو۔ اب تو ہم یہاں کے مہاراج بننے والے ہیں۔ بٹوارا ہونے والا ہے اور اب ہمیں دیوتاؤں کے ان دشمنوں سے نجات پانے کا موقع مل رہا ہے۔ ان لڑکیوں کو پکڑو۔ ہم انہیں کالی ماتا کی بھینٹ چڑھائیں گے۔''

لڑکیاں پجاری اور اس کے چیلوں کو دیکھ کر رک گئی تھیں۔ انہیں یہ خوش فہمی لاحق ہو گئی تھی کہ گاؤں کا پجاری انہیں سکھوں سے بچانے کیلئے غیبی مدد بن کر آ گیا ہے مگر جب پجاری کے چیلوں نے انہیں پکڑ لیا تو انہوں نے پجاری سے التجا کی: ''پنڈت جی! خدا کے واسطے ہمیں بچاؤ۔ سکھوں کا جتھا ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔''

پجاری یہ اطلاع سن کر شیطانی رقص کرنے لگا اور خباثت سے بولا: ''چودھریوں کی عزت سکھوں کے حوالے کر کے بڑا مزہ آئے گا۔ اب ہم تمہیں کالی ماتا کی بھینٹ نہیں چڑھائیں گے بلکہ اپنے سکھ متروں کے حوالے کریں گے۔''

یہ سنتے ہی لڑکیوں نے چیخ پکار شروع کر دی لیکن پجاری کے چیلوں نے کپڑے ٹھونس کر ان کے منہ بند کر دیے۔ اس اثناء میں سکھوں کا جتھہ وہاں پہنچ گیا۔

"آؤ...... آؤمیں اپنے متروں ہی کاانتظار کر رہاہوں۔" پجاری ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔"لواپنی امانتیں لے جاؤ......" اس کی آنکھوں میں شیطنیت رقصاں تھی۔

سکھوں نے پجاری کا شکریہ ادا کیااور چیختی چلاتی لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے،البتہ انہوں نے بوڑھی ملازمہ جو ہندو تھی،اسے چھوڑ دیا۔اس نے حویلی آکر اطلاع دی تو پوری حویلی میں کہرام مچ گیا۔حویلی میں مرد تو کوئی تھا نہیں،لہٰذا عورتوں نے خاندانی تلواریں، بلمیں اٹھائیں اور حویلی سے باہر آگئیں۔ مگر حویلی کے ایک بوڑھے ملازم نے انہیں باہر جانے سے روک دیااور کہا:"خدا کے واسطے تم سب اندر چلی جاؤ۔ورنہ باواجی کے خاندان کاایک بچہ بھی سلامت نہیں رہے گا۔"

حویلی کی عورتوں نے رات روتے اور پہرہ دیتے ہوئے گزار دی۔ صبح سویرے کسی نے انہیں اطلاع دی کہ میرے نانا، ماموں اور دوسرے مردوں کو پولیس نے بلوے کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔اس خبر نے پوری حویلی میں خوف وہراس پھیلا دیا۔خدشہ تھا کہ سکھ اور ہندو حویلی پر حملہ کر دیں گے۔گھر کے مردوں کی غیر موجودگی میں حویلی کی حفاظت کیسے کی جائے؟میری والدہ کی گود میں چند ماہ کی بچی تھی۔انہوں نے ساری عورتوں اور بچوں کو حوصلہ دیااور کہا:

"سب مل کر آیت کریمہ پڑھو۔اللہ تعالیٰ ہم بے کسوں کی مدد ضرور کرے گا"

یہ بات سب کے دل کو لگی اور عورتوں نے شام ڈھلے تک آیت کریمہ کاورد جاری رکھا۔اغوا ہونے والی لڑکیوں کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ان کی ماں حاجرہ جو رشتے میں میرے والد کی پھوپھی لگتی تھی آنکھوں سے اندھی اور قرآن پاک کی حافظہ تھی۔اس کا خاوند بھی میرے نانا کے ہی گرفتار ہو گیا تھا۔وہ بے چاری رو رو کر ہلکان ہو گئی تھی۔ شام تک جب لڑکیوں کی کوئی اطلاع نہ ملی تو وہ بوڑھی ملازمہ کو ساتھ لے کر باواجی نہال شاہ کے خاندان پر کیا قیامت گزری ہے۔گاؤں میں ہندو اور سکھ اکثریت میں تھے۔باقی مسلمان گھرانوں نے چوری چھپے گاؤں چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔لہٰذا گاؤں کی گلیوں میں ہندو اور سکھ ہی ہتھیار اٹھائے نظر آتے تھے۔ برسوں تک اپنے گاؤں کے غریب سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ انسانی سلوک روا رکھنے والے خاندان کا اب کوئی پرسان حال نہ تھا۔

پھوپھی حاجرہ گلیوں سے گزرتی ہوئی دہائیاں دے رہی تھی۔ابھی وہ قبرستان سے خاصی دور تھی جب گاؤں کے ماسٹر جی کرم چند اسے مل گئے۔وہ ہمارے خاندان کی بے حد عزت کرتے تھے۔انہوں نے جب پھوپھی حاجرہ کو دیکھا تو دوڑے دوڑے آئے اور اسے سمجھایا

"بہن حاجرہ تو اس وقت باہر کیوں نکلی ہے۔جلدی سے حویلی چلی جا۔بھوک کتے گلیوں میں شکار ڈھونڈنے نکلے ہوئے ہیں۔"

"ماسٹر جی میں باواجی کی قبر پر منت مانگنے جارہی ہوں۔سکھ میری بیٹیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"بہن حاجرہ! بھگوان نے چاہا تو وہ گھر آجائیں گی مگر تو اس وقت حویلی چلی جا۔مندر کے پجاری نے ہندو اور سکھ نوجوانوں کو بلا کر کہا ہے کہ وہ چودھریوں کو اس گاؤں سے زندہ سلامت باہر نہیں جانے دیں گے اور تو اور اس بدبخت نے یہ بھی کہا ہے کہ باواجی نہال شاہ کی قبر کھود ان کی ہڈیاں نکال کر جلادی جائیں۔انہیں اس بات کا دکھ ہے کہ باواجی نے کالے پجاریوں کو اس گاؤں سے نکال دیا تھا۔"

یہ بات سن کر پھوپھو حاجرہ تڑپ اٹھی:"ماسٹر جی!انہیں روکو...... خدا کیلئے انہیں روکو اور سمجھاؤ کہ باواجی نہال شاہ کے خاندان نے کبھی آج تک ان کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ان بے خبروں اور اندھوں کو نیکی کا راستہ دکھاؤ، ماسٹر جی انہیں یہ بھی سمجھاؤ کہ اگر نمولیاں کے بچے کھچے مسلمانوں نے اسلحہ اٹھالیا تو یہاں قیامت برپا ہو جائے گی۔"

"بہن حاجرہ! میں انہیں سمجھا چکا ہوں مگر وہ مجھے بزدل اور دیوتاؤں کا باغی کہتے ہیں۔ یہ سب خونی اور راکھشس پولیس کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔ آج نہیں تو کل پولیس گاؤں کے سارے مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لے کر ہر قسم کا اسلحہ اور لاٹھیاں قبضے میں لے لے گی۔ بہن حاجرہ تم ان لوگوں کے مکروہ چہرے نہیں دیکھ سکتیں جو کسی ان دیکھی فتح کے نشے میں جھوم رہے ہیں۔ میری تجھ سے بنتی ہے کہ جلدی سے حویلی چلی جا....." لیکن پھوپھی حاجرہ نے ماسٹر جی کی بات نہ مانی اور باوا جی کی قبر پر جا کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کی بے جان اور تاریک آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں۔

گاؤں کے وارث مہاجر بن گئے

مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا جب پھوپھی صحیح سلامت واپس حویلی آگئی۔ باوا جی کی روحانی قربت سے اس کے دل کو قرار سا آگیا تھا۔ اس نے واپس آکر وضو کیا اور میری والدہ سے کہنے لگی: ''میری بچی! مجھے باوا جی کے حجرے میں لے چلو۔''

باوا جی نہال شاہ کا حجرہ برسوں سے بند پڑا تھا۔ میرے دادا جب زندہ تھے تو کبھی کبھار ہیا سے کھول کر وہاں چلہ کاٹتے تھے۔ عام راتوں میں یہ حجرہ بند رہتا تھا۔ پھوپھی حاجرہ نے میری والدہ کو دیسی گھی کا ایک دیا روشن کرنے کیلئے کہا پھر ''اگر'' کی لکڑی منگوا کر اسے دیئے کی لو سے دہکانے کو کہا۔ اگر کی لکڑی سلگتے ہی مدہوش کن خوشبو دینے لگی تو برسوں بعد حجرے کی فضا میں مانوس سی بو رچ گئی۔

''تو باہر دروازے پر بیٹھ جا..... میں اندر بیٹھ کر عبادت کروں گی۔'' پھوپھی حاجرہ نے میری والدہ سے کہا تو وہ عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''پھوپھی تو کیا کرنا چاہتی ہے؟'' میری والدہ نے پوچھا۔

''میں حویلی کی نحوست ختم کرنے کیلئے دعائیں کروں گی۔''

''پھوپھی کیا تو وظائف پڑھ لیتی ہے؟'' میری والدہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں بیٹی! میرے والد نے باوا جی نہال شاہ سے کچھ دعائیں حاصل کی تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ اگر کبھی کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ تو میرے حجرے میں آکر یہ دعائیں پڑھنا۔ میں نے یہ دعائیں اپنے باپ سے سیکھ لی تھیں''۔

میری والدہ تو دروازے کے باہر بیٹھ گئیں اور پھوپھی حاجرہ حجرے کے فرش پر بیٹھ گئی۔ اگر کی لکڑی خوشبودار دھواں پیدا کر رہی تھی۔ پھوپھی حاجرہ عقیدت و جذب کے عالم میں گڑگڑا کر دعائیں کرنے لگی اور پھر رات گئے تک حجرے میں ہی رہی۔ سحری کے وقت جب وہ باہر نکلنے لگیں تو انہیں حجرے میں کسی دوسرے وجود کا احساس ہوا جس کی گہری گہری سانسیں حجرے کی فضا کو بوجھل بنا رہی تھی۔ وہ اندھی تھی مگر ان کی حسیات نے انہیں مطلع کر دیا تھا کہ کوئی دوسرا وجود آہستہ آہستہ اس کے قریب آرہا ہے۔

''کک..... کون'' پھوپھی حاجرہ ایک دم سہم سی گئی۔

''حاجرہ! یہ میں ہوں۔ طرطوش۔'' پھوپھی حاجرہ طرطوش سے اچھی طرح آگاہ تھی، اس کی آمد سے پھوپھی حاجرہ کے دل کے زخم کھل گئے اور وہ سسکتے ہوئے بولی :

''طرطوش تو ہمارے باوا جی کا بڑا ہی وفادار ساتھی ہے۔ تو نے حکیم جی کے مرنے کے بعد ہماری خبر ہی نہیں لی کہ باوا جی کے خاندان پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔''

"حاجرہ بی! میں جانتا ہوں مگر میں مجبور ہوں۔" طرطوش ندامت کے ساتھ کہنے لگا۔ "حکیم جی کے واقعہ کے بعد میں نے آنے کی کوشش کی تھی مگر ان کے بعد باواجی کے خاندان میں کوئی مرد ایسا نہیں تھا جو ہماری حاضری کو سہہ سکتا۔ ایک میاں صاحب ہیں جنہیں پدمنی جیسی بدذات روح نے برما میں الجھا دیا ہے۔ اگر وہ ایک بار ہی ادھر آکر باواجی کے حجرے میں حاضری دیتے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔" طرطوش نے اپنی لاچارگی ظاہر کرتے ہوئے حاجرہ بی کو سمجھایا۔ "بی بی! تم نے باواجی کے حجرے میں آکر ہمارے دل کے قفل کھول دیئے ہیں۔ ہم قوانین فطرت کے سامنے مجبور ہوتے ہیں۔ خود کسی عام انسان پر حاضر نہیں ہو سکتے۔ لیکن وہ لوگ جو ہمارے عامل کی قربت یا حجرے میں عبادت کرتے ہیں ہم ان پر ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اب میں تم لوگوں پر ظاہر ہو گیا ہوں تو میری ایک بات غور سے سنو! جتنی جلدی ممکن ہو نمولیاں کو چھوڑ دو۔ کیونکہ نمولیاں کے مندر میں کالے پجاری نحوست پھیلانے اور جادو ٹونے کے مکروہ عمل کرنے کیلئے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو قتل کریں گے اور مسلمان کنواری لڑکیوں کو اغوا کر کے انہیں اپنی داسیاں بنانے کا عہد کر چکے ہیں۔ سکھ بھی ان کے منصوبے میں شریک ہیں۔ تمہاری دونوں بیٹیاں اسی مکروہ منصوبے کا آغاز ثابت ہوئی ہیں۔"

"طرطوش! خدا کے واسطے مجھے میری بیٹیوں کے بارے میں بتاؤ وہ کہاں ہیں؟" پھوپھی حاجرہ ہاتھ جوڑتے ہوئے رونے لگیں۔

"حاجرہ بی! حوصلہ کرو، تمہاری دونوں بیٹیاں غیرت مند تھیں، دونوں اپنی عزت کا دامن بچانے کیلئے خودکشی کر چکی ہیں۔" طرطوش نے بڑے جبر کے ساتھ خبر سنائی۔ اسے امید تھی کہ پھوپھی حاجرہ اس اندوہناک خبر کا صدمہ نہیں سہہ سکے گی لیکن پھوپھی حاجرہ جو پہلے اپنی بیٹیوں کی اطلاع نہ ملنے پر زار و قطار رو رہی تھی، اب اس کے آنسو ایک دم رک گئے تھے۔ اس کی بے نور آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس جانکاہ صدمے کو سہہ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ بولی: "طرطوش! میری بیٹیاں اپنی ناموس پر قربان ہو گئی ہیں۔ دعا کرو اللہ مجھے صبر اور حوصلہ دے۔"

"حاجرہ بی! تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن ان ہندوؤں اور سکھوں کو باواجی کے ازلی دشمن کالے پجاریوں کی آشیر باد حاصل ہے انہوں نے حویلی پر شیطانی موکلان بٹھائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ لوگوں کی بروقت مدد نہیں کر سکتا۔"

"تم ہماری مدد کیوں نہیں کر سکتے طرطوش! آخر کیا وجہ ہے، تم جانتے ہو ہم بے سہارا ہو چکے ہیں۔ ہماری عورتوں کی عزتیں غیر محفوظ ہیں۔ ہمارے محافظ حوالات میں بند ہیں۔ ان حالات میں بھی تم ہماری مدد نہیں کر سکتے۔"

"حاجرہ بی! تمہاری توقعات بھی بجا ہیں مگر ہماری مجبوری ہے کہ ہم اپنے قوانین کے پابند ہیں۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ جنات صرف اس وقت انسانوں کی مدد کر سکتے ہیں جب انہیں ان کے عامل طلب کریں۔ جب ہماری طاقت بڑھانے اور ہم سے کام لینے والے عامل ہی نہ ہوں گے تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم معمولی سی مدد کر سکتے ہیں لیکن صرف ان حدود میں جہاں کسی کالے عامل نے سحر نہ پھونکا ہو۔"

"تو پھر تم ہی کہو ہم کیا کریں۔" پھوپھی حاجرہ لاچارگی میں بولیں۔

"میں تم لوگوں کی یہ مدد کر سکتا ہوں کہ مردوں کو حوالات سے چھڑوا دیتا ہوں۔ ان کے گھر آتے ہی تم لوگ ہجرت کر جاؤ۔ اس دوران میں میاں صاحب کو برما سے لانے کی کوشش کرتا ہوں، اس پدمنی کو کالے عاملوں کی شکتیاں بھی ملی ہوئی ہیں۔ پدمنی یہ بات جانتی ہے کہ باواجی کے خاندان میں اب صرف میاں صاحب ہی ایک ایسے مرد ہیں جو ان کے فن کی شمع کو روشن رکھ سکتے ہیں۔"

طرطوش پھوپھی حاجرہ کو حوصلہ دینے کے بعد چلا گیا تو وہ حجرے سے باہر نکلیں۔ میری والدہ دروازے کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔ پھوپھی نے انہیں طرطوش کے بارے میں آگاہ کیا اور کہا: ''بیٹی اب تم لوگ چھوٹا موٹا سامان باندھ کر رکھو۔ تمہارے نانا اور ماموں کے آتے ہی ہمیں نمولیاں چھوڑ دینا ہے۔''

پھوپھی کی ہدایت پر عورتیں سامان اکٹھا کرنے لگیں اور اگلے روز میرے نانا ماموں اور ایک چھوٹا چچا افضل جس کی عمر 16 سال تھی باقی مردوں کے ساتھ حویلی آ گئے۔ وہ سب ضمانت پر رہا ہوئے تھے۔ پولیس انہیں خود گاؤں چھوڑنے آئی تھی۔ اسی دوپہر پولیس نے نمولیاں کے مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لی اور لکڑی کے ڈنڈے، کلہاڑیاں، تلواریں اور بندوقیں اپنے قبضے میں لے لیں۔

نانا کے گھر میں آنے سے سب لوگوں کو حوصلہ تو ہو گیا تھا مگر اب انہیں یقین تھا کہ سکھ اور ہندو کسی بھی وقت حویلی پر چڑھائی کر سکتے ہیں۔ اس دوران پاکستان کے قیام کا اعلان ہو چکا تھا اور ستم گزیدہ مسلمان چوری چھپے ہجرت کر رہے تھے۔ یہ برسات کے دن تھے۔ بارشوں کی وجہ سے تمام کچے راستے پانی اور کیچڑ سے بھر گئے تھے۔ یہ جولائی 47ء کی آخری جمعرات تھی جب بارش نے صبح سے ہی برسنا شروع کیا تھا۔ بجلی بھی آسمان پر کڑک رہی تھی۔ بارش کا زور ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس خراب موسم میں نانا نے فیصلہ کیا کہ وہ اس طوفانی رات میں نمولیاں چھوڑ دیں گے۔ عورتوں نے کہا: ''اس قدر خراب موسم میں بچوں کو ساتھ لے کر کیسے جا سکتے ہیں۔''

''بھلے مانسو! یہ خراب موسم ہی تمہاری زندگیاں بچا سکتا ہے۔ عام دنوں میں صبح دوپہر اور رات کو خونخوار جتھے ہجرت کرنے والے قافلوں کی تاڑ میں رہتے ہیں۔ آج وہ اس خیال سے اپنے اپنے ٹھکانوں میں بیٹھے ہوں گے کہ اس قدر خراب موسم میں کون قسمت کا مارا ہجرت کر سکتا ہے''۔

نانا کی بات سب کی سمجھ میں آ گئی اور جلدی سے دو بیل گاڑیاں جوت کر ان کے اوپر خیمہ نما سائبان گاڑھ دیئے گئے۔ عورتوں اور بچوں کو ان کے اندر بٹھا دیا گیا۔ نانا اور میرے ماموں بندے حسن کے علاوہ دوسرے مرد کلہاڑیوں سے لیس ہو کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ انہوں نے یہ کلہاڑیاں پولیس کے آنے سے پہلے حویلی کے تہہ خانے میں چھپا دی تھیں۔

بارش موسلا دھار برس رہی تھی۔ سیاہ بادلوں نے آسمان کی تاریکیوں کو اور بھی گہرا کر دیا تھا البتہ جب بھی بجلی کڑکتی تو کچھ دیر کیلئے اندھیرے میں چکا چوند ہو جاتی۔ یہ قافلہ بڑی خاموشی کے ساتھ گاؤں سے نکلا اور کیچڑ سے لت پت راستوں پر چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ صبح ہونے تک وہ خیریت سے مال پور تک پہنچ گئے۔ نانا کو اب خدشہ لاحق ہو گیا کہ مال پور کے سکھوں نے اگر قافلے کو دیکھ لیا تو وہ ان کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہو گا۔ کیونکہ یہاں کے جتھے بندوقوں سے لیس تھے۔ لہٰذا انہوں نے قافلے کو مال پور کے گھنے کھیتوں میں چھپا دیا اور وہ سارا دن انہوں نے اسی جگہ پر گزار دیا۔ بارش ابھی تک ہو رہی تھی اور قافلے کی عورتیں اور بچے بارش میں بھیگ جانے کے باعث بیمار پڑ گئے تھے۔ کوئی دوادارو کا بندوبست نہ ہو سکتا تھا لہٰذا جیسے تیسے کر کے یہ قیامت خیز دن بھی گزر گیا اور رات ہوتے ہی قافلے نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ شام کے بعد بارش رک گئی تھی مگر راستوں پر گھٹنے گھٹنے پانی کھڑا تھا۔ بعض راستوں میں سکھوں نے گڑھے کھود دیئے تھے جو بارشوں کے باعث بھر چکے تھے۔ لہٰذا جو بھی قافلہ ان راستوں سے گزرتا ان کی بیل گاڑیاں اور جانوروں کے علاوہ بہت سے افراد بھی ان اندھے گڑھوں میں گر پڑتے اور خونخوار جتھے ان بے کسوں کو لوٹ لینے کے بعد قتل کر دیتے اور نوجوان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ ہمارے قافلے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ مال پور سے دو تین کوس آگے بڑھے تھے کہ آگے جانے والی بیل گاڑی اندھے گڑھے میں گر گئی اور اس پر سوار عورتیں اور بچے بیل گاڑی کی لپیٹ میں آ گئے اس پر سوار سبھی لوگ جاں بحق ہو گئے۔ نانا نے انہیں بچانے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ اگر وہ انہیں ہی بچانے پر لگے رہے تو باقی زندہ افراد کی جان بھی جائے گی لہٰذا انہوں نے دوسری بیل گاڑی کو آگے بڑھایا اور احتیاطاً گھوڑے سے اتر کر آگے آگے چلنے لگے۔ وہ ایک ہاتھ میں کلہاڑی کی مدد سے راستہ ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے جاتے اور دوسرے میں لالٹین سے قافلے کی راہنمائی کرتے جاتے۔ یوں یہ سفر پہلے سے بھی زیادہ سست روی سے ہونے لگا۔ رات چونکہ تاریک تھی لہٰذا راہنمائی کیلئے لالٹین جلانا مجبوری بن گئی تھی۔ بالآخر اگلی صبح قافلہ ہوشیار پور کے قریب پہنچ گیا۔ بدقسمتی سے سکھوں کے ایک ٹولے نے قافلے کو دیکھ لیا اور ان پر حملہ کر دیا۔ نانا نے میرے ماموں بندے حسن اور چچا افضل کو سختی سے کہہ دیا کہ وہ قافلے کو لے کر نکلنے کی کوشش کریں اور وہ خود سکھوں کا مقابلہ کرنے کیلئے رک گئے۔ پانچ سکھوں پر مشتمل جتھہ کلہاڑیوں اور بلموں سے مسلح تھا۔ میرے نانا اور رشتہ کے دوسرے مردوں نے ان کا مقابلہ کیا اور ایک گھنٹہ تک انہیں الجھائے رکھا۔ اس دوران قافلہ ہوشیار پور پہنچ چکا تھا۔ نانا سکھوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد خود بھی شہید ہو گئے تھے۔ ان میں سے صرف نور حسن نامی شخص بچا تھا۔ یہ ہمارے نانا کا ملازم تھا اور وہ بڑی مشکل سے جان بچاتا ہوا بعد میں پاکستان پہنچ گیا۔

قافلے میں اب میرے ماموں بندے حسن، چچا افضل، میری والدہ، پھوپھی حاجرہ اور کچھ عورتیں اور بچے بچ گئے تھے۔ ماموں اور چچا انہیں ریل گاڑی کے ذریعے پاکستان لانے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر ہمارے کچھ بچے مسلسل بیمار رہنے کے باعث راستے میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ ہجرت کا یہ سفر بڑی صعوبتوں اور قربانیوں سے کٹا تھا۔ جب یہ قافلہ لاہور اسٹیشن پر پہنچا تو اسے وہاں سے ریگل چوک کے قریب بڑی سی پرانی حویلی کے تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا اور انہیں یہ تسلی دی گئی کہ بہت جلد ان کی رہائش کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ ان دنوں لاہور میں ہجرت کے باعث فسادات رونما ہو رہے تھے لہٰذا مہاجرین کو محفوظ مقامات پر رکھا جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

پندرہ بیس روز تک اسی تہہ خانے میں گزر گئے تو ماموں بندے حسن اور چچا افضل تہہ خانے سے باہر نکلے اور مال روڈ سے ہوتے ہوئے بڈھا راوی کی جانب جا نکلے۔ یہ غالباً 14 اگست کا دن تھا، مسلمان الگ وطن کے باقاعدہ اعلان کی خبر سن کر خوشی سے نعرے لگا رہے تھے اور جلوس نکال رہے تھے۔

ماموں بندے حسن جب ٹیکسالی کے قریب سے گزرے تو ان کی نظر بڈھا کی طرف جانے والے راستے پر قائم کوارٹروں پر پڑی۔ یہ کھلی اور کشادہ جگہ تھی، وہاں لکڑی چیرنے والی آرا مشین لگی ہوئی تھی۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر بوڑھ کا بڑا سا گھنا درخت تھا۔ درخت کے پاس ہی کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ماموں بندے حسن اور چچا وہاں گئے تو معلوم ہوا کہ یہ جگہ کٹڑی مستری نذر محمد کہلاتی ہے اور وہ اس آرے اور کوارٹروں کا مالک ہے۔ اس کے عقب میں ہندوؤں کا شمشان گھاٹ تھا۔ ماموں بندے حسن کے پاس کچھ زیورات تھے جو وہ بڑی مشکل سے چھپا کر لائے تھے۔ انہوں نے مستری نذر محمد سے کوارٹر کرایہ پر لے لیا اور گھر کے افراد کو وہاں لے آئے۔

کٹڑی مستری نذر محمد کے پیچھے جھگیاں بادیاں کی آبادی تھی اور اس سے آگے کچا راوی روڈ تھا۔ ایک روز ماموں علاقے کا جائزہ لینے کیلئے ادھر گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر جب کچا راوی سے ذرا سا اوپر ٹیکسالی کی طرف آ رہے تھے تو انہیں کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ ماموں نے آواز کی سمت دیکھا تو انہیں ایک عجیب سا منظر دکھائی دیا۔ سامنے ایک مندر کی عمارت تھی جس کا بڑا سا لکڑی کا دروازہ تھا اس کا بغلی دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا جس میں سے ایک لڑکی باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا سر اور بازو باہر تھے جو خون سے لت پت تھے اور ٹانگیں دروازے کے اندر تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لڑکی کو ٹانگیں پکڑ کر کوئی اسے اندر کو کھینچ رہا ہے۔ ماموں بھاگتے ہوئے مندر کی طرف بڑھے۔ اس کے دروازے پر پرادہ کنڈ کا لفظ کندہ تھا۔ ماموں دروازے کے پاس پہنچے اور تیزی سے آگے بڑھ کر نیم وا دروازے کو دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا۔ جس سے لڑکی باہر گر پڑی۔

دروازے کے دوسری طرف ایک خونخوار اور خباثت سے بھرپور چہرے والا ایک پنڈت کھڑا تھا۔ اس نے ماموں کو دیکھتے ہی ڈراوا دیا۔

"جا چلا جا یہاں سے ورنہ تجھے بھی مار دوں گا۔"

"یہ لڑکی کون ہے۔" ماموں نے اس کی دھمکی کی پروانہ کی۔

اس نے ماموں کی بات کا جواب نہ دیا اور مندر کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔ پہلے تو ماموں کے دل میں آیا کہ وہ دروازہ توڑ کر اس پنڈت سے پوچھیں کہ وہ لڑکی کے ساتھ کھینچا تانی کیوں کر رہا تھا لیکن جب انہوں نے لڑکی کی حالت دیکھی تو فوراً اس کی طرف بڑھے۔ وہ ابھی تک ہوش میں تھی۔

"بھائی جان..... خدا کے واسطے مجھے بچا لیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"تو مسلمان ہے۔" ماموں بندے حسن کو ایک دھچکا سا لگا اور انہیں ساری بات کی سمجھ آ گئی۔ "کہیں تجھے اس نے اغوا کرنے کی کوشش تو نہیں کی۔"

"خدا کیلئے پہلے یہاں سے نکل بھاگیں، پھر میں آپ کو ساری بات بتاؤں گی۔" لڑکی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ماموں اسے لے کر کوارٹر میں آ گئے اور اسے زنان خانے میں بھیج دیا۔ اس لڑکی نے ماموں کو بتایا کہ اس وقت لاہور کے سارے مندروں میں بہت سی مسلمان کنواری لڑکیاں قید ہیں۔ ہندو پنڈت اور جادوگران کو اپنے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھانے کے علاوہ اپنی داسیاں بنا رہے ہیں۔ وہ لڑکی مہاجر تھی جس کے خاندان کو قلعہ لچھمن سنگھ کے ایک ہندو نے بہلا پھسلا کر اپنے گھر میں قیام کرنے کیلئے آمادہ کیا تھا اور پھر کسی طرح وہ اسے اغوا کر کے مندر میں لے گیا تھا۔ جہاں اس رات اس کو دیوتاؤں کے نام پر قربان کر دیا جانا تھا مگر وہ جان بچانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اگلے روز جب ماموں قلعہ لچھمن سنگھ میں اس لڑکی کے والدین کو تلاش کرنے کیلئے باہر نکلے تو ان کے ساتھ ایک خوفناک حادثہ پیش آگیا۔ وہ باغ منشی لدھا کے قریب سے گزر رہے تھے، وہاں ایک چارہ منڈی تھی۔ لڑکی نے بتایا تھا کہ ان کے والدین چارہ منڈی کے پاس سرخ اینٹوں والے ایک مکان میں رہ رہے ہیں۔ بالآخر وہ مکان کو تلاش کر کے وہاں پہنچے تو مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ماموں نے پہلے تو دروازہ کھٹکھٹایا مگر جب کافی دیر گزرنے کے بعد بھی کوئی بھی دروازہ کھولنے نہ آیا تو وہ اندر داخل ہو گئے اور ''کوئی ہے۔ کوئی ہے۔'' کی آوازیں دیتے ہوئے کمروں میں داخل ہو گئے۔ جونہی وہ ایک چھوٹے سے کمرے سے گزر کر بڑے کمرے میں پہنچے تو ان کے سر پر قیامت سے ٹوٹ پڑی۔ وہ تیورا کر دروازے ہی میں گر گئے مگر اپنے حواس کھونے سے پہلے انہوں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ ان کے سامنے وہی لڑکی سفید لباس میں ملبوس کھڑی تھی جسے انہوں نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ اس کا لباس خون سے لتھڑا پڑا تھا اور منہ سے خون لہو رہا تھا۔ وہ خون آشام نظروں سے انہیں گھور رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی ہڈی تھی جو اس نے ماموں کے سر پر ماری تھی۔

''تم.....'' ماموں بندے حسن اسے پہچان کر لڑکھڑاتی زبان میں بولے۔

''ہاں..... میں..... پدمنی..... ہاہا.....ہاہا.....'' وہ مکروہ قہقہہ لگا کر بولی تو اس کے منہ سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے۔ ماموں بندے حسن اس کا یہ روپ دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھے۔

لڑکیاں جو مندروں میں لے جائی گئیں

ماموں بندے حسن شام تک گھر واپس نہ پہنچے تو گھر کی عورتوں کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ چچا افضل اس وقت گھر میں ہی تھے۔ وہ بھی ماموں بندے حسن کی تلاش میں نکل پڑے۔ ان دنوں لاہور میں ہجرت کے دوران فسادات رونما ہو رہے تھے۔ قلعہ لچھمن سنگھ، لوہاری وغیرہ میں عمارتیں نذر آتش کی جا رہی تھیں اور فسادات کے باعث خون خرابہ بھی ہو رہا تھا۔ عشاء کے وقت چچا افضل سر جھکائے واپس آئے اور بتایا کہ ماموں بندے حسن کی کوئی خبر نہیں ملی۔

ایک دو ہفتے تک ماموں بندے حسن کی تلاش جاری رہی اور پھر گھر کی عورتوں نے دل پر صبر کا پتھر باندھ لیا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ماموں بندے حسن کسی سکھ یا ہندو کے ہاتھ چڑھ گئے ہیں اور اس دنیا میں نہیں رہے۔

وہ لڑکی جسے ماموں بندے حسن نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی اب بہت شرمندہ اور گھبرائی گھبرائی سی رہنے لگی تھی۔ وہ خود کو مورد الزام ٹھہراتی اور میری والدہ سے کہتی: ''باجی! میری وجہ سے آپ کا بھائی مارا گیا ہے۔ اس کے بدلے میں آپ مجھے مار ڈالیں۔''

والدہ کے علاوہ پھوپھی حاجرہ اور دوسری خواتین اس کی اس بات پر اسے تسلی دیتیں اور کہتیں: ''تو پاگلوں والی باتیں نہ کیا کر حمیداں، اللہ کو جو منظور تھا وہ ہی ہوا ہے۔ اس میں تیرا کیا قصور ہے۔''

یہ تیسرے ہفتے کی ایک رات تھی۔ آسمان تاریکیوں کی ظلمتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اہل لاہور اس بات سے غافل تھے کہ لاہور کے مندروں میں طاغوتی اور شیطانی طاقتوں کے غلام ہندو پنڈت مظلوم اور مہاجر مسلمانوں کو کس طرح لوٹ رہے ہیں۔ بد قسمتی سے بہت سے کمزور عقیدہ مسلمان بھی ان کے آلہ کار بن گئے تھے اور انہوں نے مہاجر لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر ٹیکسالی کی گناہ آلود گیوں اور مندروں کے ہوس زدہ پنڈتوں کے حوالے کرنا شروع کر دیا تھا۔ پنڈت انہیں اپنی خباثتوں کا نشانہ بناتے اور دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھاتے۔ ان دنوں کچا راوی کے علاقے میں بالخصوص کالی کے مندر، ہرا دہ کنڈ مندر، ستیلا مندر، انار کلی کے بنسی دھر مندر اور دیو سماج مندر میں بڑے بڑے پروہت ایک گھناؤنا کھیل کھیلنے میں مصروف تھے اور کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ وہ لاہور کے گلی کوچوں میں شیطانی رسموں کو کتنی خاموشی سے انجام دے رہے ہیں۔ اکثر علاقوں بالخصوص دریا کے کنارے واقع شمشان گھاٹوں سے کٹے پھٹے انسانی اعضا اور نوجوان لڑکیوں کی لاشیں ملتی تھیں۔ مسلم آبادی کے بعض گھروں میں جانوروں کی کھوپڑیاں اور گندے خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے عام ملنے لگے اور مسلمانوں کے قبرستانوں سے قبر کھود کر مردے غائب کیے جانے لگے۔ کالے عاملوں اور بڑے مندروں کے پروہتوں کی ان سیاہ کاریوں نے اگرچہ مسلمان گھرانوں میں خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا تھا اور خواتین اور بچے شام کے وقت گھر سے باہر نکلنے سے احتراز کرنے لگے تھے مگر پھر بھی یہ گھناؤنے واقعات مکمل طور پر منظر عام پر نہیں آ رہے تھے۔

کٹڑی مستری نذر محمد کے عقب میں باغ منشی بدھا کا علاقہ تھا۔ کٹڑی میں چھوٹے چھوٹے کوارٹر تھے اور ہمارے جیسے بہت سے سفید پوش زمیندار اب ان دو تنگ و تاریک کمروں کے کوارٹروں میں رہ رہے تھے۔ آبادی تو زیادہ نہیں تھی مگر جتنے بھی لوگ تھے سبھی مسلمان تھے۔ باغ منشی بدھا سے اوپر ہری تلا کی آبادی تھی اور اس سے بائیں جانب شمشان گھاٹ تھا۔ یہ ہندوؤں کا مرگھٹ ہرا دہ کنڈ مندر کے عقب میں تھا۔ چچا افضل کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ہرا دہ کنڈ مندر کے پجاری نے حمیداں کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور ماموں بندے حسن کو اس نے خبردار بھی کیا تھا۔ انہیں شک ہوا کہیں مندر کے پجاری نے ہی ماموں بندے حسن کو نہ مار دیا ہو۔ اس نے گھر کی خواتین کو تو یہ بات نہ بتائی البتہ خود اس کھوج میں لگ گئے۔ انہوں نے مستری نذر محمد کی وساطت سے کوتوالی تھانے کے ایک سپاہی کو اعتماد میں لیا اور اسے سارا واقعہ سنانے کے بعد اپنا خدشہ بھی ظاہر کر دیا۔ سپاہی پکا مسلمان اور جی دار تھا۔ اس کا نام علی بخش تھا اور اس نے ڈیڑھ بالشت کی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک روز شام کے وقت علی بخش اور چچا افضل دونوں ہرا دہ کنڈ مندر پہنچ گئے لیکن وہاں پہنچ کر انہیں خیال آیا کہ پجاری بندے حسن کے قتل میں ملوث ہوا تو وہ اس بات کا اعتراف نہیں کرے گا یا اگر انہوں نے مندر پر چھاپا مارا تو اس کیلئے انہیں پہلے رپٹ درج کرانے کے علاوہ تھانیدار کو بھی بتانا پڑے گا۔ بد قسمتی سے تھانیدار سکھ تھا جس سے مدد کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ لہٰذا دونوں نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ دونوں سکھوں کا روپ دھار کر مندر میں پناہ مانگیں گے۔ چونکہ ہندو اور سکھ شیر و شکر تھے اس لیے مندر کا پجاری ان کی مدد کرے گا۔ پس انہوں نے سروں پر پگڑیاں باندھیں، لنگوٹیاں کسیں اور کمروں میں کرپانیں اڑس لیں۔ پورا کیس تیار کر کے سکھ بن گئے۔ علی بخش نے چچا افضل کے کپڑے بھی پھاڑ دیئے اور ان پر کسی جانور کا خون لگا دیا۔ کرپانیں بھی لہو میں رنگ لی گئیں۔

اس وقت رات ہو رہی تھی جب دونوں مندر کا دروازہ زور زور سے پیٹنے لگے۔ مندر کی عمارت ایک محل کی مانند تھی۔ بے شمار کمرے اور ڈیوڑھیاں تھیں۔ مندر کی حفاظت پر بہت سے ہندو اور سکھ بھی مامور تھے مگر وہ سب اندر ہی رہتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے بڑے دروازے کا چھوٹا پٹ کھولا اور لالٹین کی روشنی باہر نکال کر بولا "کون ہے بے ".....

"میں ہوں مہندر سنگھ۔" علی بخش نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"کون مہندر۔" اس بار ایک کرخت آواز گونجی۔

"جالندھر سے آیا ہوں، راستے میں مسلوں کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی اور دس مسلے مارنے کے بعد جب ہم ان کی لڑکیاں اٹھانے لگے تو لاہور کی پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ ہم چھپتے چھپاتے یہاں تک پہنچے ہیں۔" علی بخش جو مہندر سنگھ کا روپ اختیار کیے ہوئے تھا، فرضی کہانی سنانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور تین کڑیل جوان سکھ ہاتھوں میں توڑے دار بندوقیں لیے باہر آئے۔

"اور یہ کون ہے....." ان سے دریافت کیا گیا۔

"میرا بھرا ہے....." علی بخش نے کہا تو مندر کے محافظ سکھ ان دونوں کو اندر لے گئے۔ علی بخش نے انہیں اپنی بہادری اور مسلمانوں پر ظلم کی ایسی داستان سنائی کہ مندر کا پجاری اور وہاں موجود درجنوں سکھ اور ہندو بلوائی انہیں داد دینے لگے۔

"تم نے دیوتاؤں کو خوش کر دیا ہے مہندر سنگھ۔" مندر کا پجاری بولا۔ "ہمیں تم جیسے شیر جوانوں کی ضرورت ہے۔ دھرتی کا یہ بٹوارہ دیوی دیوتاؤں کو ناگوار لگ رہا ہے۔ آج ہم نے اپنا دھرم بچانے کی کوشش نہ کی تو کل کو یہ سارا لاہور، جو ہمارے دیوتاؤں اور تمہارے گورو صاحبان کا استھان ہے مسلے ہمیں یہاں نہیں رہنے دیں گے۔" ہرادہ کنڈ کے مندر کا پجاری ایک راکھشس کی مانند تھا، اس کا نام ہری داس تھا۔ اس نے علی بخش اور چچا افضل پر اپنا پورا اعتماد ظاہر کیا اور انہیں اپنے منصوبوں کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کے مکروہ عزائم اور گھناؤنے منصوبوں کی تفصیل سن کر چچا افضل تو کانپ کر رہ گیا۔ ان کے منصوبوں کے تحت اب ہندو آبادی کے علاقوں سے ملحقہ مسلمان گھرانوں خاص طور پر مہاجرین کیلئے بنائی گئی کالونیوں میں کالے جادو کی نحوست پھیلائی جانی تھی اور انہیں ڈرا دھمکا کر یہ ثابت کرنا تھا کہ یہ جگہیں آسیب زدہ ہیں۔ مندر میں موجودہ بلوائی، درندہ صفت اور وحشی انسان تھے۔ وہ اب تک سینکڑوں مسلمان لڑکیوں کو بے آبرو کرنے کے بعد قتل کر چکے تھے۔ ہری داس علی بخش کو اس تہہ خانے میں بھی لے گیا جس کے اوپر کمرے میں گنیش کی مورتیاں تھیں مگر اس کے نیچے پاپ کی دنیا آباد تھی۔ تہہ خانے میں دس مسلمان لڑکیاں پانچ سکھ جوانوں کے رحم و کرم پر چھوڑی ہوئی تھیں۔ علی بخش تو اس لمحے آپے سے باہر ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ کرپان پر پہنچ گیا تھا تاکہ ہری داس کو جہنم واصل کر کے مسلمان لڑکیوں کو بچا کر نکال لے جائے مگر یہ جذباتی رد عمل ان کی موت کا پروانہ بھی صادر کر سکتا تھا، کیونکہ مندر کے ہر کونے اور کمرے میں بلوائی پناہ گزین چھپے بیٹھے تھے۔ ہری داس کو قتل کر کے نکل جانا آسان کام نہ تھا۔

ہری داس انہیں اپنی وحشت اور اپنی شکتی (طاقت) دکھانے کیلئے اس کمرے میں بھی لے گیا جہاں اسلحہ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ بندوقیں، تلواریں، بلمیں، برچھے، کلہاڑیاں گویا ہر طرح کا سامان وہاں موجود تھا۔

"مہندرے..... یہ سرکار کا تحفہ ہے؟" ہری داس نے قہقہہ لگا کر بتایا۔

"میں سمجھا نہیں پنڈت مہاراج۔" علی بخش نے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔

''تم شاید نہیں جانتے، اس لیے کہ تم ابھی تازہ تازہ جالندھرے سے آئے ہو۔'' ہری داس اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔''انگریز سرکار نے تقسیم کا اعلان کرنے سے پہلے ہی مسلوں کے گھروں سے ہر قسم کا اسلحہ اٹھالیا تھا اور انہیں کہا کہ نقص امن کے خطرے کے تحت یہ اسلحہ مال خانے میں جمع کیا جائے گا مگر مسلوں کو کیا پتہ کہ انگریز سرکار کے مال خانے کون سے ہیں۔'' ہری داس کی آنکھوں سے وحشت اور منہ سے بدبو کے بھبکے آرہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس درندے نے انسانی خون پیا ہو۔

''انگریز سرکار کے مال خانے کون سے ہیں۔'' علی بخش نے معصومیت سے دریافت کیا۔

''تو بھی پکا سکھ ہے مہندرے.....'' ہری داس نے اپنی دھوتی کا پلو پکڑتے ہوئے پاؤں کھڑاؤں سے باہر نکالا اور فرش پر رکھی ہوئی بندوق پر پاؤں رکھ کر بولا:''مہندرے سرکار کے مال خانے دیوی دیوتاؤں کے یہ مندر ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ دیوی دیوتاؤں کے پجاریوں سے بڑھ کر کسی اور کو اس اسلحہ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

علی بخش اور چچا افضل کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ علی بخش کو آگ کے شعلوں میں جھلستے مسلمان بچے، عورتیں، مرد اور گولیوں، کرپانوں اور برچھیوں میں ترازو کیے جانے والے نہتے مسلمانوں کی لاشیں نظر آنے لگیں۔ وہ بہت سے ایسے مناظر دیکھ چکا تھا۔ وہ حیران ہوا کرتا تھا کہ بارسوخ مسلمان بھی اپنی حفاظت کرنے سے کیسے محروم ہوگئے تھے مگر اب اسے ساری بات سمجھ آگئی تھی۔ اس کے اندر جذبات کا لاوا ابلنے لگا اس نے دل ہی دل میں قسم کھائی:

''ہری داس! میں تجھے اور تیری ساری خباثتوں کو ختم نہ کردوں تو مجھے میری ماں دودھ نہ بخشے۔''

ہری داس ظلم کے نشے میں مدہوش، دیوی دیوتاؤں کے بھجن گاتا ہوا انہیں ایک اور کمرے میں لے گیا۔ یہ راہداری کا آخری کمرہ تھا، پیچ دار راہداریوں سے ہو کر وہاں تک پہنچا جا سکتا تھا۔ اس راہداری میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب سی مہک آنے لگی تھی۔ علی بخش اور چچا افضل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''پنڈت جی ہم بہت تھک چکے ہیں۔ اب آرام کرنا چاہتے ہیں۔'' علی بخش نے جان بوجھ کر اکتاہٹ کا اظہار کیا۔

''تمہاری تھکاوٹ دور کرنے کیلئے ہی تو مہندرے وہاں لے کر جا رہا ہوں۔'' ہری داس پراسرار لہجے میں بولا:''بھگوان کی نرتکیاں، داسیاں تمہاری سیوا کیلئے حاضر ہیں۔ تم ہمارے بیلی ہو مہندرے۔ بھگوان تم سے بہت خوش ہے۔''

وہ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے ان کے کانوں میں بھجن اشلوک، گھنٹیوں کی مدہم جھنکار کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ دونوں کیلئے یہ ماحول اجنبی تھا۔ عطر، کرعود، عنبر، مشک اور زعفران کے دیئے، اگر کی لکڑیاں دھیمی دھیمی آنچ پر سلگ کر راہداری کے ماحول کو مدہوش بنائے ہوئے تھیں اور انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے یہ عطریات کی مہک ان کے ذہنوں پر تسلط جما رہی ہے۔ وہ اپنے حواس کھو رہے ہیں۔ وہ پنڈت کے پیچھے اب معمول کی طرح چل رہے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ کمرہ بھی آگیا۔ پنڈت نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں پٹ کھول دیئے اور پھر خوشبوؤں سے بھرے کمرے سے ایک خوشگوار جاں سوز جھونکا باہر آیا..... چچا افضل تو اس قدر تیز مہک کو برداشت نہ کر سکا اور بن پیئے بہک گیا مگر علی بخش اپنے حواس پر قابو پانے میں کامیاب رہا۔

''بھگوان کی داسیو، اے ہرادہ کنڈ مندر کے مہان پجاری ہری داس کی نرتکیو، بھگوان کے مہمانوں کو سوئکار کرو۔''

سفید ساری میں ملبوس، پاؤں میں جھانجریں پہنے، ماتھے پر تلک لگائے، آنکھوں میں کھنچ کے کجرا لگائے دودھان پان سی داسیاں لہراتی بل کھاتی ان کے پاس آئیں۔ دونوں نے جھک کر پرنام کیا پھر پاؤں چھوئے، پھر اس کے بعد ایک نے علی بخش کا بازو تھام لیا اور دوسری نے چچا افضل کا..... اور دونوں انہیں لے کر اندر آ گئیں۔ دو تین داسیاں پجاری کے پاؤں چھونے کے بعد اسکے بازوؤں سے لپٹ گئیں اور پھر ہری داس خوشبوؤں سے معطر، حسن فتنہ گر داسیوں کے جھرمٹ میں فرش پر بچھی چاندنی پر بیٹھ گیا۔ داسیاں تین پیالے مشروب کے بھر کر لائیں اور ان تینوں کے سامنے رکھ دیئے۔ ہری داس تو پیالا غٹاغٹ پی گیا۔ چچا افضل نے بھی ہاتھ آگے بڑھایا مگر علی بخش نے ہلکا سا اشارہ کر کے اسے خبردار کر دیا۔ ہری داس نے جب دیکھا کہ اس کے دونوں مہمان پیالا نہیں پی رہے تو وہ بولا۔

"مہندرے..... بھگوان کا امرت جل پیالا کیوں نہیں پی رہے۔"

علی بخش سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی حرام مشروب ہے اس کے پیتے ہی وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائیں گے اور اس کے بعد ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس کے ذہن نے فوراً ایک بہانہ تراش لیا۔

"اے بھگوان کے مہمان پجاری..... کیا تم نہیں چاہتے ہم بھگوان کی نرتکیوں کے رقص سے دل نہ بہلا سکیں۔ ہم نے تمہاری ان محفلوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا مگر آج پہلی بار دیکھنے کا موقع ملا ہے تو جی بھر کر دیکھنے دو ..... امرت جل پی لیا تو ہم اپنے ہوش کھو دیں گے۔"

"چلو جیسے تیری مرضی....." ہری داس نے ان پر دباؤ نہ دیا..... علی بخش نے سکون کا سانس لیا اور اس کے بعد ہری داس نے نرتکیوں کو رقص و سرود کی محفل سجانے کا حکم دیا۔ لمحوں میں کمرے کا ماحول دھیمی دھیمی موسیقی اور نرتکیوں کے رقص سے جذبات کو مہمیز دینے لگا۔ آدھ گھنٹہ تک یہ محفل جمی رہی..... پھر علی بخش نے اپنے مطلب کی بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"پنڈت جی میں نے سنا ہے کہ کچھ مسلے بھی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔"

"ہا..... ہا..... ہا....." ہری داس کا نشے سے بھرپور قہقہہ گونجا۔ "مہندرے وہ صرف نام کے مسلے ہیں۔ وہ بھی کالی کے پجاری ہیں۔ یہ کالا علم سیکھنے والے مسلے ہمارے آلہ کار بن گئے ہیں اور مسلمان گھرانوں میں دیوتاؤں اور کالی کے منتر پھونک رہے ہیں۔ ہمارے لیے لڑکیاں لا رہے ہیں، کالے منتروں کیلئے کالے بکرے، الو، سور کی چربی، مردوں کی ہڈیاں اور بہت سی چیزیں دے رہے ہیں۔ جواب میں ہم انہیں کالی کی شکتی دے رہے ہیں۔ تم نے بڑے اچھے وقت میں یاد دلایا ہے تو آؤ تمہیں دکھاؤں..... اس وقت بہت سے مسلے شمشان گھاٹ میں بیٹھے چلہ کاٹ رہے ہیں۔"

ہری داس مضبوط اور ٹھوس بدن کا مرد تھا۔ آواز تو اس کی نشے میں ڈوبی ہوئی تھی مگر جب اٹھا تو اس کے قدموں میں ذرا بھی لرزش نہ تھی..... وہ علی بخش اور چچا افضل کو ساتھ لے کر کمرے سے نکلا اور اسی راہداری کے ایک پیچواں راستے میں قائم چور دروازے کے پاس پہنچا اور اسے دھکا دے کر کھول دیا..... باہر گھپ اندھیرا تھا اور جھینگر کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہری داس نے اپنے ایک سیوک کو بلایا اور اسے لالٹین لانے کو کہا۔ روشنی کا انتظام ہونے کے بعد ہری داس ان دونوں کو لے کر مندر سے نکلا تو یہ راستہ جھگیاں بادیاں کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ تھوڑا سا آگے باغ منشی بدھا اور اس کے کھیت آ گئے اور اس سے آگے شمشان گھاٹ تھا۔ شمشان گھاٹ تک پہنچنے کیلئے ایک چھوٹا سا لکڑی کا پل بنایا گیا تھا جس کے نیچے گندے پانی کا جوہڑ بہتا تھا۔

آیت کریمہ کی برکت

جب وہ دونوں پنڈت کی رہنمائی میں شمشان گھاٹ پہنچے تو سیاہ وتاریک رات کے سناٹے میں ایک پر ہول قیامت ان کی منتظر تھی۔ شمشان گھاٹ ایک کھلے میدان کی طرح تھی مگر اس کے کناروں پر بوڑھے برگد کے درخت تھے۔ان کے نیچے کچھ قبریں بھی تھیں جن کے کتبوں پر دیئے روشن تھے اور بہت سے افراد برگد کے نیچے قبروں کے پاس چلے کاٹتے نظر آنے لگے۔ وہ ان کے قریب پہنچے تو دیکھا ہر کوئی روشن دیئوں پر نظریں جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ سیاہ لبادے میں ملبوس ان کے چہرے قدرے جھکے ہوئے تھے اور ان کے گرد ایک سرخ دائرہ کھنچا ہوا تھا۔ ہر شخص کے سامنے جانوروں کی کھوپڑیاں خون سے بھرے پیالے اور مختلف قسم کی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں، جس کسی کا کوئی عمل پورا ہوتا تو وہ پیالے سے ایک گھونٹ بھرتا اور اس کے بعد کھوپڑی یا دوسری گندی اشیاء اٹھا کر مورتی کے آگے رکھ دیتا۔

"یہ سب مسلمان ہیں..... مہندرے۔" ہری داس نے پراسرار لہجے میں کہا۔

"مگر اس وقت یہ سارے کالا علم سیکھنے کیلئے میرے سیوک اور داس بنے ہوئے ہیں۔ میں انہیں ہر رات کا علم بتاتا ہوں اور یہ میری آشیر باد سے عمل کرتے ہیں۔ مجھے وشواس ہے بھگوان کی شکتی سے میرے یہ سیوک جب اپنے اپنے گھروں میں جائیں گے اور اپنی اپنی آبادیوں میں پھیلیں گے تو ہماری ماتا کی لاج بڑھے گی۔"

ہری داس اس دوران علی بخش سے مخاطب تھا جب چچا افضل ایک شخص کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ اسے کچھ شبہہ ہوا کہ اس شخص کو اس نے کہیں دیکھا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ شخص اپنے چلے میں غرق تھا، اس کا چہرہ قدرے جھکا ہوا تھا مگر خدوخال سے اس کی صورت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"آہ میرے خدا..... شاد تو....." چچا افضل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ شکر ہوا کہ کسی نے سنا نہیں ورنہ چچا افضل پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔ چچا افضل شاد کو اس روپ میں دیکھ کر لرز گیا۔ شاد میرا ماموں تھا اور بندے حسن کا بھائی تھا۔ ہجرت کے دوران یہ ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا مگر اب اسے کالی کے پجاری کے روپ میں دیکھ کر چچا افضل خوف سے کانپنے لگا۔ اسی لمحہ علی بخش اور ہری داس اس کے قریب آ گئے اور پھر واپس مندر کی طرف چل دیئے۔ لالٹین چچا افضل نے اٹھا رکھی تھی۔

راستے میں علی بخش کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس نے چچا افضل کو بتائے بغیر ہی ایک بڑا فیصلہ کر لیا اور اچانک کرپان نکال کر ہری داس کے سینے میں گھونپ دی۔ چچا افضل بھونچکا رہ گیا اور لالٹین اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تو علی بخش دہاڑا :

"یار افضل ذرا سنبھل کر، اس شیطان کو مارنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ تم نے دیکھا نہیں اس نے مسلمان لڑکیوں اور لڑکوں کو کس قدر گمراہ کر دیا ہے۔"

ہری داس پر حملہ چونکہ غیر متوقع تھا اس لیے وہ سنبھل نہ سکا اور نیچے گر گیا۔ علی بخش تجربہ کار آدمی تھا اس نے ہری داس کی چیخ بھی نہ نکلنے دی اور کرپان سے اس کا گلا کاٹ دیا اور لاش اٹھا کر جوہڑ میں پھینک دی۔ کرپان کو مٹی سے صاف کرنے کے بعد اس نے چچا افضل کا ہاتھ پکڑا اور جھگیاں باویاں سے ہوتا ہوا گورا قبرستان کی آبادی کی طرف نکل گیا۔

گھر آنے سے پہلے چچا افضل نے اپنے پہلے والے کپڑے پہن لیے تھے اور گھر والوں کو کسی بھی قسم کا واقعہ نہ سنایا اور خاموشی سے سو گیا۔ ہری داس کے قتل سے زیادہ اس کی آنکھوں کے سامنے ماموں شاد کا چہرہ آ رہا تھا..... اگلی صبح چچا افضل ماموں بندے حسن کی تلاش میں دوبارہ نکلنے لگا تو گھر میں اچانک افراتفری مچ گئی۔ معلوم ہوا کہ گھر کی خواتین کے وہ کپڑے جو صندوقوں میں محفوظ تھے، کسی نے قینچی سے کاٹ دیئے ہیں اور ان میں سے خون آلود لمبے لمبے بال برآمد ہوئے ہیں۔ چچا افضل کو تو سمجھ آ گئی کہ کالی کے پجاری کالے عاملوں نے اپنے مکروہ منصوبے پر عمل شروع کر دیا ہے اور اب یقیناً گڑی کے باقی گھروں میں بھی ایسے ہی واقعات رونما ہوں گے..... مگر معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ ہمارے ہمسائے میں اس قسم کی کوئی پراسرار واردات نہیں ہوئی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ گھر کی سبھی خواتین کے کپڑے تو کٹ گئے تھے مگر حمیداں کی شلوار قمیض بالکل محفوظ تھی۔ پھوپھی حاجرہ نے میری

والدہ سے مشورہ کے بعد اس روز آیت کریمہ پڑھانے کا فیصلہ کیا اور چچا افضل سے کہا کہ آج وہ گھر ہی میں رہے اور نذر نیاز کیلئے سودا سلف خرید لائے۔ لہٰذا جب وہ بازار جانے لگے تو حمیداں بھی ان کے ساتھ باہر جانے کیلئے تیار ہو گئی۔ میری والدہ نے وجہ دریافت کی تو بولی :

''بہن جی میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔ میں اپنے والدین کی تلاش میں قلعہ لچھمن سنگھ جا رہی ہوں''

''ارے تو کیا باؤلی ہو گئی ہے۔ آج گھر میں آیت کریمہ پڑھایا جانا ہے اور تو ہے کہ باہر جا رہی ہے۔ آرام سے گھر بیٹھ جا..... ہم تمہارے والدین کیلئے بھی دعا کریں گے۔'' والدہ نے اسے سمجھایا مگر وہ اپنی ضد کی پکی نکلی اور چچا افضل کے ساتھ چلی گئی۔

چچا افضل نے راستے میں اسے کہا: ''حمیداں پہلے بازار سے سودا خرید لیتے ہیں، پھر اسے گھر دے کر تیرے ساتھ چلا جاؤں گا۔'' حمیداں نے ہامی بھر لی اور چچا افضل داتا دربار کے پاس پرانے بازار سے اشیاء خریدنے لگا۔ وہ حمیداں کو ایک جگہ کھڑا کر کے گیا تھا مگر جب واپس آیا تو حمیداں غائب تھی۔ چچا افضل نے پہلے تو اسے آگے پیچھے تلاش کیا پھر یہ سوچا کہ شاید وہ قلعہ لچھمن سنگھ اکیلی چلی گئی ہے۔ لہٰذا وہ گھر واپس آ گیا۔ گھر کی خواتین نے کٹری کی دوسری خواتین کو بھی آیت کریمہ کیلئے بلایا تھا اور شام تک آیت کریمہ پڑھی جاتی رہی۔ بعد میں دعائے خاص کی گئی اور اللہ سے اس کی رحمت اور اعانت کی مدد مانگی گئی۔ آیت کریمہ کی یہ برکت ہے کہ یہ جس گھر میں بھی پڑھا جائے وہاں شیطان نہیں ٹھہر سکتا اور اس کی کارستانیاں بند ہو جاتی ہیں۔

پھوپھی حاجرہ انتہائی عبادت گزار اور وظیفہ کرنے والی خاتون تھیں، لہٰذا انہوں نے والدہ کے ساتھ مل کر دیگر قرآنی وظائف پڑھے اور پانی دم کر کے کوارٹر کے سارے کونوں میں چھڑک دیا۔

شام ہو رہی تھی اور حمیداں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

''نگوڑی جانے کہاں مر گئی ہے۔'' میری والدہ کو اس کے بارے میں تشویش لاحق ہوئی۔

''آج کل حالات اس قدر خراب ہیں پھر بھی یہ لڑکی ضد کر کے چلی گئی ہے۔'' چچا افضل غصہ سے بولا۔

''میرا پتر تو جا اور اس کو تلاش کر کے لا''.....

چچا افضل لالٹین اٹھا اور لاٹھی لے کر باہر نکلا جب وہ کچا راوی سے اوپر ٹیکسالی کی طرف جا رہا تھا تو اچانک ماموں شاد کی نظر اس پر پڑ گئی..... ماموں شاد سیاہ گھیرے دار لبادے میں ملبوس تھا۔ گلے میں مالائیں اور سر پر سیاہ پگڑی باندھی ہوئی تھی، آنکھیں سرخ و متورم تھیں۔

''افضل یہ تو ہی ہے نا..... کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔'' ماموں شاد دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا۔ چچا افضل اس کا بھیانک اور مکروہ روپ دیکھ چکا تھا مگر اس وقت انکا خون جوش مارنے لگا۔ اس نے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے ماموں شاد کو گلے لگا لیا اور اسے جب بتایا کہ مستری نذر محمد کے کوارٹروں میں رہ رہے ہیں تو ماموں شاد خوشی سے اچھل پڑا اور چچا افضل اسے ساتھ لے کر گھر آ گیا۔

ماموں شاد کے گھر آتے ہی خواتین کے پژمردہ چہروں پر تازگی آ گئی۔ ماموں شاد نے بتایا کہ ماموں لال بھی ان کے ساتھ ہیں اور قلعہ لچھمن سنگھ میں رہ رہے ہیں، جب ماموں شاد گھر والوں سے مل رہے تھے تو حمیداں بھی گھر واپس آ گئی۔ وہ اور ماموں شاد ایک دوسرے کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ دونوں کا تعارف کرا دیا گیا، مگر میری والدہ کو ایک وہم سا ہو گیا تھا۔ انہیں شک ہوا کہ شاد اور حمیداں ایک دوسرے سے آشنا ہیں۔ یہ والدہ کا وجدان تھا یا الہام..... تاہم انہوں نے اپنے شک کا اظہار نہ کیا۔

ماموں شاد اگلے روز ماموں لال کو بھی گھر لے آئے۔ ماموں لال تنہائی پسند اور خاموش طبع انسان تھے۔ ہر وقت اپنے حال میں مست رہتے۔ ماموں شاد کو جب ماموں بندے حسن کی گمشدگی کے بارے میں بتایا گیا تو انہوں نے کسی قسم کی پریشانی ظاہر نہ کی۔ البتہ گھر والوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا: ''میرا وشواش کہتا ہے کہ وہ ہم سے بہت جلد آملیں گے۔''

میری والدہ نے اس کی زبان پکڑلی: ''شاد تم ہندی کیوں بولنے لگے ہو''.....

ماموں شاد یکدم سنبھل گیا۔ اس نے بہانہ تراشا :

''بہن جی! اتنے عرصے سے جان بچانے کیلئے کبھی ہندوؤں کا روپ کبھی مسلمانوں کا اور کبھی سکھوں کا روپ دھارے رہا ہوں کہ میری اپنی زبان گڈمڈ ہو گئی ہے۔'' ماموں شاد نے گھر والوں کو ایسی رام کہانی سنائی کہ وہ سب اس کی دلگداز داستان سن کر رو دیے مگر چچا افضل اور میری والدہ کو ماموں شاد کی کہانی جھوٹ کا پلندہ لگی۔

دریائے راوی کے کنارے گناہ

یہ چند روز بعد کی بات ہے۔ کٹری سے ایک نوجوان مسلمان لڑکی غائب ہو گئی اور پھر اس کی لاش بر تلاؤ کی آبادی میں واقع کالی کے مندر سے ملی۔ اس کی عزت کا دامن تار تار کر دیا گیا تھا اور اعضاء کاٹ کر کالی کے مندر کے ارد گرد پھینک دیے گئے تھے۔ یہاں سے راوی کا کنارہ بہت نزدیک تھا اور یہاں صبح سویرے ہندو عامل اشنان کرنے کے علاوہ پوجا پاٹ اور رات کو چلے کرتے تھے۔ (یہ چلے اور پوجا پاٹ اب بھی ہوتی ہے۔ روزانہ سورج نکلنے سے پہلے بہت سے مسلمان راوی کے پل کے آس پاس نذر نیاز کی چیزیں پھینکتے ہوئے اور جانوروں پرندوں کو گوشت کھلاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ راتوں کو یہاں چلے کیلئے جو چراغ روشن کیے جاتے ہیں اور جادو ٹونے کیلئے جو نوکیلی سوئیوں سے بت بنائے جاتے ہیں وہاں ریت میں دھنسے ملیں گے) راوی کا یہ کنارہ ایک صدی سے پوجا پاٹ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ صبح ایک مسلمان دریا پر نہانے گیا اور واپسی پر جب کالی کے مندر کے پاس سے گزرا تو اس نے لڑکی کی لاش دیکھ کر پولیس کو اطلاع کر دی تھی مگر یہ پر آشوب حالات کا زمانہ تھا لہٰذا یہ معاملہ دبا دیا گیا۔ ہندو اس دور میں بھی بااثر تھے۔ کالی کے مندر کے پجاریوں نے انتظامیہ کو باور کرا دیا تھا کہ یہ ان کے خلاف سازش ہے تاکہ مسلمان ان کے خلاف انتقامی کارروائی کریں۔

پھر تو کٹری کے مکینوں پر نحوست یوں برسنے لگی جیسے برسات میں دھواں دھار گرج چمک کے ساتھ بارش ہوتی ہے۔ ہر روز کسی نہ کسی گھر میں خون کی بارش ہونے لگی، گلیوں میں خون آلود انسانی ہڈیاں اور کالے جانوروں کی خون آلود کھوپڑیاں نظر آنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ علاقہ آسیب زدہ کہلانے لگا۔ پھوپھی حاجرہ اور میری والدہ نے باوا جی کے عطا کردہ وظائف پڑھنے شروع کر دیے۔

یہ نوچندی جمعرات تھی، پھوپھی حاجرہ اور والدہ عشاء کے بعد وظیفہ پڑھنے کے بعد کمرے میں جا کر سو گئیں۔ سردیوں کا آغاز تھا، رات کو میری بہن جو دو تین برس کی ہو چکی تھی اچانک رونے لگی۔ والدہ نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی مگر وہ پانی مانگنے لگی۔ پانی کا گھڑا باہر صحن میں رکھا ہوا تھا۔ والدہ کمرے سے نکلیں۔ آسمان دودھیا روشنی میں نہایا ہوا تھا۔

انہوں نے گھڑے سے پانی لیا اور واپس کمرے میں جانے لگیں تو اچانک ان کی نظر ماموں شاد کی چارپائی پر جا ٹکی، چارپائی خالی تھی جبکہ ساتھ والی چارپائی پر چچا افضل اور ماموں لال سوئے پڑے تھے۔ پھر ان کی نظر دوسرے کمرے پر پڑی جس میں پھوپھی حاجرہ اور حمیداں کے علاوہ دوسری عورتیں اور بچیاں سوتی تھیں۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

والدہ نے جھٹ سے کھلے دروازے کے قریب جا کر سن گن لینے کی کوشش کی مگر انہیں کچھ سنائی نہ دیا تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ کمرے میں چاند کی روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ کیا دیکھتی ہیں کہ حمیداں کی چارپائی بھی خالی ہے۔ اب ان کا شک یقین میں بدل گیا کہ شاد اور حمیداں کے درمیان آشنائی ہے اور دونوں ہی اس وقت گھر سے غائب تھے۔ والدہ نے اپنے حواس پر قابو رکھا اور وظیفے کا ورد کرنے لگیں اور جلدی سے چچا افضل کو اٹھا کر صورت حال سے آگاہ کیا۔

پھر افضل چچا سے کہنے لگیں ''میں چھوٹی کو پانی پلا لوں، پھر دونوں مل کر انہیں ڈھونڈتے ہیں۔ چھوٹی پانی پی چکی تو والدہ اور چچا افضل گھر سے نکلنے لگے تو انہیں دروازہ بھی کھلا ہوا ملا..... چچا افضل نے احتیاطاً ایک کلہاڑی اٹھالی۔ کوارٹر سے باہر ایک چھوٹی سی گلی تھی اور اس سے آگے مستری نذر محمد کا آرا اور ساتھ ہی برگد کا پرانا درخت تھا۔ میری والدہ اور چچا افضل نہایت احتیاط سے دیواروں کی آڑ لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔ چاند نے سارے آسمان پر اپنا نور پھیلا رکھا تھا۔ ہر سو سکوت طاری تھا مگر برگد کے درخت پر نہ جانے کیا قیامت گزر رہی تھی کہ سوئے ہوئے پرندے اچانک جاگ اٹھے تھے۔ چاند کے سامنے بھی یکایک ایک آوارہ کالی بدلی آ گئی۔ کچھ دیر کیلئے تاریکی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

والدہ اور چچا افضل جب مستری نذر محمد کے آرے کے پاس پہنچے تو پرندوں کا شور قیامت کا منظر پیش کرنے لگا۔ پھر یکدم برگد کے نیچے سے ایک شعلہ سا اٹھا اور برگد کے درخت کو گہرے نارنجی شعلوں نے گھیرے میں لے لیا۔ پلک جھپکتے میں پھڑ پھڑاتے معصوم پرندے شعلوں کی لپٹ میں آ کر خاکستر ہو گئے۔

اب ایک بار پھر خاموشی کا راج تھا مگر یہ خاموشی کسی پر ہول سناٹے کی مانند تھی۔ والدہ اور چچا کیلئے یہ منظر روح فرسا تھا اگرچہ وہ اپنے عہد کے بڑے عاملوں کی اولاد تھے مگر انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس طرح کے مناظر نہیں دیکھے تھے۔ اس سے پیشتر کہ والدہ گھر کو پلٹ جاتیں۔ برگد کے درخت کے نیچے ایک دیا روشن ہو گیا اور تین سائے اس کے گرد طواف کرنے لگا پھر تینوں نیچے بیٹھ گئے اور ایک نسوانی گرجدار طاغوتی، شراروں جیسی آواز گونجی :

"شاد، پدمنی تجھ سے خوش ہو گئی..... بندے حسن بھی کالی کے مندر میں جاپ کرتا رہا ہے..... میں تم دونوں سے بہت خوش ہوں مگر حمیداں کے روپ میں میرا وجود اب زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ میرا وہاں دم گھٹنے لگا ہے۔ شاد تمہاری بہن اور پھوپھی حاجرہ کے وظیفے میری آتما پر کوڑے برساتے ہیں..... انہیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میں اصل میں کون ہوں اور بندے حسن اور تم اب میرے لیے کس قدر اہم ہو چکے ہو۔ سنو شاد..... اگلی کالی منگل کی رات کو تم دونوں پھر آپس میں ملو گے اور کالی ماتا کی آشیر باد کے بعد تمہیں اس قدر شکتی مل جائے گی کہ یہاں دیوتاؤں کی سرزمین پر کوئی تمہیں مات نہیں دے سکے گا۔ کسی پاپی نے ہمارے سیوک ہری داس کو مار دیا ہے۔ شاد! تم اسے تلاش کرو..... میں بھی اس تک پہنچ ہی جاؤں گی اور اس کتے پاپی کو ایسی اذیت دے کر ماروں گی کہ اس کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی..... یاد رکھو کالے علوم سیکھنے کے بعد اگر تم ان سے تائب ہوئے تو جل کر راکھ ہو جاؤ گے..... اب جاؤ اور اس رات کی بھینٹ چڑھانے کیلئے حاجرہ اور اپنی بہن کو قتل کر دو..... جب تک وہ زندہ ہیں تم اور میں اس گھر میں سکون کیساتھ نہیں رہ سکیں گے۔"

والدہ اور چچا افضل یہ سن کر تھرا گئے۔ خوف سے ان کا خون خشک ہو گیا۔ حمیداں، شاد اور بندے حسن کا یہ روپ دیکھ کر ان کی روحیں لرز گئیں اور وہ سوچنے لگے کہ ان ظالموں سے اب وہ کیسے بچ پائیں گے۔ روحانی علوم کے پروردہ خاندان کے یہ جوان اب کالے اور سیاہ کاریجاریوں اور ایک طاغوتی طاقت کے آلہ کار بن گئے تھے۔ وہ بڑی احتیاط سے گھر پہنچے اور دروازے بند کر کے جلدی سے پھوپھی حاجرہ کو جگا کر ساری صورتحال بتا دی۔ پھوپھی حاجرہ نے ان کی توقع کے برعکس ٹھنڈی آہ بھری اور ایک ایسی بات کہہ دی کہ میری والدہ اور چچا افضل پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

☆☆☆☆☆☆

ماحول پر سوگواری چھا گئی تھی۔ پھوپھی حاجرہ نے بات ہی ایسی کہی تھی کہ میری والدہ اور چچا جو پہلے ہی خوف سے کانپ رہے تھے' پھوپھی کی بات سے جیسے ان کی جان نکل گئی۔

"میرے بچو! مجھے معلوم تھا کہ یہ کلموہی کون ہے مگر میں نے اسے باندھ کر رکھا ہوا تھا۔ اگر میں پہلے یہ بتا دیتی کہ پدمنی حمیدہ کے روپ میں اس گھر میں موجود ہے تو تم اور سارے بال بچے بے موت مارے جاتے..... لیکن باوا جی نہال شاہ کے دیئے ہوئے وظائف کی بدولت میں نے تم لوگوں کو بچانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اب اگر وہ ہمارے ہی مردوں کے ساتھ مل کر ہمیں ختم کرنا چاہتی ہے تو اس سے بچاؤ کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے....." یہ کہہ کر پھوپھی حاجرہ نے پراسرار خاموشی اختیار کر لی۔ اس کی آنکھیں بے چینی سے گھوم رہی تھیں مگر ذہن کسی نئے اجالے کی تلاش میں تھا۔

" میں اپنی قربانی دے کر تم لوگوں کی حفاظت کروں گی۔ "

پھوپھی حاجرہ نے ٹھوس اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ تم جلدی سے بچوں اور دوسرے افراد کو ایک ہی کمرے میں بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا لو۔ میں کمرے پر چند وظائف پڑھ کر بندش قائم کر دوں گی تاکہ پدمنی' شاد اور بندے حسن تم تک نہ پہنچ سکیں۔"

والدہ نے پھوپھی کو اس کے فیصلے سے روکنے کی کوشش کی مگر پھوپھی نے فیصلہ نہ بدلا اور صاف صاف کہہ دیا: ''پہلے میں میں پدمنی کو قابو کرنے کی کوشش کروں گی۔ میں اسے اس گھر سے دور رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی تو پھر وہ اپنے گرگوں کے ساتھ مل کر مجھ پر اور تم پر حملہ کرے گی..... لہذا عقل اور حالات کا تقاضا یہی ہے کہ تم لوگ میری بات مان لو اور جلدی کرو..... ہمارے پاس سوچنے سمجھنے کے لئے وقت نہیں ہے۔''

والدہ اور چچا کے پاس اب پھوپھی کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا' لہذا وہ جلدی سے بچے اور دیگر افراد کو لے کر کمرے میں بند ہو گئے اور پھوپھی حاجرہ ان کے کمرے پر حفاظتی حصار باندھنے کے بعد دیوار کا سہارا لے کر اپنے کمرے میں پہنچ گئیں۔

گھر کے ہر فرد کا دل خوف سے پھٹ رہا تھا۔ لمحات قیامت خیز انداز میں سرک رہے تھے۔ والدہ اور چچا دونوں مسلسل آیت الکریمہ کا ورد کر رہے تھے۔ بچے اور دوسرے افراد بھی اس ناگہانی آفت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ بچے تو سہم گئے تھے اور کچھ رونے لگ پڑے تھے..... والدہ نے بچوں کو کلمہ طیبہ سکھایا ہوا تھا۔ ان کے کہنے پر بچے بھی کلمہ پاک کا ورد کرنے لگے۔ خوف اور دہشت کا دباؤ اس وقت بڑھ جاتا ہے جب آپ کو عدم تحفظ کا احساس زیادہ ہونے لگے' بالخصوص ایسے حالات میں جب گھر کے رکھوالے ہی خون کے پیاسے بن جائیں تو بے سہارا ہونے کا احساس بھی کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ یہی حالت گھر کے سبھی افراد کی تھی۔ ہر ایک کا خون خشک ہو چکا تھا مگر آیت الکرسی کا ورد پھر بھی ان کی زبانوں پر جاری تھا۔ یوں ہی' سہمے سہمے سے بچوں اور بڑوں کو اونگھتے' سوتے' جاگتے کافی وقت گزر گیا لیکن اس دوران باہر کسی قسم کا شور سنائی دیا نہ کھٹکا ہوا۔ چچا افضل نے کئی بار ڈرتے ڈرتے دروازے کے ساتھ کان لگا کر باہر کی سن گن لینے کی کوشش بھی کی مگر باہر تو مکمل سکوت تھا۔

والدہ اور چچا کو ایک بار شبہ ہوا کہ شاید انہوں نے کوئی خواب دیکھا ہے یا ان کی نظروں نے دھوکا کھایا ہے۔ ان کا یہ خیال اس وقت مضبوط تر ہوتا گیا جب رات بیت گئی اور فجر کی اذانیں بلند ہونے لگیں۔ گھر کے سبھی افراد کا معمول تھا کہ فجر کی اذان کے ساتھ ہی وہ جاگ اٹھتے تھے اور نماز پڑھنے کے بعد قرآن شریف کی تلاوت کرتے اور اجالا ہونے کے بعد ناشتے کی تیاری کا عمل شروع ہو جاتا..... مگر ان قیامت خیز' پراسرار اور پرہول لمحات میں کسی کو کمرے سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوئی' لیکن انہیں باہر نکلنا ہی تھا۔ صبح جب سورج خاصا بلند ہو چکا اور ماحول میں چہل پہل کا آغاز ہوا تو والدہ اور چچا کو اطمینان سا ہو گیا..... اس کے باوجود وہ کمرے سے باہر قدم رکھنے کے لئے تیار نہ تھے۔ انہیں ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ ممکن ہے بندے حسن' شاد اور حمیداں دروازے کے ساتھ دبک کر بیٹھے ہوں اور اس انتظار میں ہوں کہ جونہی کمرہ کھلے گا وہ دھاوا بول دیں گے۔

اسی سوچ بچار میں کہ باہر کیسے نکلا جائے' خاصا وقت گزر گیا۔ بچوں نے بھوک سے بلبلانا شروع کر دیا تو معاً کمرے کی اس کھڑکی کا خیال آیا جو باہر گلی میں کھلتی تھی..... چچا افضل نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کھولی تو تازہ ہوا کے جھونکوں نے کمرے کے ماحول کو تر و تازہ کر دیا۔ باہر خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ اس دوران گلی میں رونق ہو چکی تھی لہذا چچا افضل نے جرأت کر کے دروازہ کھولنے کا فیصلہ کیا اور کمرے میں رکھا ہوا لکڑی کا ڈنڈا ہاتھ میں پکڑ کر باہر آئے۔ گھر کے باقی افراد بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گئے۔

گھر کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ والدہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ انہوں نے گھر کا بڑا دروازہ خود بند کیا تھا مگر اب یہ کھلا ہوا تھا۔ چچا افضل لپک کر پھوپھی حاجرہ کے کمرے کی طرف دوڑے اور پھر جوں ہی ان کی نظر کمرے میں پڑی' وہ چیخ مار کر الٹے قدموں باہر نکل آئے..... والدہ بھی بھاگی اور کمرے میں پہنچ کر دیکھا تو پھوپھی حاجرہ خون میں لت پت کمرے کے درمیان میں گری پڑی تھیں..... انہیں بڑی بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا تھا۔ پھوپھی کی لاش کے پاس ادھ جلے بالوں کا ایک گچھا بھی پڑا نظر آیا۔ گھر میں بین شروع ہو گئے۔ محلے دار اکٹھے ہو گئے' پولیس آئی۔ شام تک تفتیش شروع ہوئی مگر کسی کے ہاتھ کوئی سرا نہ آیا کہ پھوپھی حاجرہ کیسے قتل ہوئی ہے؟ والدہ اور چچا افضل نے پولیس کو بتانے سے گریز کیا۔ ان دنوں پولیس فسادات کی وجہ سے ویسے ہی مصروف تھی..... وہ ان کی اس بات پر کیسے یقین کر لیتی کہ یہ قتل پراسرار اور شیطانی قوتوں نے کیا ہے جن کے آلہ کاروں میں ان کے اپنے بھی شامل ہیں۔ اس موقع پر بعض عورتوں نے حمیداں کے بارے میں دریافت بھی کیا اور ماموں شاد کے بارے میں بھی پوچھا مگر والدہ نے انہیں بتایا کہ وہ کل اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی تھی جبکہ شاد' بندے حسن کی تلاش میں گیا ہوا ہے۔ وہ آپا دھاپی کا دور تھا۔ ہر کسی کو معلوم تھا کہ نجانے کب اور کیسے کون کسی سے بچھڑ جائے۔

پھوپھی کے کفن دفن سے فرصت کے بعد سب سے بڑا مسئلہ رات گزارنے کا تھا۔ والدہ اور چچا کو یقین تھا کہ یہ قتل حمیداں کی شیطانی قوتوں ہی نے کیا ہے۔ لیکن وہ اس بات پر حیران تھے کہ وہ ساری رات جاگتے رہے ہیں مگر نہ انہیں گھر کے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی' نہ کسی کے دیوار پھلانگ کر اندر آنے کا پتہ چلا اور نہ پھوپھی کے کمرے سے کوئی شور بلند ہوا۔ یہ قتل اس قدر خاموشی کے ساتھ کیسے ہو گیا؟ والدہ جتنا سوچتی گئیں' ان کا دماغ الجھتا گیا۔ ان کے ذہن میں بالوں کا ادھ جلا گچھا اٹک گیا تھا کہ وہ کس کے بال تھے کیونکہ پھوپھی کے بال سفید تھے اور وہ سیاہ اور لمبے بال تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد انہوں نے سب گھر والوں کو کمرے میں بند کر لیا اور نماز کے بعد وظائف پڑھنے لگیں۔ بڑے بڑے عاملوں کے گھروں کی خواتین کو شروع ہی سے وظائف کا عادی بنا دیا جاتا ہے تاکہ بوقت ضرورت وہ انہیں اپنے تحفظ کے لئے استعمال کریں۔ انسان عبادات میں بے شک کوئی کوتاہی نہیں کرتا لیکن شیطانی قوتوں کی جادوگری کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان کو وظائف کی خصوصی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ روحانی طاقت بڑے کشٹ جھیلنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ میری والدہ نے یہ کشٹ تو نہیں جھیلے تھے

مگران کا دل ایمان کی قوت سے بھرا ہوا تھا۔ اللہ تعالی کی ذات پر بے حد یقین تھا۔ ویسے بھی کسمپرسی اور بے سہارا و ناتواں ہونے کا احساس انسان کو اللہ کے قریب لے آتا ہے۔ ان حالات میں وہ مکمل یکسوئی اور گڑگڑا کر اپنے مولا سے مدد مانگتا ہے۔ اس رات میری والدہ مصلے پر بیٹھی نوافل ادا کرتی رہیں اور سورۂ جن اور آیت الکرسی پڑھتی رہیں۔ انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی آنکھ نہیں جھپکی اور رو رو کر گھر کے افراد کی حفاظت کے لئے دعائیں کرتی رہیں.....۔

رات کا آخری پہر تھا جب ان پر غنودگی چھانے لگی اور وہ مصلے ہی پر سو گئیں۔ یہ پہر اللہ کے برگزیدہ بندوں کی عبادت کا ہوتا ہے۔ وہ فجر سے ایک گھنٹہ پہلے اس پہر کی سعادت سے اپنے قلب و نظر کو منور کرنے کے لئے تہجد پڑھتے اور ذات الہیٰ سے راز و نیاز کرتے ہیں۔ ان لمحات میں بدی کی قوتیں اپنے ٹھکانوں کو لوٹ جاتی ہیں اور پوری کائنات پر فرشتے نورانی علوم کو مسلط کر دیتے ہیں۔ کالے علم کے پجاری اس پہر سے بہت ڈرتے ہیں' لہذا وہ اپنے چلے اس وقت سے پہلے ختم کر کے بوریا بستر لپیٹ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اللہ پاک کی ذات کو یہ پہر بہت عزیز ہے اور وہ اس میں عبادت کرنے والوں کو مایوس نہیں کرتا..... ویسے تو بحیثیت مسلمان اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل کے در کسی بھی وقت بند نہیں ہوتے' مگر یہ اس کی شان جلالی ہے کہ وہ کس پہر کی عبادت کو اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے.....

والدہ کو مصلے پر سوئے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ انہیں خواب میں میرے دادا نظر آئے انہوں نے والدہ کو تسلی دی اور کہا'' کبھی اللہ کی ذات اپنے بندوں کا امتحان لینے کے لئے انہیں مصائب میں مبتلا کرتی ہے۔ تم ہمت کرو اور افضل سے کہو کہ وہ بھی اللہ کی عبادت کیا کرے اور خاندانی وظائف پڑھا کرے۔'' والدہ جب بیدار ہوئیں تو انہوں نے چچا افضل کو خواب کے بارے میں بتایا۔ چچا نوجوان تھے اور زیادہ عبادت گزار بھی نہیں تھے۔ کبھی کبھار نماز پڑھ لیتے مگر میری والدہ نے انہیں نماز اور وظائف کا پابند بنا دیا۔ اللہ نے کرم کیا اور کئی ہفتے آرام و سکون سے گزر گئے۔ انہیں پدمنی اور اس کے گرگوں سے خطرہ تھا۔ اللہ کی ذات نے میری والدہ کی دعاؤں سے سب کو محفوظ رکھا تھا' اس کے باوجود دلوں میں وسوسے جنم لیتے تھے۔ کمزور انسان جو تھے۔ ایک روز چچا افضل کے ذہن میں نہ جانے کیا سودا آیا کہ وہ کہنے لگے :

''آپا! میں نے عملیات سیکھنے کا ارادہ کر لیا ہے اور اس کے لئے کل داتا صاحب جاؤں گا اور وہاں کسی ہستی کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا..... پدمنی اور اس کے شیطانی چیلوں کا علاج کرنے کے لئے مجھے بھی عملیات کی طاقت چاہیے۔''

''دیکھ افضل! میں تجھے منع نہیں کروں گی۔ اگر تو یہ کام سیکھ لے تو میں سکھ کا سانس لوں گی مگر تجھے یہ بات ذہن میں رکھنی ہو گی کہ عملیات دو دھاری تلوار ہے۔ اس پر نہایت احتیاط اور صبر و تحمل کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ نجانے کب کوئی نیکی کی آڑ میں گمراہ کر دے۔ جسے تم بزرگ سمجھ کر اس کی تعلیمات پر چلنے کا ارادہ کرو تو یہ دیکھ لینا کہیں وہ شیطان ہی نہ ہو..... کیونکہ شیطان نیک بندوں کے لبادے میں چھپ کر بھی حملہ کرتا ہے۔'' میری والدہ نے چچا افضل کو سمجھایا۔

''آپا! میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' چچا افضل نے میری والدہ کو تسلی دی اور کہا۔''انشاءاللہ میں کل صبح اس کام کے ارادے سے جاؤں گا۔'' اور پھر چچا افضل واقعی ایک بزرگ کا دامن پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے ابھی علوم کے ابتدائی مدارج ہی طے کئے تھے کہ اللہ تعالی نے میرے والد اور دادا کو بچھڑے ہوؤں سے ملا دیا..... چچا افضل اس روز قصور میں ایک بزرگ کے مزار پر چلہ کشی کے لئے گئے تھے جب وہاں انہوں نے میرے والدہ میاں اشرف کو دیکھ لیا۔ ان دنوں قصور میں بھی مہاجرین کا کیمپ لگا ہوا تھا۔ میرے والد اور دادا مہاجر کیمپ میں ٹھہرے ہوئے تھے اور روزانہ شام ہوتے ہی اس مزار پر آجاتے تھے۔ انہوں نے چچا افضل کو بتایا کہ اباجی (میرے دادا) بھی ہمراہ ہیں تو وہ بے یقینی سے بڑے بھائی کا منہ تکنے لگے۔''بھائی جان! کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ اباجی کو تو سکھوں نے مار دیا تھا اور ان کی لاش اٹھا کر لے گئے تھے۔''

''یہ لمبی کہانی ہے افضل۔'' والد نے بھائی کو سینے سے لگاتے ہوئے بتایا۔''پدمنی کی شیطانی قوتوں نے سکھوں کو حویلی پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا تھا اور اسی نے اباجی کو چھت سے دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ سکھ اباجی کو مردہ سمجھ کر ہی لے گئے تھے مگر جب ان کا جتھہ اونا کی پہاڑیوں کے قریب سے گزرا تو باوا جی نہال شاہ کے معتقد ڈاکوؤں نے سکھوں سے ان کی لاش چھین لی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ اونا کے ڈاکو ہمارے خاندان کی کتنی عزت کرتے

تھے۔انہیں بھی یہ گماں تھا کہ اباجی زندہ نہیں ہیں مگر جب انہوں نے ان کے دل کی دھڑکن سنی تو ان کا علاج معالجہ کیا اور وہ تندرست ہو گئے..... اباجی ڈاکوؤں کے پاس ہی رہے اور ان کی مدد ہی سے انہوں نے مجھے تلاش کیا..... اور پھر انکی مدد ہی سے ہم ایک ہفتہ پہلے قصور کی سرحد پار کر کے پہنچے ہیں..... اب آؤ میں تمہیں اباجی سے ملاؤں۔"

والد چچا افضل کو مزار کے ایک حجرے میں لے گئے جہاں میرے دادا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔انہوں نے جب چچا افضل کو دیکھا تو خوشی سے ان کی آنکھیں بھر آئیں اور اپنے خون جگر کو سینے سے لگا کر بولے :

"میرے بچے تیری بھابھی نے تیری عاقبت سنوار دی ہے۔وہ بڑی پریشان ہے۔اللہ تعالی باواجی نہال شاہ کے خاندان کو آزمائش میں ڈالنا چاہتا تھا اور اب اس کے دکھ بھی ذات باری تعالی ہی ختم کرنے والی ہے۔تم دونوں بھائی اپنے بچھڑے ہوؤں کے پاس جاؤ۔مجھے جب یہاں سے اجازت ملے گی میں آجاؤں گا۔" دادا حکیم شمشیر سدھو نے چچا افضل کو بتایا کہ اللہ کے اس برگزیدہ بندے کے دربار پر انہیں بڑا سکون ملا ہے اور ویسے بھی یہ بزرگ ایک زمانے میں نمولیاں آئے تھے اور باواجی نہال شاہ نے ان سے بھی فیض پایا تھا۔ قلبی واردات کے ذریعے دادا جی کی اس بزرگ ہستی سے ملاقات بھی ہوئی۔ پھر چچا افضل نے انہیں خاندان پر ٹوٹنے والی قیامت کی سرگزشت سنائی اور کہا"اباحضور! پدمنی لاہور کے بڑے مندروں کے پجاریوں کو مسلمانوں کے خلاف اکسا رہی ہے اور اس نے شیطانی علوم کے پجاری ہندوؤں' سکھوں کے علاوہ گمراہ مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور اس نے پھوپھی حاجرہ کو بھی مار دیا ہے۔" چچا افضل نے ماموں بندے حسن اور شاد کے بارے میں بھی بتایا اور ہرادہ کنڈ مندر کے پجاری کے قتل کے بارے میں سارے حالات بیان کر دیئے۔

دادا یہ سن کر قدرے پریشان ہوئے' پھر ہاتھ بلند کر کے دعا کی :

"اے میرے مولا! مسلمانوں کو پدمنی کی شیطینیت سے بچا اور مجھے توفیق دے کہ میں اس بدروح کو پکڑ کر جلا سکوں۔"

پدمنی کی لاہور میں موجودگی نے والد کو بھی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔وہ جانتے تھے کہ یہ ان کے خاندان کے پیچھے پڑ گئی ہے' اس سے جان چھڑانے کے لئے اب کسی بہت بڑی روحانی طاقت کی ضرورت ہے۔انہیں اپنے والد کی روحانی طاقتوں پر یقین تھا کہ وہ پدمنی کا مقابلہ کر سکیں گے مگر میرے دادا خود بھی اسی فکر مندی میں تھے۔وہ ایک دو بار پدمنی کی آتما کو جلانے کی کوشش کر چکے تھے مگر عین وقت پر وہ ان کی دسترس سے نکل جاتی اور پہلے سے زیادہ شعلہ انتقام بن کر لوٹتی تھی۔

میاں جی کی کرامات

والدہ اور چچا لاہور واپس آ گئے۔ والدہ اور گھر والوں کے بے چین دلوں کو قرار آ گیا۔ مگر یہ قرار صرف ایک روز بعد ہی ختم ہو گیا۔ اس شام سب صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے ابا جی کی برما سے واپسی کے حالات سن رہے تھے کہ آناً فاناً صحن کے اوپر گہرا اندھیرا ہو گیا اور اس نے پورے کوارٹر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس سے قبل کہ گھر کا کوئی فرد سنبھلتا' مہیب تاریکی میں سے خون کی بارش ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی مردہ جانوروں کی خون آلود کھوپڑیاں' پرندوں کے پنجے اور خشک ہڈیاں موسلا دھار بارش کی صورت میں گرنے لگیں۔ بچے اور بڑے خون کی بارش میں نہا گئے اور خونی ہڈیاں اور کھوپڑیاں ان کے سروں پر آہنی ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگیں۔ کسی کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا..... یہ پدمنی کا انتہائی طاقتور شیطانی حملہ تھا۔ گھر کے سارے افراد بدحواس ہو کر صحن میں بھاگنے لگے۔ کسی کو ہوش نہ رہا کہ کمروں میں پناہ ہی لے سکے۔ افراتفری' خوف وہراس اور دہشت نے سب کو چیخ پکار پر مجبور کر دیا تھا۔ اس لمحے مہیب تاریکی میں سے برق سی کوندی اور پھر خاکستری رنگ کا ایک انتہائی مکروہ اور ہیبت ناک وجود صحن میں کود پڑا۔ بچے اور گھر کی خواتین اسے دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئیں۔ چچا فضل بھی اپنے حواس کھو چکے تھے' البتہ میرے والد کچھ سنبھلے ہوئے تھے..... انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ پدمنی کی پھیلائی ہوئی تباہی ہے۔ اس مکروہ وجود سے بدبودار دھواں اٹھ رہا تھا اور وہ نہایت سنگدلی کی ساتھ بچوں کے اوپر سے گزرتا ہوا میرے والد کے سامنے آ کھڑا ہوا اور خون آشام نظروں سے انہیں گھورنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ کوئلوں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ناک کی جگہ ایک گڑھا تھا اور اس سے سیال بہہ رہا تھا۔ بال لمبے مگر جھلسے ہوئے تھے۔ چہرہ انتہائی کراہت زدہ اور گوشت کے لوتھڑوں میں منقسم تھا۔ والد کے پاس آ کر وہ شیطانی قوت بے رحمی کے ساتھ بولی:

"میاں اشرف! میں پدمنی کی آتما ہوں۔ ہاجرہ نے تو مجھے جلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی مگر میری شکتی نے مجھے بچا لیا ہے۔ اب میں تیرے خاندان کے ایک ایک فرد کو جلا ڈالوں گی۔"

"پدمنی! تو ہم سے کس جنم کا بدلہ لے رہی ہے؟ تجھ پر تو ہمارے باوا جی نے رحم کھایا تھا اور تجھے".....

میرے والد میاں جی ابھی بات مکمل بھی نہ کر پائے تھے کہ پدمنی دھاڑی:

"خبردار! جو تم نے اپنے پرکھوں کا نام لیا۔ مجھے تمہارے نہال شاہ سے نفرت ہو چکی ہے میاں اشرف..... تو سمجھتا ہے کہ تیرے باوا جی نے مجھے بہت کچھ دیا تھا..... نہیں میاں اشرف' نہیں".....

اس نے سر نفی میں جھٹکا تو اس کے جھلسے بالوں اور چہرے کے لوتھڑوں سے بدبودار سیال بارش کی طرح برسنے لگا۔ "میں تو ازل سے کالی ماتا کی پجارن ہوں۔ تیرے باوا جی کی میں نے بہت سیوا کی اور ان کو وچن بھی دیا کہ ان کے گیان کی رکھشا کروں گی۔ اس کی نسل کو عملیات سکھاؤں گی۔ مگر تیرے باوا جی نے مجھے گیان کی چتا پر جلا دیا اور اکیلی کو چلہ کاٹنے پر مجبور کر کے خود چلے گئے۔ آج میں ان کی وجہ سے اس حالت میں ہوں اور جب تک میری آتما بھٹکتی رہے گی' میں تمہارے خاندان کو اپنی نفرت کی آگ میں جلاتی رہوں گی..... تیرے باوا کی نسل کو کالے علم سکھاؤں گی اور وہ صرف نام کے مسلمان ہوں گے۔" پدمنی کی کریہہ کالی زبان حسد وانتقام کے شعلے اگلتی رہی۔

"پدمنی! تو خوب جانتی ہے کہ ایک دن تیرا انت ہو کر رہے گا۔ تو پھر بھی شیطنیت سے باز نہیں آ رہی۔" میاں جی نے اپنے حواس کو مجتمع کیا۔ وہ اس وقت تک نورانی علوم کے بہت بڑے ماہر نہیں تھے مگر انہیں اتنی طاقت حاصل تھی کہ پدمنی کا وقتی طور پر مقابلہ کر سکتے تھے۔ شیطانی علوم کا مقابلہ کرنے کے لئے روحانی علوم پر دسترس زیادہ نہ بھی ہو تو شیطانی قوتیں اس عامل اور اس کے عملیات پر زیادہ اثر نہیں کرتیں..... پھر اس سے قبل کہ پدمنی نفرت کی آگ کو پھیلا کر ہر ایک بھسم کر دیتی' میاں جی نے زیر لب وظائف پڑھنے شروع کر دیئے اور جونہی انہوں نے ایک طاقتور وظیفہ پڑھا' پدمنی کی بے اختیار کراہ نکل گئی اور وہ خوفناک نظروں سے میرے والد کو دیکھنے لگی۔ والد نے اسے ایک کچوکا دیا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میاں جی نے آیت الکرسی پڑھی اور پورے گھر پر پھونک مار کر اپنے گرد حصار قائم کر لیا۔

''تو بڑا پھر تیلا ہے میاں اشرف!'' پدمنی اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ پیچھے ہٹنے لگی اور دہاڑ کر بولی ''ان منتروں سے تو سمجھتا ہے بچ جائے گا؟ آخر تو کب تک اپنے گھر والوں کی رکھشا کرے گا؟ میں آج جا رہی ہوں مگر یاد رکھو میں آتی رہوں گی.....'' یہ کہہ کر وہ اپنی منحوس تاریکی کو بھی ساتھ ہی لے گئی' البتہ اس کی پھیلائی ہوئی گندگی نے سارے صحن کو آلودہ کر دیا تھا اور بدبودار ماحول نے پورے گھر میں عجیب سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔

میاں جی بچوں اور بڑوں کو ہوش میں لائے۔ چھوٹے بڑے سب خوف و دہشت سے ان کے ساتھ لپٹ گئے۔ والدہ نے روتے ہوئے کہا: ''میاں جی! آخر ہم کب تک اس منحوس کے انتقام کا نشانہ بنتے رہیں گے۔''

میاں جی نے سب گھر والوں کو غسل کرایا۔ پھر پانی دم کر کے سب کو پلایا اور خون آلود کھوپڑیاں' ہڈیاں اور پنجے بوری میں بند کر کے رات کے وقت جا کر راوی میں پھینک دیئے۔

یہ رات بھی سارے گھر نے خوف کے عالم میں گزاری۔ میاں جی نے گھر کے گرد حصار قائم کر دیا تھا مگر پے در پے حادثوں نے سب کو کمزور کر دیا تھا۔ بچے تو بالکل سہم گئے تھے اور سوتے میں بھی خوف سے چیخنے لگتے تھے۔ میاں جی کو اب اپنے والد' حکیم شمشیر سدھو کا انتظار تھا۔ لیکن حکیم جی کے آنے سے پہلے ایک اور آزمائش ان کی منتظر تھی۔

میاں جی فوج میں رہ چکے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران برما کے گھنے' تاریک جنگلوں میں عملیات سیکھنے کے لئے چلے بھی کاٹ چکے تھے مگر اب انہیں مکمل مہارت کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اب داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ درمیانی قامت کے مالک تھے۔ جوانی کا دور تھا اس لئے ان کی طبعیت میں ضد' ہٹ دھرمی اور سختی بھی تھی۔ یہ دادا کے گھر آنے سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میاں جی کو اطلاع ملی کہ ہری تلا میں واقع کالی کے مندر میں ان کا سالا شاد اور بندے حسن کالے علوم سیکھ رہے ہیں۔ چچا افضل اور میری والدہ بھی انہیں حالات سے باخبر کر چکے تھے۔ میاں جی نے تہیہ کر لیا کہ وہ شاد اور بندے حسن کی گوشمالی کر کے رہیں گے لہذا وہ کسی کو بتائے بغیر ہری تلا کے مندر میں چلے گئے۔ کالی ماتا کا وہ مندر بااثر ہندوؤں کا نہایت اہم اڈا تھا اور اس میں وہ سکھ اور ہندو پناہ لیتے تھے جو راتوں کو مہاجر مسلمانوں کو لوٹتے اور ان کا قتل کرتے تھے۔ جبکہ کالے علوم کے ماہر بھی وہاں رہ کر نام نہاد شکتی حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ ہر ادہ کنڈ مندر کے پجاری کے قتل کے بعد کالی ماتا کے مندر کے حفاظتی انتظامات انتہائی سخت کر دیئے گئے تھے۔ میاں جی ان حالات سے بے خبر تھے' لہذا وہ اپنے جوش میں کالی کے مندر میں گھس گئے تو سکھوں نے انہیں پکڑ لیا اور خوب زدوکوب کیا۔ میاں جی کے پاس کوئی بھی ہتھیار نہ تھا جس سے وہ اپنی حفاظت کر سکتے۔ سکھوں نے اپنے تئیں میاں جی کو قتل کر کے مسلمان آبادی کے ایک قبرستان میں پھینک دیا۔ شام ہو گئی اور میاں جی گھر نہ آئے تو سہمے ہوئے خاندان کی تشویش اور بڑھ گئی لیکن کسی میں یہ جرأت نہ ہوئی کہ ان کی تلاش کو نکلتا۔ اسی رات پدمنی نے ہمارے خاندان کو ایک اور جھٹکا دیا۔ شاید وہ اسی تاک میں تھی۔ پہلے تو شام ہوتے ہی ہر ادہ کنڈ کے بلوائیوں نے ہمارے کوارٹر پر حملہ کر دیا مگر محلے داروں کی مزاحمت کے باعث وہ بھاگ گئے اور پھر رات گئے پدمنی نے ایک بار پھر پورے گھر کو اپنی نحوست و غضب میں جکڑ لیا۔ اس بار اس نے چچا افضل کو پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ رفع حاجت کے لئے کمرے سے باہر نکلے تھے اور پدمنی نے انہیں اپنے شیطانی جال میں پھانس لیا۔ چچا افضل چونکہ چند وظائف جانتے تھے' لہذا انہوں نے مزاحمت کی۔ پھر پدمنی نے آگ کا ایک بڑا سا طلسماتی گولا کمرے میں بند مکینوں پر پھینکا جس سے پورے کمرے کو آگ لگ گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ مکروہ قہقہے لگاتی ہوئی غائب ہو گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے آگ نے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میری والدہ ہمت کر کے بچوں اور دوسرے افراد کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئیں۔ گھر کے سبھی افراد نے آگ بجھانے کی کوشش کی اور محلے داروں کو بھی مدد کیلئے بلایا..... مگر محلے دار ہمارے گھر والوں کی حالت دیکھ کر حیران ہوئے کیونکہ یہ آگ انہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ والدہ انہیں بار بار آگ بجھانے کے لئے کہہ رہی تھیں اور چچا افضل بھاگ بھاگ کر پانی کی بالٹیاں اس آگ پر ڈالتے مگر آگ اور بھڑک اٹھتی تھی۔ محلے داران کی یہ حالت دیکھ کر افسوس کرنے لگے اور بعض تو ان پر ہنسنے بھی لگے کہ ان لوگوں کے دماغ الٹ گئے ہیں کیونکہ انہیں وہ آگ نظر نہیں آ رہی تھی۔ والدہ نے بے بسی سے محلے داروں کو دیکھا' پھر انہیں اپنے گھروں کو واپس جانے کی التجا کی اور خود بڑی مشکل سے وضو کر کے وظائف پڑھنے لگیں۔ چچا افضل اور والدہ نے مل کر وظائف پڑھے اور پانی پر دم کر کے اسے طلسماتی آگ پر پھینکا جس سے اس کی شدت کم ہو گئی۔ یوں آگ بجھاتے بجھاتے صبح ہو گئی مگر وہ بجھ نہ سکی۔

صبح کا اجالا پھیل رہا تھا جب دادا حکیم شمشیر سدھو فرشتہ رحمت بن کر وہاں پہنچ گئے۔ چچا افضل اور میری والدہ ان سے لپٹ کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

انہوں نے کہا ''میرے بچو! صبر کرو۔ اس گندی بدروح نے بہت ظلم کر لیا ہے۔ اب میں آ گیا ہوں۔ دیکھتا ہوں یہ کیسے باز نہیں آتی۔''

میرے دادا نے گھر کے افراد کو دروازے کے باہر بٹھا دیا اور خود اس آگ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ جوں جوں آگ کے قریب گئے' حیرت انگیز طور پر آگ بجھنے لگی۔ پھر انہوں نے کمروں کے قریب جا کر ہاتھ دعا کے لئے بلند کئے اور ایک زوردار پھونک ماری۔ اس کے ساتھ ہی نورانی بارش نے طلسماتی آگ کا سحر توڑ دیا اور آگ یوں بجھ گی جیسے کبھی لگی ہی نہ ہو۔ سارا گھر باہر سے سلامت تھا۔ لکڑی کے دروازے' کھڑکیاں بھی پہلے ہی کیطرح تھیں مگر اندر رکھا ہوا سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ محلے دار اس عجوبے پر حیران تھے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سارا گھر ظاہری طور پر صاف ہے مگر آگ نے کمروں میں رکھی ہوئی ہر چیز کو جلا دیا ہے۔

کسی بد بخت نے افواہ پھیلادی: ''لگتا ہے ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ پہلے ان کا ایک آدمی گم ہوا۔ پھوپھی ماری گئی اور پھر میاں جی گم ہو گئے.....'' اس کے منہ سے اس بات کا نکلنا تھا کہ محلے داروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ پھر گویا انہیں کسی نے یقین دلایا کہ ان لوگوں کی وجہ ہی سے کٹری کے مکینوں کو نحوست کا سامنا ہے۔ بعض محلے داروں نے میرے دادا کے سامنے آکر بھی اس بات کا اظہار کیا اور کہا: ''بزرگو! سارے محلے دار آپ کے حالات سے خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ سب کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بھوت پریت آپ کو تنگ کر رہا ہے اور اسی کی وجہ سے محلے میں بھی خون کے چھینٹے اور بند صندوقوں میں رکھے کپڑے کترے جانے لگے ہیں۔ بچے بڑے خوفزدہ ہو گئے ہیں' لہذا آپ یہاں سے چلے جائیں۔''

دادا نے بڑے تحمل سے اس محلے دار کو سمجھایا: ''میرے بچے! یہ ہمارے خاندان کی آزمائش ہو رہی ہے۔ میں تم لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ آج کے بعد اس کٹری پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔'' اور پھر یہی ہوا..... دادا کے قدم مبارک کی بدولت حالات سنبھلنے لگے۔ اسی شام میاں جی بھی زخمی حالت میں گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے حکیم جی کو اپنی بپتا سنائی اور پھر ٹھوس لہجے میں کہا :

''ابا جی! اب تو ہمارا جینا مرنا اسی جگہ ہو گا۔ آپ یہاں اس برگد کے نیچے آستانہ بنائیں۔ اب ہمیں مکار اور کالے عاملوں کا بھی مقابلہ کرنا ہے اور پدمنی کے طلسم کو بھی توڑنا ہے۔''

میاں جی نے اپنے والد کے ساتھ مل کر برگد کے درخت کے نیچے آستانہ بنایا اور پھر جب کٹری والوں کو حکیم جی کی کرامات کا علم ہوا تو انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے خاندان کو شیطانی مخلوق تنگ کر رہی تھی مگر ان کے آتے ہی وہ غائب ہو گئی ہے۔ اس دوران ماموں بندے حسن بھی گھر لوٹ آئے۔ انہیں میرے دوسرے ماموں نے گورا قبرستان میں ایک چلے کے دوران جا پکڑا تھا اور پھر انہیں حکیم جی کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ ماموں بندے حسن کی حالت نہایت دگرگوں تھی۔ پدمنی نے ان کی نظر بندی کر کے انہیں اپنا معمول بنا لیا تھا۔ حکیم جی نے ماموں بندے حسن کا روحانی اور جسمانی علاج کیا اور جب ماموں کو ہوش آیا تو وہ بے تحاشا روئے پیٹے۔ انہوں نے اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت سے حکیم جی کو مطلع کیا تو حکیم جی نے کہا:

''بندے حسن! تو معصوم انسان ہے۔ تیرا کوئی گناہ نہیں۔ یہ سارا پدمنی کا کیا دھرا ہے'' ماموں بندے حسن کو قطعی علم نہیں تھا کہ معمول بن کر وہ کیا کرتے رہے تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ماموں شاد بھی ان کے ساتھ رہے تھے۔ یوں ہی سال ڈیڑھ گزر گیا۔ کٹری میں آستانہ بننے سے کالی کے پجاریوں کی وارداتیں کم ہونے لگیں اور حکیم جی اور میاں جی کی کرامات کی شہرت پھیلنے لگی سائلوں کی ایک بھیڑ وہاں لگنے لگی۔ وہ خلق خدا کی خدمت کرتے اور ان کے دکھوں کا علاج کرتے رہے۔ اس دوران پدمنی ایک بار بھی پلٹ کر نہ آئی۔ میاں جی اور حکیم صاحب نے تین چار بار اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ان کے قابو میں نہ آسکی۔

میں باغی ہوں

1950ء میں جب میں پیدا ہوا تو گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حکیم جی نے پوتے کی پیدائش پر گھی کے چراغ جلائے اور نذر نیاز بانٹی۔ میرا نام انہوں نے محمد عابد رکھا اور میرے والد سے کہا: ''اب اس علم کا دیا میرا یہ پوتا روشن کرے گا۔''

میرے دادا نے بچپن ہی سے مجھے اپنے ساتھ آستانے پر بٹھانا شروع کر دیا تھا۔ مجھے میاں جی سے زیادہ ان سے انس تھا۔ وہ میرے لاڈ بھی اٹھاتے تھے اور جب کوئی سائل آتا تب بھی مجھے اپنی گود میں بٹھائے رکھتے۔ میرے بعد اور بھائی بھی پیدا ہوئے مگر میرے دادا میرے والد سے کہا کرتے تھے

'' میں نے تو محمد عابد کو چن لیا ہے۔ باقی سب پر تیرا حق ہے مگر اس پر میرا حق ہے۔'' دادا کی طبعیت میں بڑی حلاوت تھی۔ ان کا مجھ پر رعب بھی تھا۔ میں ان کی باتیں غور سے سنتا تھا۔ لیکن جب پانچ چھ سال کا ہوا تو میرے اندر سرکشی اور ضد پیدا ہونے لگی۔ میاں جی تو مجھے ڈانٹ دیتے مگر دادا میرا دفاع کرتے۔ بچپن میں ہی اسکول میں پڑھنے کا شوق تھا۔ میاں جی چاہتے تھے کہ میں مستقل طور پر آستانے ہی پر رہوں' صرف روحانی علوم پڑھوں اور عملیات سیکھوں۔ آستانے پر قرآن خوانی بھی ہوتی تھی اور ایک بڑے طاق میں ہر وقت اگربتی سلگتی رہتی۔ اس کے اوپر سنہری غلاف والا بڑا سا قرآن پاک تھا۔ میرے دادا مجھے دس سال تک قرآن شریف پڑھاتے اور ساتھ ساتھ عملیات کی طرف بھی راغب کرتے رہے۔ مگر یہ بات بڑی عجیب تھی کہ میں قرآن پاک پڑھنے کے بعد عملیات' تعویذ دھاگے وغیرہ کے کام میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ میاں جی کو میری اس عادت سے چڑ تھی اور وہ مجھے ڈانٹتے بھی تھے۔ ایک روز میں آستانے کی چوکھٹ کے پاس کھڑا تھا اور اندر میاں جی اپنے والد سے میری شکایت کرتے ہوئے کہہ رہے تھے:

'' ابا جی! مجھے اس لڑکے میں سرکشی نظر آتی ہے۔ میں نے غور کیا ہے کہ یہ عملیات میں دلچسپی نہیں لیتا۔ اس کا کیا کریں؟''

''میاں اشرف! میں جانتا ہوں کہ عابد میں سرکشی ہے اور اس کی عقل اسے ان علوم سے متنفر کر رہی ہے۔ میرا پوتا بہت ذہین اور باشعور ہے اور پھر زمانہ بھی بدل رہا ہے لیکن تو پریشان نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ایک روز یہی ہمارا نام روشن کرے گا لیکن تو بھی یاد رکھ' اس پر حد سے زیادہ سختی نہ کرنا..... ورنہ یہ تیرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

میاں جی اپنے والد کے آگے نہیں بولتے تھے اور ان کے ہر حرف پر سر جھکا دیتے تھے مگر جب میں نے میاں جی کے آگے بولنا شروع کیا تو وہ مجھے بے ادب' گستاخ' بدتمیز اور نجانے کیا کچھ کہتے۔ خاص طور پر اس روز تو حد ہو گئی جب میاں جی کا ایک رازدار اور مرید خاص نتھو بابا اپنے ساتھ ایک مریل سے آدمی کو لے کر آیا۔ سردیوں کے دن تھے اور شام کا وقت تھا۔ حکیم جی مغرب سے پہلے گھر آجایا کرتے تھے جبکہ میاں جی رات گئے تک آستانے پر بیٹھے رہتے۔ میں بھی سرِ شام گھر پہنچ جاتا تھا۔ مگر اس روز میں آستانے کے عقب میں واقع بستی میں آوارہ گردی کرنے چلا گیا تھا اور جب شام ہوئی تو واپس آیا تھا۔ آستانے میں چراغاں تھا۔ میں نے نتھو بابا اور اس آدمی کو مشکوک انداز میں آستانے کی طرف بڑھتے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ میری عمر دس سال تھی مگر مجھے ہم عمر لڑکوں کی نسبت زیادہ ہی شعور تھا۔

میں دبے پاؤں آستانے کی اس کھڑکی کے پاس چلا گیا جو برگد کی طرف کھلتی تھی۔ میں اس کے نیچے بیٹھ گیا اور اندر ہونے والی گفتگو سننے لگا۔ میاں جی نتھو بابا پر برس رہے تھے اور وہ مریل آدمی زار و قطار رو رہا تھا۔

''سرکار! آپ کا غصہ بجا ہے مگر یہ حرامی بھی سچ کہہ رہا ہے۔'' نتھو بابا اپنی کسی بات پر قائم تھا۔

''تو پھر سارا سامان گیا کہاں؟'' میاں جی نے سختی سے پوچھا۔ ''میں نے تجھے پیسے دے کر اسی لئے بھیجا تھا کہ حکیم جی کو پتہ نہ چلے اور سارا سامان گورا قبرستان پہنچا دینا..... مگر کل شام تمہاری وجہ سے میں چوکی نہ لگا سکا اور وہ حرافہ میرے ہاتھ سے نکل گئی۔''

''آپ مجھے ایک موقع اور دیں سرکار! میں کل تک سامان لے آؤں گا۔'' نتھو بابا ملتجی انداز میں کہنے لگا۔

''کل کہاں سے لائے گا؟ کیا یہ سامان بازار میں عام ملتا ہے؟ تیرا دماغ تو نہیں گھوم گیا۔'' میاں جی کو ایک بار پھر غصہ چڑھ گیا۔ مگر نتھو بابا نے بہت جلد ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔

''سرکار' میں نے سنا ہے کہ سندھ سے ایک ہندو آیا ہے۔ اس کے پاس مسان بھی ہے اور الو کا خون بھی۔ باقی اشیاء بھی مل جائیں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔''

یہ سن کر میاں جی خاموش ہو گئے اور پھر گہری سانس لے کر بولے: ''یاد رکھو حکیم جی کو یہ خبر نہ ہونے پائے۔ انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ میں قبروں پر جا کر بھی عملیات کرتا ہوں۔''

''آپ بے فکر رہیں سرکار!'' نتھو بابا نے انہیں تسلی دی اور اس مریل آدمی سے کہنے لگا ''چل بے مجھے اس ہندو کے پاس لے چل۔''

میں نے اس شام گھر جا کر حکیم جی کے سامنے میاں جی اور نتھو بابا کے درمیان ہونے والی گفتگو بیان کر دی۔ یہ سن کر حکیم جی کانپ اٹھے۔ غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ خاموش ہو گئے۔ میاں جی رات کو گھر آئے تو حکیم جی نے آتے ہی انہیں اپنی عدالت میں طلب کر لیا اور گواہ کے طور پر مجھے پیش کر دیا۔ میاں جی نے حکیم جی کو کیسے مطمئن کیا مجھے نہیں معلوم لیکن اس روز میں نے میاں جی کے خلاف بھرپور گواہی دی اور کہا:

'' دادا حضور! جس آستانے میں قرآن خوانی ہوتی ہے وہاں قبروں پر جا کر چلے کرنے والے بھی بیٹھے ہوں تو آپ کیا کہیں گے؟ کیا میاں جی مجھے بھی یہی علم سیکھنا چاہتے ہیں؟''

کوئی بیٹا اپنے باپ کے خلاف اس قدر مضبوط اور مدلل بات شاید ہی کر سکے مگر سچائی اور حق گوئی میری سرشت میں تھی' لہذا میں میاں جی کے خلاف بول کر گناہ کار ٹھہرا اور انہوں نے ہمیشہ مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ دادا کی وفات کے بعد تو وہ بالکل میرے ہی میرے خلاف ہو گئے۔ میری عمر ۱۴ سال تھی اور میں ۹ ویں میں پڑھتا تھا۔ دادا کی وفات کے بعد میں نے آستانے پر بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ میں اسکول سے واپس آ کر موہنی روڈ پر بھولو پہلوان کے اکھاڑے یا ٹیکسالی میں استاد دامن کی مجلس میں چلا جاتا تھا۔ میاں جی کی طبیعت میں جلال و قہر ہنوز تھا۔ باپ بیٹے میں رقابت بڑھ چکی تھی۔

میری والدہ ان حالت پر پریشان ہوتیں اور مجھے کوسنے بھی دیتیں کہ تیری ناخلفی اور آوارہ گردی کی وجہ سے میاں جی تجھ سے بدظن ہیں مگر مجھے ان کی پرواہ ہی کب تھی۔ میں تو صرف پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے میٹرک کیا تو میاں جی نے مجھے مزید پڑھنے سے روک دیا مگر میں بھی ضد کا پکا تھا' لہذا میں نے انہیں دھمکی دی کہ اگر انہوں نے مجھے مزید پڑھنے نہ دیا تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا..... میاں جی اپنے فیصلے پر قائم تھے مگر والدہ کی منت سماجت کے بعد انہوں نے مجھے مزید پڑھنے کے لئے اسلامیہ کالج سول لائن میں داخلہ دلوا یا دیا۔

کالج میں جاتے ہی اپنے خاندانی علوم سے میری بدظنی بڑھ گئی۔ آستانے پر جانے کا تصور کرتے ہی مجھے گھن آنے لگتی کیونکہ اب وہاں میاں جی کے پاس ایسے ایسے بدقماش سائل اور مریدین کا حلقہ بڑھ گیا تھا جو انہیں مخصوص کاموں کے لئے قبروں پر چلہ کشی پر آمادہ کرتے تھے اور یہی وہ بات تھی جس سے میں انتہائی متنفر تھا۔ تعویذ' دھاگے' چلے اور اس کام کو چلانے کے لئے ان کے رازدار نتھو بابا کا کردار مجھے ان کے مقابل لے آیا تھا اور اب میں ہر جگہ اپنے میاں جی کے خلاف بولنے لگا تھا۔ میری یہ گستاخیاں جب حد سے بڑھ گئیں تو میاں جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ایک شام جب میں استاد دامن کی مجلس سے واپس آیا تو انہوں نے آتے ہی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور خوب درگت بنائی اور کہا:

" تو ترقی پسند بننا چاہتا ہے۔ پڑھ لکھ کر تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے' اس لئے تو باپ کے بارے میں گندی باتیں پھیلاتا ہے۔ تو باوا جی نہال شاہ کے جلائے ہوئے چراغ کو بجھانا چاہتا ہے' کم بخت!" میاں جی نے برسوں کا غصہ جی بھر کر نکالا اور یہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں آگے سے نہیں بولا اور وہ مجھے مارتے رہے اور ساتھ ساتھ بولتے رہے۔ جب وہ مجھے مار مار کر تھک گئے اور ایک طرف نڈھال ہو کر بیٹھ گئے تو بڑی حسرت ناک آواز میں بولے: "عابد پتر! تو مجھے گناہ گار' سیاہ کار سمجھتا ہے۔ مگر تو نہیں جانتا میں برسوں سے کس آگ میں جل رہا ہوں۔ تو نے کبھی باپ کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ تو یہی جانتا ہے کہ میں برے لوگوں کے چنگل میں پھنس کر قبروں پر جاتا ہوں۔ میرے ناخلف بیٹے' ایسی بات نہیں..... میں تو گمراہ اور بدقماش لوگوں کے دکھ بھی دور کرتا ہوں۔ رہا سوال قبروں پر جا کر چلے کاٹنے کا تو..... یہ میں....." میاں جی نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور اٹک اٹک کر بولے۔ "میرے بچے میں یہ سب تیری اور تیرے بہن بھائیوں کی سلامتی کے لئے کر رہا ہوں۔ اگر میں قبروں پر جا کر عملیات کرنے سے رک گیا تو پدمنی..... تجھ پر اور باقی سب پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ وہ ہر اندھیری منگل کو قہر بن کر آتی ہے۔ حکیم جی کو بھی یہ معلوم تھا میرے باغی بچے..... مگر تیری عقل میں بات نہیں آسکے گی۔ جب اس پیشے میں آئے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ عملیات کرنے والوں کی مجبوریاں کیا ہوتی ہیں....." میاں جی کی زبان سے پدمنی کا نام سن کر میں ہنس دیا۔ میں بچپن سے اس کا نام اور اس کی فتنہ پردازیوں کے قصے سنتا آرہا تھا۔ آج میاں جی نے بھی اس کی بات کی تو میں مار کھانے کے باوجود ہنس دیا۔ میری ہنسی نے میاں جی کو ایک بار پھر مشتعل کر دیا اور وہ جھنجھلا کر بولے:

" اگر تجھے میری اس بات پر یقین نہیں ہے تو اس اندھیری منگل کو خود دیکھ لینا کہ پدمنی کیا کرتی ہے۔ اب تو جانے اور پدمنی..... میں تیرا دماغ درست ہونے تک اب مداخلت نہیں کروں گا۔" میاں جی یہ کہہ کر باہر چلے گئے اور میں اپنے بدن کو سہلاتے ہوئے سو گیا۔ پورے گھر میں میاں جی کے فیصلے نے خوف و ہراس پھیلا دیا تھا مگر میں نہایت پر سکون تھا اور بڑے اشتیاق سے اندھیری منگل کا انتظار کرنے لگا۔

اندھیری منگل

میاں جی کا چیلنج قبول کر کے میں تو مطمئن ہو گیا، مگر میری والدہ اور چچا افضل کی راتوں کی نیند اور دن کا چین اڑ گیا۔ چھوٹے بھائی بہنوں کے چہرے بھی اس خوف سے زرد پڑ گئے کہ پدمنی اندھیری منگل میں آئے گی تو ان کے بھائی کا خون پی جائے گی۔ جوں جوں دن قریب آ رہے تھے والدہ کو ہول پڑنے لگے۔ وہ مجھے کوسنے دیتیں اور التجائیں بھی کرتیں کہ میں اپنے باپ سے معافی مانگ لوں تاکہ پدمنی کے قہر سے بچ سکوں، لیکن میں نے تو جیسے کان بند کر رکھے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھ میں ایسی خودداری اور ہوشمندی کیسے آ گئی تھی۔ میں اپنے فیصلے کو برحق سمجھتا اور علی الاعلان کہتا تھا کہ جادو ٹونا مشرکانہ علوم ہیں اور ان علوم سے استفادہ کرنے والے عامل بھی کافر ہیں۔

منگل میں ایک روز باقی تھا جب میاں جی میرے اطمینان اور زہر افشانی سے پہلی بار گھبرائے اور انہوں نے میری والدہ سے کہا کہ اسے پوچھو یہ کیا چاہتا ہے۔ والدہ نے مجھ سے بات کی تو میں نے صاف صاف کہہ دیا "اماں، میاں جی دنیا کے مانے ہوئے عامل ہیں۔ لوگ انہیں پوجتے ہیں، مگر وہ ایک تصوراتی بدروح سے خائف ہیں۔ اس بدروح سے جو انہوں نے اور ان کے بزرگوں نے اپنے ہی خاندان سے انتقام لینے کیلئے آزاد چھوڑ رکھی ہے۔ بچپن سے میں پدمنی، پدمنی سنتا آ رہا ہوں، میرے کان اس کی خوفناک کہانیاں سن سن کر پک چکے ہیں، لہٰذا میں نے طے کیا ہے کہ جب تک اپنی آنکھوں سے اس بدذات کو دیکھ نہیں لیتا میں اپنے آباؤ اجداد کے علوم کو تسلیم نہیں کروں گا۔"

"ناگی پتر! کیا تو اپنی ماں کو جھوٹا سمجھتا ہے؟" والدہ نے رنج و ملال سے پوچھا۔ وہ مجھے پیار سے ناگی کہہ کر پکارتی تھیں۔

"نہیں ماں! ایسی بات کیوں کرتی ہو" میں نے ان کے ہاتھ تھام کر انہیں بوسہ دیا۔

"تو پھر تو یہ کیوں نہیں مان لیتا کہ پدمنی کا وجود بھی ایک حقیقت اور سچائی ہے۔ تیری ماں نے ان آنکھوں سے اسے دیکھا ہے اور اس کے شر سے بچنے کیلئے وظائف کیے ہیں۔" وہ روہانسی ہو کر کہنے لگیں۔

"مگر اماں میں اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں اسلامی کتابیں پڑھتا ہوں، قرآن پاک میں نے پڑھا ہے اور دنیاوی تعلیم نے بھی یہی سکھایا ہے کہ بدروحوں وغیرہ کا وجود صرف خیالی ہے۔" میں نے والدہ کو قائل کرنا چاہا۔

"کوئی بھی ہوش مند انسان اور ذی شعور ان خرافات پر یقین نہیں کر سکتا۔"

"تیری ابھی عمر ہی کیا ہے ناگی پتر، ابھی تو اتنا سیانا نہیں ہوا جتنی باتیں کرتا ہے۔ تو نے قرآن کی بات کی ہے تو سن! قرآن پاک ہی میں جادو کا بھی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جادو کو برحق کہا ہے، مگر اسے کرنے والے کو کافر قرار دیا ہے۔ قرآن پاک ہی میں جنات و شیاطین کا ذکر ہے۔ میرے بچے میری بات غور سے سن۔ میں جانتی ہوں تیرا بہت مطالعہ ہے، لیکن کیا تو نے کبھی اس ازلی حقیقت پر غور کیا ہے کہ شیطان کیا ہے؟" والدہ نے قرآن مجید پڑھا ہوا تھا اور وہ اس کی تعلیمات کا ادراک بھی رکھتی تھیں۔ وہ مجھے قائل کرنے کیلئے قرآن مجید کے حوالے دے کر بتانے لگیں۔

"اللہ تعالیٰ نے شیطان کو بدبختوں اور کافروں کا سردار بنایا ہے۔ وہ برائی کا مادہ ہے اور اپنا وجود رکھتا ہے۔ بظاہر ہمیں شیطان نظر نہیں آتا، مگر اس کے وجود سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ شیطان کی فوج میں بدروحیں اور شریر اجنہ شامل ہیں۔ وہ اس ہوائی مخلوق کے ذریعے ہی انسانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ برائی کی یہ قوتیں کالے علوم کی تابع ہیں اور کالا علم کرنے والے بدی کی ان پراسرار قوتوں سے مدد طلب کرتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ نوری علوم کے سامنے کالے علم کی کوئی حیثیت نہیں ہے، لیکن کالا علم بھی بہرحال اپنا وجود رکھتا ہے۔ پدمنی بھی بدی کے اس علم کی رسی سے بندھی ہوئی ہے اور وہ اپنی نجاست و نحوست سے ہمارے دلوں کو پراگندہ کرتی رہتی ہے۔ وہ ظاہری طور پر بھی ہم پر حملے کرتی رہی ہے اور تیرے میاں جی اس کے وبال سے بچنے کیلئے بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تیرے میاں جی کالا علم نہیں کرتے، تجھے مغالطہ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے عقیدت مندوں میں بہت سے عامل کالا علم کرتے ہیں۔ اس لیے تو اپنے باپ سے بدظن نہ ہو اور اپنی ضد چھوڑ دے۔" میری والدہ شوہر پرست خاتون تھیں، لہٰذا میں نے ان کے سارے دلائل یہ سمجھ کر رد کر دیے کہ وہ بہرحال ماں

ہیں اور میرے رویے سے خائف ہو کر مجھے اصل راہ سے ہٹانا چاہتی ہیں۔ جسے وہ میری ضد خیال کر رہی تھیں، وہی تو مجھے سچائی کی طرف لے جانے والا ایک روشن راستہ تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ سچائی جاننے کیلئے اگر مجھے اپنے پورے گھرانے کی ناراضگی مول لینا اور گھر چھوڑنا پڑا تو بالکل نہیں گھبراؤں گا۔

بالآخر وہ ساعتیں بھی آ ہی گئیں جنہوں نے میرے گھر والوں کو مضمحل کیا ہوا تھا۔ میں اس روز معمول کے مطابق اسکول گیا اور واپسی پر دوستوں کے ساتھ موہنی روڈ پر بھولو پہلوان کے اکھاڑے میں حاضری لگوانے کے بعد گھر آ گیا۔ میں جب گھر داخل ہوا تو ایک عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی اور گھر والوں نے کسی قیامت سے بچنے کیلئے جلدی جلدی کام نپٹا لیے اور بچوں سمیت کمروں میں دبک گئے تھے، البتہ والدہ کے کمرے سے آیت الکرسی پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کھانا کھایا اور کمرے میں سونے کیلئے چلا گیا۔ میں چچا افضل کے کمرے میں سویا کرتا تھا، جب سے میاں جی نے آستانے پر ڈیرہ لگایا تھا، چچا افضل نے ان علوم میں دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ البتہ وہ سونے سے پہلے آیات قرآنی کا ورد کیا کرتے تھے۔ میں کمرے میں پہنچا تو چچا افضل خلاف معمول سو رہے تھے حالانکہ وہ عشاء کے بعد دیر تک جاگتے رہتے تھے۔

میں خاموشی سے چارپائی پر لیٹا اور کمبل سر کا کر اوپر کر لیا۔ میں نے اپنے ذہن کو ہر طرح کے وسوسوں سے پاک کرنے کیلئے آیت الکرسی پڑھی اور خود پر دم کر کے سو گیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا جب مجھے اپنے بھائی بہنوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور دیکھا کہ چچا افضل ہاتھ میں لالٹین لیے باہر نکل رہے ہیں۔

"چچا کیا ہوا۔" میں نے پوچھا۔

چچا نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور منہ سے کچھ نہیں بولے۔ میں نے کمبل پرے پھینکا اور باہر دوڑ لگا دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے چھوٹے بہن بھائیوں کے کپڑوں کو آگ لگی ہے اور والدہ اور چچا اسے بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"اماں انہیں یہ آگ کیسے لگی ہے؟" میں نے چلاتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے قہر آلود نظروں مجھے گھورا اور سخت لہجے میں بولیں:

"دفع ہو جا میری نظروں سے، یہ سب تیری نافرمانیوں اور ضد کی وجہ سے ہوا ہے۔"

میں پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ پہلے چچا افضل نے مجھے ناراض نظروں سے دیکھا اور اب والدہ نفرت کا اظہار کر رہی ہیں، معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں گھر والے اس آگ کو پدمنی کی شرارت تو خیال نہیں کر رہے۔ یہ خیال آتے ہی میں پریشانی کے باوجود ہنس پڑا، مگر جونہی آگ سے جھلستے بھائی بہنوں کو دیکھا تو میرا اطمینان اور خود اعتمادی کا مینار یکدم منہدم ہو گیا۔ انہیں یوں تڑپتا اور جھلستا کیسے دیکھ سکتا تھا۔ میں جھٹ سے نلکے پر گیا اور پانی سے بھری بالٹی ان پر الٹ دی، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آگ بجھنے کی بجائے مزید بھڑک اٹھی۔ اسی لمحہ والدہ چیخیں "افضل جا اپنے میاں جی کو بلا کر لا۔ وہ گورا قبرستان گئے ہوئے ہیں۔"

"ٹھہرو چچا میں جاتا ہوں۔" میں خلاف معمول بول اٹھا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا، مہیب و سیاہ رات میں ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تھا، مگر میں جانے پہچانے راستوں پر دوڑتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا قبرستان جا پہنچا۔ قبرستان ہمارے گھر سے بمشکل ایک میل کے فاصلے پر تھا، لیکن میں جب وہاں پہنچا تو خوف و دہشت سے پسینے میں نہا چکا تھا۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی میں کانپتی ہوئی آواز میں میاں جی کو پکارنے لگا۔ تاریکی اور سناٹے میں میری آواز دور دور تک گونجی لیکن جواب میں کوئی آواز سنائی نہ دی۔ البتہ قبرستان میں سوئے پڑے کتے بھونکنے لگے۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اگر اس وقت کوئی کتا مجھ پر جھپٹ پڑا تو میں خالی ہاتھ اپنا دفاع کیسے کروں گا؟ یہ سوچتے یہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تاریک و مہیب قبرستان کی پراسرار دنیا میں یہ میرا پہلا قدم تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ رات کے وقت قبرستان کی دنیا کس قدر خوفناک ہو جاتی ہے۔ میں دم بخود ایک جگہ پر رک گیا اور میاں جی کو پکارنے لگا۔ مجھے ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اسی لمحہ مجھے اپنے قریب کھڑکا محسوس ہوا اور لگا جیسے کوئی بھاری وجود سوکھے پتوں کو روندتا ہوا میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ تاریکی میں ایک مناسب قد کا ہیولا آہستہ آہستہ میری طرف آ رہا تھا۔ وہ اور قریب آیا، تو سیاہ گھیرے دار لباس دکھائی دیا، سر پر سیاہ چادر تھی، لیکن چہرہ غائب تھا، میں نے سوچا کہ یہ میاں جی ہوں گے جو چلہ وغیرہ کیلئے ایسا ہی لباس پہن کر آئے تھے۔ میں یکدم ہیولے کی طرف یہ کہتا ہوا لپکا:

"میاں جی، میاں جی جلدی سے گھر چلیں، چھوٹے بہن بھائیوں کو آگ لگ گئی ہے۔"

میں نے ہیولے کو بازو سے تھام لیا اور اسی لمحہ ہیولے نے اپنے چہرے سے چادر سرکا دی۔ وہ کوئی انسانی وجود ہر گز نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ شعلے رقصاں تھے اور ناک کی جگہ ایک گڑھا تھا، جس سے دھواں دار سیال بہہ رہا تھا۔ موٹے موٹے ہونٹ اور سانپ جیسی سرخ زبان منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس نے جھٹ سے میرا بازو پکڑ لیا اور حشر برپا کرنے والا منحوس اور دہشت زدہ نسوانی قہقہہ فضا میں گونجا:

"بالکے تو بڑا بے تاب ہے میاں جی سے ملنے کو....." ہیولہ استہزائی انداز میں مخاطب ہوا! "تجھے بڑی فکر ہے اپنے بھائی بہنوں کی۔"

"تو کون ہے؟" میں نے دہشت سے کانپتے ہوئے پوچھا۔

"تو مجھے جانتا ہے بالکے، میں کون ہوں۔" اس نے میرے بازو کو جھٹکا دیا، تو لگا جیسے میرا بازو جسم سے جدا ہو گیا ہے، میں بے اختیار چیخ پڑا:

"خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔"

جواب میں ایک اور مہیب اور استہزائی قہقہہ گونجا اور وہ بھیانک چہرہ بولا:

"میں پدمنی ہوں بالکے، تجھے تو میرا انتظار تھا".....

یہ سنتے ہی میرے اعصاب حواس باختہ ہو گئے اور سر چکرانے لگا "تو پدمنی ہے؟"

"ہاں، میں ہی پدمنی ہوں بالکے۔ میں ہی وہ قہر ہوں جو تیرے خاندان پر نازل ہوتا رہا ہے اور جب تک میری آتما کو شانتی نہیں مل جاتی، میں تیرے خاندان کو اذیت دیتی رہوں گی۔" مجھے اس کے منہ سے تعفن کے بھبکے آنے لگے۔ اس کی سانسوں نے مجھے مزید بدحواس کر دیا اور لگا جیسے میں گندگی کے پہاڑ تلے دب چکا ہوں۔ مجھے گلے سڑے گوشت کی بو اور فضلے کی آمیزش سے آلودہ اس کی سانسوں سے ابکائی اور میں دکراتا ہوا زمین پر گر گیا۔

پدمنی نے ایک اور وحشت انگیز قہقہہ لگایا اور ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے گردن سے دبوچ لیا۔ وہ مجھے ہوا میں معلق کر کے میرا چہرہ اپنے منہ کے قریب لے آئی۔ میرا سارا جسم تشنج زدہ ہو گیا اور میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اس نے میری گردن دبوچ کر فضا میں یوں لٹکا دیا جیسے پھانسی کے پھندے میں لاش جھولتی ہے۔ میری آنکھیں اور زبان ابل پڑیں اور چیخیں حلق ہی میں دب گئیں۔ مجھے لگا کہ یہ میری جان کنی کا مرحلہ ہے اور پدمنی کی شعلہ فگن آنکھیں میرے اندر سرایت کر رہی ہیں۔ اس کی ناک سے بہتا ہوا دھواں دار سیال ابلنے لگا اور اس کے چھینٹے میرے چہرے پر پڑنے لگے۔ مجھے احساس ہوا جیسے میرے اندر کوئی وجود اتر رہا ہے۔ میری روح میرے بدن کا پیرہن چھوڑ رہی ہے اور کوئی نیا وجود میرے اندر تخلیق پا رہا ہے۔ میرے اندر توانائی کا احساس بھی بڑھ گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہی منحوس قہقہہ گونجا، تو مجھے گمان ہوا جیسے کوئی میرے بدن کے مساموں میں کھڑکیاں بنا کر قہقہے لگا رہا ہے۔ پدمنی میری پور پور میں اتر گئی تھی، میرا ذہن اس کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں دھڑام سے زمین پر گرا اور گردن کا تناؤ بھی ختم ہو گیا۔

نیچے گرتے ہی میں نہایت پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ پدمنی میری نظروں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنے حواس بحال کر کے میاں جی کو آواز دینے ہی والا تھا کہ یکایک مجھے احساس ہوا کہ میں اب اکیلا نہیں ہوں بلکہ میرے اندر ایک اور وجود ہے اور وہ یقیناً پدمنی تھی۔ اس وقت مجھے اپنے خاندان سے وابستہ کہانیاں یاد آئیں اور میں خوف و دہشت سے ایک بار پھر کانپ اٹھا۔ پدمنی میرے ذہن و قلب پر مسلط ہو چکی تھی۔ میں نے جب میاں جی کو پکارنا چاہا تو منمنا کر رہ گیا اور دہشت زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

پدمنی نے مجھے کھلونا بنالیا اور مجھے ادھر ادھر بھگانے لگی۔ میں اندھیرے میں قبروں کے اوپر اور کبھی کسی ٹوٹی پھوٹی قبر کے اندر جا گرتا، مگر وہ فتنہ محشر مجھے دوبارہ کھڑا کر دیتی اور مجھے کتوں، بلیوں اور پرندوں کے انداز میں چیخنے چلانے پر مجبور کر دیتی۔ میری بے بسی پر قہقہے لگاتی، تو میرے اندر سارے اعضا اتھل پتھل ہو جاتے اور کلیجہ منہ کو آجاتا۔ نہ جانے یہ عمل کب تک جاری رہتا کہ اچانک مجھے لالٹین جلتی نظر آئی۔ میں بے اختیار اس طرف بھاگا اور گرتا پڑتا وہاں تک پہنچ گیا، مگر سامنے کا منظر دیکھ کر میری جان ہی نکل گئی۔ میاں جی ایک قبر کے پاس گرے پڑے تھے اور ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ پاس ہی عملیات کے سامان والا تھیلا پڑا تھا۔ میں ان کی طرف بڑھنے لگا تو پدمنی نے میرے اندر شورش برپا کر دی اور قہقہہ لگا کر بولی:

''تو نے دیکھ لیا اپنے میاں جی کو، پدمنی کو ناراض کرنے والے کا یہی حشر ہوتا ہے۔''

میں بری طرح نڈھال ہو چکا تھا، لیکن میاں جی کو یوں لاچار پڑے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا، ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ شیطان بن کر میری رگوں میں دوڑنے والی پدمنی نے میرے بدن میں نشتر چبھونے شروع کر دیے اور میں بے اختیار ہو کر تڑپنے لگا۔

لاچارگی، بے بسی اور نفرت کے مارے میرے منہ سے بس اتنا ہی نکلا'' پدمنی خدا تجھے غارت کرے''

''اس سے پہلے میں تم باپ بیٹے کو غارت کر دوں گی۔'' وہ منمنا کر بولی۔ پھر اس نے میرے حواس کو قابو کر لیا اور مجھے پاس ہی پڑا ایک بڑا سا پتھر اٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں اب اس کے تابع تھا، البتہ میرے اندر کشمکش جاری تھی۔ میں نے پتھر اٹھایا، تو وہ بولی:

''یہ پتھر میاں جی کے سر پر دے مار۔'' مجھے اپنے حواس پر قدرے قابو تھا، لہٰذا میں نے پتھر نیچے پھینک دیا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے مجبور کرتے ہوئے پتھر اٹھوا لیا۔ پتھر کم از کم ایک من وزنی تھا۔ اب کی بار پدمنی نے میرے حواس کو نہیں چھوڑا اور اس کی ہدایت پر میں، میاں جی کے سر پر پتھر مارنے ہی لگا تھا کہ معاً قبرستان ایک پر جلال آواز سے گونج اٹھا:

''خبردار! میاں جی پر پتھر نہ پھینکنا۔''

پدمنی نے یہ آواز سنتے ہی میرے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور دھاڑی ''جلدی کرو بالکے۔''

میں دوبارہ پتھر پھینکنے لگا تھا کہ یکایک مجھے سامنے سے کسی غیر مرئی وجود نے دھکا دیا اور میں پتھر سمیت پیچھے گر پڑا۔ اسی لمحے مجھے ایک اذیت ناک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی میرا سر کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

شاہ ایران کا عامل

جب میری آنکھ کھلی، تو میاں جی اور والدہ کے علاوہ ایک اور اجنبی چہرہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا، وہ استاد مراد تھا۔ شاہ ایران کا درباری عامل اور میاں جی کا شاگرد تھا۔ میں ہوش میں آتے ہی اٹھ بیٹھا اور میاں جی کو دیکھتے ہی رونے لگا۔

''میاں جی! آپ زندہ ہیں۔'' میں ان کے قدموں میں گر گیا۔ ''میاں جی! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو بہت تنگ کیا ہے۔''

میاں جی نے مشفق باپ کی طرح مجھے اٹھایا اور سینے سے لگا کر بولے ''اللہ کا شکر ادا کر اس نے مراد کو فرشتہ بنا کر ہماری مدد کیلئے بھیج دیا ورنہ آج وہ حرامزادی ہم دونوں کو مار دیتی۔''

میں نے آنسو پونچھ کر استاد مراد کا شکریہ ادا کیا، پھر میاں جی سے بھائی بہنوں کے بارے میں پوچھا۔ تو انہوں نے بتایا ''وہ طلسماتی آگ تھی''۔ ''پدمنی کے ایک موکل نے یہ آگ اس لیے جلائی تھی تاکہ تم گھر سے نکل کر قبرستان آ جاؤ۔'' میاں جی پشیمانی سے بولے۔ ''مجھ سے بھی ایک غلطی سرزد ہوئی ہے۔ مجھے چاہیے تھا ہوش و حواس سے کام لیتا، لیکن میں نے جذبات میں آ کر قبرستان میں چلہ شروع کر دیا اور نادانی میں حصار سے نکل گیا، یوں پدمنی کو حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔''

میاں جی نے بعد میں بتایا کہ استاد مراد اس رات اتفاقاً سے آستانے پر آ گیا تھا۔ وہ پہلے گھر گیا تو وہاں پدمنی کی جلائی ہوئی آگ بجھانے کے بعد قبرستان کی طرف بھاگا اور عین اس وقت وہاں پہنچ گیا جب پدمنی تمہارے ہاتھوں سے مجھے قتل کرانا چاہ رہی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس عفونت سے ہمیں بچا لیا۔

مجھ پر اس واقعہ نے شروع شروع میں بہت اثر کیا اور میں نے میاں جی کے ساتھ آستانے پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میری ساری خودداری، ہٹ دھرمی اور سچائی کی تلاش کا جذبہ مفقود ہو گیا اور میں میاں جی کے اشاروں پر چلنے لگا۔ مگر چند ہی ہفتوں بعد اکتا گیا اور ایک بار پھر میرے اندر بغاوت جنم لینے لگی۔ آستانے پر آنے والے سائلوں کی حرکتیں اور گمراہی کی باتیں دیکھ اور سن کر مجھے کوفت ہونے لگی اور میں نے آہستہ آہستہ خود کو آستانے سے دور کر لیا۔

اس زمانے میں مجھے شعر و سخن سے دلچسپی ہو گئی۔ میرے ایک استاد نے مجھ میں یہ شوق دیکھا، تو مجھے کہا ''ناگی! تیرے پاس تو گنگا بہتی ہے، تو اس سے فیض یاب کیوں نہیں پاتا۔''

میں نے دریافت کیا تو کہنے لگا ''استاد امن بازار حسن میں رہتے ہیں، تو وہاں جایا کر ان کی خدمت کر اور اصلاح لے۔ وہاں وقت کے بڑے بڑے شاعر ان کا حقہ پانی بھرتے ہیں۔''

میں استاد کی رہنمائی میں استاد دامن کے پاس جانے لگا۔ وہ سادہ لوح درویش منش شاعر تہ خانے میں شب و روز گزارتے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے وہاں کا ماحول پسند نہ آیا اور میں نے اپنے اسکول اور محلے کے دوستوں کے ساتھ مل کر نئے شوق تلاش کر لیے۔ پھر ایک وقت آیا کہ میری آوارہ گردی کی شکایتیں گھر آنے لگیں۔ میاں جی اور والدہ مجھے سخت برا بھلا کہتے، لیکن مجھے اپنے گھر سے وحشت ہونے لگی تھی اور میں زیادہ سے زیادہ وقت باہر ہی گزار دیتا۔ اس زمانے میں مجھ پہ پہلوانی کا بھی شوق سوار ہو گیا۔ موہنی روڈ پر بھولو پہلوان کا اکھاڑہ مرجع خاص و عام تھا، میں وہاں بھی جاتا تھا۔

میاں جی نے میرے طور اطوار بدلنے کی بھرپور کوشش کی مگر میں اب پہلے سے زیادہ گستاخ اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔ استاد مراد جو ہر وقت میاں جی کے ساتھ رہتا تھا، میری گستاخیوں پر کڑھتا اور پیچ و تاب کھاتا تھا۔

استاد مراد کی آنکھیں بڑی پر اسرار تھیں، چہرہ لمبوترا اور ناک طوطے کی چونچ جیسی، اس کے کان حیرت انگیز طور پر بڑے تھے جو اس کے چہرے پر بالکل نہیں جچتے تھے۔ اس نے اگر خشخشی داڑھی نہ رکھی ہوتی تو چہرہ بالکل اجڑا نظر آتا۔ بھورے رنگ کی داڑھی نے اسے خاصا مہذب بنایا ہوا تھا۔ میاں جی اس پر بے حد اعتماد کرتے اور جب کبھی کوئی خاص عمل کرنا ہوتا تو استاد مراد کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

استاد مراد مجھ پر بھرپور توجہ دیتا۔ میاں جی کے سارے شاگرد اور قریبی ساتھی مجھ سے خاصے مانوس تھے۔ میں عام طور پر کسی کی پروا نہیں کرتا تھا، مگر جب دیکھا کہ استاد مراد کسی نہ کسی بہانے سے میرے ساتھ رہنے کی کوشش کرتا ہے تو مجھے ناگواری سی محسوس ہونے لگی۔ میں جونہی اسکول سے آتا وہ مجھ سے چمٹ کر رہ جاتا۔ گھر سے باہر نکلتا تو میرا سایہ بن جاتا اور مجھے وحشت ہونے لگتی۔

بھولو پہلوان نے کہا تھا

یہ 1967ء کا زمانہ تھا۔ بھولو پہلوان رستم زماں کشتی لڑنے کیلئے ولایت جا رہے تھے۔ وہ اپنے بھائیوں اسلم پہلوان، اعظم پہلوان، اکرم عرف اکی پہلوان اور اپنے خلیفوں اور پٹھوں کے ساتھ زور کرتے تھے۔ انہیں دیکھنے کیلئے پوری آبادی وہاں امڈ آتی تھی۔ میں بھی بھولو پہلوان کا شیدائی تھا اور انہیں دیکھ دیکھ کر مجھے بھی پہلوانی کا شوق ہو گیا، لہٰذا میں جونہی کالج سے آتا، سیدھا اکھاڑے چلا جاتا۔ دوپہر کا وقت ہوتا، اکھاڑے کی مٹی گرمی سے تپ رہی ہوتی، مگر میں اور محلے کے کچھ جنونی لڑکے اکھاڑے میں کسرت کرتے تھے۔ بھولو پہلوان سہ پہر کے وقت اکھاڑہ کرنے آتے۔ ان کے آنے سے پہلے ہم کسرت کر کے فارغ ہو جاتے اور پھر کسی کی مدد سے اکھاڑے کی مٹی کھودنے لگ جاتے تھے۔ بھولو پہلوان مجھے میاں جی کے حوالے سے جانتے تھے۔ وہ کبھی کبھار میاں جی سے دم درود کراتے تھے، اس لیے جب اکھاڑے میں آتے تو مجھے تھپکی دے کر لنگوٹ کسنے چلے جاتے۔ وہ نہایت حلیم و شفیق اور معصوم انسان تھے۔ ان کے سڈول بدن میں بجلیاں بسیرا کرتی تھیں۔ زور کے دوران ان کے جلوے دیکھنے کے لائق ہوتے۔ وہ اپنے شہ زور بھائیوں کو ایسی دھاک مارتے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ چشم زدن میں تین چار گرانڈیل پہلوان اکھاڑے کی مٹی پر چت نظر آتے تھے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ اکھاڑے کے کنارے بیٹھ کر پہلوانوں کے داؤ پیچ نہایت غور سے دیکھا کرتا تھا۔ ایک روز استاد مراد نے مجھے وہاں آلیا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کیلئے کہا، لیکن میں اس وقت اکھاڑے سے جاتا تھا، جب بھولو پہلوان لنگوٹ کھول دیتے تھے۔ وہ عموماً مغرب کے وقت نہا دھو کر اکھاڑے میں نماز ادا کرتے تھے۔ استاد مراد نے اس روز مجھے وہاں سے اٹھانا چاہا تو میں سخت برہم ہوا۔ اسے میرا لہجہ بہت برا لگا اور اس کی پرسرار آنکھوں میں عجیب سی وحشت عود آئی۔ اس نے پہلی بار سخت اور درشت لہجے میں مجھے تنبیہ کی۔

"ناگی، میں تیرا ناس مار دوں گا۔ میں صرف میاں جی کی وجہ سے تیری عزت کرتا ہوں ورنہ آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ استاد مراد کے ساتھ اونچی آواز میں بات کرے۔" استاد مراد نے دبنگ آواز میں مجھے دھمکی دی۔

"مجھے میاں جی کا حکم ہے کہ تجھے راہ راست پر لاؤں، تیری خیر اسی میں ہے کہ میرے ساتھ آستانے پر چل ورنہ ابھی ادھر ہی تیری پہلوانی نکال دوں گا۔"

لگاتار کسرت کے باعث میرا بدن مضبوط ہو چکا تھا میں اپنے اندر جوانی کا خمار اور تکبر محسوس کرتا تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں پہلوانی کرنے والوں کو اپنی طاقت کا بڑا زعم ہوتا ہے، لہٰذا میں نے استاد مراد کی تنبیہ و سرزنش کی پروانہ کی۔ اس وقت ویسے بھی میں اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ میرے دوست مجھے ناگی شہزادہ پہلوان کہہ کر پکارتے تھے، لہٰذا میں نے استاد مراد کے سخت رویے کو اپنی سبکی خیال کیا اور کہا:

"اگر تو میاں جی کا جوٹھا کھا پی نہ رہا ہوتا، تو میں پٹھی مار کر تیری ساری اکڑ نکال دیتا۔ اب تیری خیریت اسی میں ہے کہ فٹافٹ یہاں سے بھاگ جا۔"

بھولو پہلوان نے یہ بات سن لی، انہوں نے مجھے آواز دی "اوے کاکا، بزرگوں سے اس طرح بات نہیں کرتے۔" ان کے لہجے میں اس قدر حلاوت تھی کہ ان کی سرزنش بگڑے سانڈ کا خمار بھی اتار دیتی تھی۔

استاد مراد نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بھولو جی سے کہنے لگا "پہلوان جی آپ ہی اسے سمجھائیے۔ یہ اپنے باپ سے گستاخی کرتا ہے اور بزرگوں سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے اسے۔"

استاد مراد کوئی تیس سال کا نوجوان تھا، مگر کالے علوم پر دسترس کی وجہ سے استاد کہلاتا تھا۔ بھولو پہلوان بھی استاد مراد کو جانتے تھے، لہٰذا وہ ہمارے پاس چلے آئے اور کہنے لگے:

"یہ کاکا بڑا سمجھدار ہے۔ آپ پیار سے سمجھایا کریں، سمجھ جائے گا"۔ پھر مجھے ناصحانہ انداز میں سمجھانے لگے "دیکھ پتر، اگر تو اپنی دنیا اور آخرت بنانا چاہتا ہے تو بزرگوں کی عزت کیا کر۔ جو اپنے ماں باپ اور بڑوں کی عزت نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ مجھے دیکھو! میں تمہارے سامنے کھڑا ہوا، میں نے آج تک جو کچھ بھی پایا ہے بزرگوں کی دعاؤں اور نظر کرم سے پایا ہے۔ میں جانتا ہوں تجھے پہلوانی کا بھی شوق ہے، مگر کاکا جو تیرے بزرگ کہتے ہیں وہ بھی کیا کر۔" میں اس وقت نہیں سمجھ سکا کہ بھولو پہلوان نے مجھے یہ نصیحت کیوں کی تھی اور اس کا مطلب کیا تھا، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ استاد مراد نے انہیں میری اور میاں جی کی چشمک کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا اور انہیں کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے خاندانی علوم سیکھنے پر آمادہ کریں۔ میں چونکہ بھولو پہلوان سے بے حد متاثر تھا، لہٰذا مجھے اپنے رویے پر سخت ندامت ہوئی اور میں نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ میں بڑوں کے ساتھ نرم لہجے اور تمیز کے ساتھ بات کیا کروں گا۔

میں استاد مراد کا احسان مند تھا کہ اس نے مجھے اور میاں جی کو پدمنی کی طاغوتی طاقت سے بچایا تھا، لیکن میں اس احسان کے بدلے اپنی آزادی اور نظریات ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی روز استاد مراد مجھے آستانے پر لے کر آیا اور میاں جی کے حجرے میں بٹھا کر تھوڑی دیر کیلئے باہر چلا گیا۔ اس وقت حجرہ خالی تھا۔ انگیٹھی میں عملیات کے دانے سلگ رہے تھے۔ طاق پر سنہری غلاف میں قرآن پاک کا جہازی نسخہ سجا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میاں جی نے قرآن پاک کو محفل رحمت و برکت کیلئے حجرے میں سجایا ہوا ہے، حکیم جی کی وفات کے بعد انہوں نے کبھی اسے طاق سے نیچے اتار کر پڑھا نہیں ہو گا۔ حجرے میں بند تھیلیوں میں عملیات کیلئے رکھی ہوئی نجس اشیاء بھی پڑی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ جب تک استاد مراد یہاں رہے گا حرام جانوروں کی کھوپڑیاں، خون اور چربی بھی آستانے میں آئے گی اور ان کی نجاست سے میرے دادا حکیم جی کا قائم کردہ روحانی مرکز پلیدگی کا شکار رہے گا۔ میرے دل میں آیا کہ ان تھیلیوں کو اٹھا کر باہر پھینک دوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ استاد مراد شیطانی مسکراہٹ لیے حجرے میں آ گیا اور آتے ہی قہقہہ لگا کر بولا ''بس کام ہو گیا ہے۔ ابھی ہم چلتے ہیں۔''

''کہاں چلنا ہے اور کون سا کام ہو گیا ہے؟'' میں نے الجھی نظروں سے اسے دیکھا۔

''راوی کے کنارے جانا ہے کاکے۔'' اس کی پراسرار اور وحشی آنکھوں میں طاغوتی چمک پیدا ہوئی۔ وہاں تجھ سے چوکی کرانی ہے۔''

'چوکی.....'' میں یکدم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''استاد تیرا دماغ تو ٹھیک ہے، تو مجھ سے چوکی لگوائے گا کیا تو نہیں جانتا کہ مجھے اس کافرانہ کام سے نفرت ہے۔''

''مگر تیرے لیکھوں میں یہ کام لکھا جا چکا ہے کاکے۔'' وہ مجھے رام کرنے کیلئے پراسرار لہجہ اختیار کرنے لگا۔ ''تو نہیں جانتا تیرے مقدر میں پراسرار علوم سے روزی لکھ دی گئی ہے اور تو اپنے وقت کا بہت بڑا عامل بنے گا۔''

''میں چلتا ہوں۔'' اس کی بات سن کر مجھے گھبراہٹ ہونے لگی اور میں حجرے سے باہر نکلنے لگا تو اس نے میرا بازو تھام لیا۔ استاد مراد دبلا پتلا بظاہر کمزور سا شخص تھا، مگر اس لمحے جب اس نے میرا بازو تھاما، تو بے اختیار میری چیخ نکل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی انگلیاں فولاد سے بنی ہوئی ہیں۔ میرا بازو اس کے استخوانی ہاتھوں میں یوں جکڑا گیا جیسے شکنجے میں آ گیا ہو۔

''پہلوان! تجھے تو اپنی طاقت پر بڑا مان تھا۔'' استاد مراد کی طاغوتی آنکھوں میں تمسخر امڈ آیا۔ میں نے جھٹکے سے بازو چھڑانا چاہا، تو اس نے قہقہہ لگایا۔ ''ناں کاکے ناں..... جو چیز ایک بار ان ہاتھوں میں آ جائے اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھڑا سکتی۔'' میں اس کی بات سے یکدم مشتعل ہو گیا اور بھولو پہلوان کی نصیحت فراموش کر کے استاد مراد سے الجھ پڑا۔ میں نے کشتی کا ایک کارگر داؤ استعمال کر کے اسے نیچے گرانا چاہا، مگر اپنے داؤ کا خود ہی شکار ہو گیا اور اپنے زور میں دھماکے کے ساتھ حجرے کی سخت زمین پر گر گیا۔

استاد مراد نے میرا بازو چھوڑ کر میرے سینے پر پاؤں رکھا اور نہایت رعونت کے ساتھ بولا ''تو استاد مراد کو نہیں جانا۔ اگر سلامتی اور دنیا میں ترقی کرنا چاہتا ہے تو استاد مراد کا ہاتھ تھام لے، ورنہ زندگی بھر اس طرح چت ہوتا رہے گا۔'' استاد مراد کے لہجے میں نہ جانے کیا دہشت تھی کہ میں لرز کر رہ گیا۔ مجھے اس کا وہ روپ یاد آ گیا جب اس نے مجھے پدمنی کے عتاب سے بچایا تھا۔ اس وقت تو میں یہی سمجھا تھا کہ اس نے علوم کی طاقت سے اپنا اور میرا تحفظ کر لیا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ بظاہر نحیف و نزار نظر آنے والے بدن کو علوم کی طاقت سے اس نے فولاد بنایا ہوا ہے۔ اس کا پاؤں میرے سینے پر ہاتھی کے پاؤں کی مانند تھا، بے تحاشہ بوجھ سے میری سانس اکھڑ رہی تھی۔ بے بسی سے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور مجھے گماں ہوا کہ میری پہلوانی اور خود اعتمادی ان آنسوؤں کے ساتھ ہی بہہ گئی ہے۔

میں لاچارگی سے استاد مراد کو دیکھتا رہ گیا، پھر اس نے مجھے اٹھایا اور سینے سے لگا کر اپنے طاغوتی روپ کی کینچلی اتار کر پیار بھرے لہجے میں بولا

'' ناگی یار! تیری اور میری عمروں میں کوئی دس سال کا فرق ہے۔ ابھی تو یہ فرق خاصا نظر آتا ہے، مگر تھوڑے عرصے بعد یہ مٹ جائے گا۔ زمانے کی سختیاں اور آزمائشیں یہ فرق ختم کر دیتی ہیں۔ اس لیے تو ابھی سے مجھ سے دوستی کر لے، میں تجھے مالا مال کر دوں گا۔''

میں نہیں جانتا تھا کہ استاد مراد کو مجھ سے کیا غرض تھی اور وہ مجھے اپنی دوستی کی پیشکش کیوں کر رہا تھا، البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ میاں جی سے بے حد پیار کرتا تھا اور میاں جی کو اپنے اس شاگرد پر بڑا مان تھا۔ وہ حق شاگردی ادا کرنے کیلئے مجھے اپنی راہ پر لانا چاہ رہا تھا۔ بہر حال میں نے ناچار استاد مراد کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا اور کہا: ''استاد! تمہیں ایک وعدہ کرنا پڑے گا۔''

''کون سا وعدہ کاکے۔'' اس نے انسیت سے پوچھا۔

''میں عملیات وغیرہ نہیں سیکھوں گا۔'' میں نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

''ٹھیک ہے..... مگر تم کو بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔'' استاد مراد نے جواباً کہا۔

''وہ کیا'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''وہ یہ وعدہ کہ تم کالج سے آتے ہی میرے ساتھ رہا کرو گے اور جہاں میں جاؤں گا میرے ساتھ جایا کرو گے۔'' میں نے وعدہ کر لیا اور یوں میری اور استاد مراد کی مشروط محبت کا سلسلہ بڑھنے لگا۔ مجھے اس کی ذات سے عجیب سی انسیت ہونے لگی۔ وہ مجھے ایران کی باتیں بتاتا۔ اس زمانے میں رضا شاہ پہلوی کی بادشاہت قائم تھی۔ استاد مراد کو شاہی نجومی اور عامل ہونے کا بھی اعزاز حاصل تھا وہ شاہ اور اس کی ملکہ سے ملاقاتوں کے قصے سناتا جس سے مجھے ایران اور شاہی خاندان کو دیکھنے کا شوق ہونے لگا۔ میں نے میٹرک کے بعد ایف اے کرنے کیلئے اسلامیہ کالج سول لائن میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایران سے دلچسپی کی وجہ سے مجھے فارسی کا بھی شوق ہو گیا، لہٰذا میں فارسی کی کتابیں لے کر استاد مراد کے پاس جاتا اور وہ مجھے فارسی پڑھانے لگا۔

فارسی نہایت شیریں اور حکایات سے بھری زبان ہے۔ استاد مراد اس زبان کا ماہر تھا۔ وہ میرے شوق و جنون کی حوصلہ افزائی کرتا اور ایران کی تہذیب و روایات سے وابستہ کہانیاں بھی سناتا۔ اس نے آہستہ آہستہ میرے دل میں گھر کر لیا اور وہ شخص جسے دیکھ کر مجھے کوفت ہوتی تھی، اب اچھا لگنے لگا۔ میں اسے صرف کالے علم کا ماہر سمجھتا تھا، جب اس کے قریب ہوا تو اسے فارسی زبان کا عالم پایا۔ اسے انگریزی اور اردو پر بھی خاصی دسترس تھی۔

فارسی سے رغبت اور استاد مراد کی ذات نے میری دلچسپیاں بدل ڈالیں۔ اب میں کالج سے آتے ہی آستانے پر چلا جاتا۔ وہ میاں جی کے ساتھ بیٹھا ہوتا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر باہر آ جاتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میاں جی کے رویے میں بھی تبدیلی آ رہی تھی۔ پہلے مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں نفرت امڈ آتی تھی، مگر جب سے میری اور استاد مراد میں گاڑھی چھننے لگی تھی ان کے چہرے پر سکون سا محسوس ہونے لگا تھا۔

جہاں عامل چلہ کاٹتے ہیں

ایک روز میں استاد مراد سے ملنے کیلئے آستانے پر پہنچا تو وہ جلدی میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا "کاکے میں اس وقت دریائے راوی پر جارہا ہوں، تم مجھے شام کو مل لینا۔"

"وہاں دوپہر کے وقت کیا کرنے جارہے ہو؟" میں جانتا تھا کہ وہ رات کے وقت راوی کے کنارے عمل کرنے جاتا تھا۔ اس لیے مجھے اچنبھا ہوا اور دریافت کر بیٹھا۔

"بعض کام دوپہر کو بھی کرنے پڑتے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا "اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو آجاؤ۔"

میں تو اس کی قربت کا متلاشی رہنے لگا تھا، لہٰذا فوراً حامی بھر لی۔ "ہاں میں بھی ساتھ چلوں گا۔" میں نے کہا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میاں جی آستانے کے دروازے میں کھڑے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ وہ یہ سن کر بولے "مراد، اس نامراد کو لے کر جارہا ہے، تو دھیان بھی رکھنا"۔

"مرشد جی آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کا پورا خیال رکھوں گا۔" اس نے میاں جی کو تسلی دی۔ مجھے ان کی معنی خیز گفتگو کی سمجھ نہ آئی اور میں نے پوچھا:

"استاد کوئی خطرناک کام کرنے جارہے ہو۔"

"ہے تو خطرے والا ہی کام" اس نے کندھے اچکائے اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک تھیلا مجھے تھما کر بولا "لو یہ تم پکڑو۔"

"اس میں کیا ہے؟" میں نے بھاری بھر کم تھیلا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"کاکے اس میں عملیات کا سامان ہے۔" اس نے وضاحت کی اور چل پڑا، یہ سنتے ہی میرا جی متلا گیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس سامان میں کیا کچھ خرافات اور حرام چیزیں ہو سکتی تھیں۔ میں یکدم تھیلا نیچے رکھنے لگا کہ معاً استاد مراد نے پلٹ کر دیکھا "اوئے کاکے۔ یہ کیا کرنے لگے ہو۔ خبردار اسے نیچے نہ رکھنا۔"

"استاد! مجھ سے یہ سامان نہیں اٹھایا جائے گا۔" میں نے کراہت سے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"زیادہ باتیں نہ کر اور چل میرے ساتھ سمے بیت رہا ہے۔" استاد مراد نے درشت لہجے میں کہا۔ وہ جب بھی سخت لہجے میں بولتا اس کی آنکھوں کی طاغوتی طاقتیں بیدار ہو جاتی تھیں۔ مجھے اس کی آنکھوں سے وحشت ہونے لگتی اور میں بادل نخواستہ اس کی بات مان لیتا۔

پہلے تو میں تھیلا ہاتھ میں پکڑے چلتا رہا، مگر دو فرلانگ کی مسافت کے بعد مجھے تھیلا کندھے پر رکھنا پڑا۔ آستانے سے دریائے راوی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا اور ہمیں کھیتوں میں سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں وہاں آبادی نہیں تھی، مگر آج کل یہ علاقہ آباد ہو چکا ہے۔

میں نے تھیلا جونہی کندھے پر رکھا اس میں رکھی مکروہ اشیاء کی ناگوار بو سے میرا جی متلانے لگا۔ اس طرح کے تھیلوں میں الو کا خون، کالی بلی کی ہڈیاں اور سیہ کا تکلا تو عام طور پر شامل ہوتے تھے، مگر کسی خاص عمل کے دوران اور بہت سے حرام جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کا خون اور گوشت بھی رکھا جاتا تھا۔

کالے علم کے ماہر ان اشیاء کے بغیر کوئی بھی چلہ یا چوکی نہیں کرتے تھے۔ یہاں میں آپ کو یہ سمجھا دوں کہ کالے علم اور نوری علم میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کالا علم جادو کہلاتا ہے اور اس کے عامل عملیات کے دوران حرام و نجس اشیاء کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ وہ ان مکروہ اشیاء کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ اشیاء شیطان اور بھوت پریت کا بھرت یا نذرانہ کہلاتی ہیں جبکہ نوری علم کے عامل ان اشیاء کے استعمال سے دور بھاگتے ہیں۔ انہیں نوری عملیات کے لیے بالفرض کسی چیز کی ضرورت پڑے بھی تو وہ حلال اشیاء کو بطور صدقہ یا نذرانہ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں دالیں دیگر اجناس، گائے، بکرے، مرغ کا گوشت ہوتا ہے جو عموماً کالے جانور کا ہوتا ہے۔ اس حکمت کا راز یہ ہے کہ کالا جانور جنات، شیطانی، بھوت پریت کی پسندیدہ خوراک ہوتے ہیں، انہیں کالا رنگ مرغوب ہے۔ کالے علم اور نوری علم کے ماہر میں ایک اور واضح فرق یہ ہے کہ نوری علم کا ماہر باوضو اور طہارت کا پابند ہوتا ہے جبکہ کالے علم کے پجاری کیلئے طہارت و پاکیزگی قائم رکھنا ناممکن ہے۔ وہ گمراہ مسلمان جو کالے علم کا استعمال کرتے ہیں، ان کی جان سولی پر لٹکی ہوتی ہے کیونکہ ایک بار کالا علم سیکھنے اور پھر زندگی بھر اسی علم پر اکتفا کرنے والا عامل اپنے موکلین سے نجات نہیں پا سکتا اور انہیں خوش رکھنے کیلئے اسے حرام اشیاء کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کا گھر تعفن زدہ اور اس کے چہرے سے نحوست، مکاری اور وحشت ٹپکتی رہتی ہے۔ اللہ کی اس پر پھٹکار ہوتی ہے۔ بعض مسلمان عاملین کالے علم اور نوری علم کا ملغوبہ تیار کر لیتے ہیں جیسا کہ ہمارے میاں جی اور استاد مراد کرتے تھے۔ وہ کالے علم کے بھی ماہر تھے، مگر یہ علم بوقت ضرورت ہی استعمال کرتے تھے، زیادہ تر کام نوری علوم سے کرتے تھے۔ مخفی اور پراسرار علوم کے درمیان لٹکے یہ لوگ زندگی میں بہت سے عذاب سہتے ہیں اور ان عذابوں سے بچنے کیلئے ہر وقت صدقہ خیرات کرتے اور وظائف پڑھتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں آج بھی بہت سے گدی نشین اور پیشہ ور عاملین ایسے ہیں جو ان دونوں علوم سے استفادہ کرتے ہیں۔

میں طوعاً گرہاً تھیلا اٹھائے استاد مراد کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ راوی کے پاس پہنچ کر استاد مراد نے اپنے لبادے میں سے کالے منکوں والی ایک بڑی سی تسبیح نکالی اور شمال کی طرف منہ کر کے بڑبڑانے لگا۔ کچھ پڑھ چکا تو اپنے اور میرے اوپر پھونک مار کر تھیلا میرے ہاتھ سے لے لیا اور کہنے لگا:

"ناگی! اب مجھ سے کلام نہ کرنا اور دیکھو میں تیرے گرد حصار باندھ دوں گا، اگر کوئی چیز تمہیں تنگ کرے تو گھبرا کر بھاگنا نہیں۔ یہ لو چھری اور پاس رکھ لو۔ اس کی نوک اوپر کو رکھنا اور آنکھیں ہرگز بند نہ کرنا۔"

ہدایات دینے کے بعد وہ آگے چل پڑا اور پھر ہم دونوں راوی کے اس رخ پر چلنے لگے جدھر بارہ دری واقع ہے۔ دریا سوکھا تھا اور کہیں کہیں پانی جزیروں کی صورت میں ٹھہرا ہوا تھا۔ خشک جگہوں پر گدھوں، کوؤں اور کتوں کے غول پھر رہے تھے اور بعض جگہوں پر تو گدھ اور کتوں کے درمیان کسی چیز کے حصول پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ ہم دونوں ریت پر چلتے ہوئے بارہ دری کے قریب پہنچے تو منظر واضح ہو گیا۔ بارہ دری کے پاس گدھوں کا غول ایک کالے بکرے کا گوشت نوچ رہا تھا، بکرا سر کے بغیر تھا اور لگ رہا تھا جیسے اسے تازہ تازہ پھینکا گیا ہے۔ کچھ دور ایک اور بکرا پڑا نظر آیا۔ میں نے غور کیا تو آس پاس گوشت کے لوتھڑے، ہڈیاں اور جانوروں کی سریاں نظر آئیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے راوی جانوروں کا مدفن ہے۔ مجھے اس لمحے ایک بار پھر کراہت محسوس ہوئی، مگر استاد مراد کے خوف سے خاموش رہا۔ گدھ ہمیں دیکھ رک آگے پیچھے ہٹ گئے۔ استاد تو بے خوفی سے ان کے درمیان سے گزر گیا، لیکن مجھے گزرتے ہوئے جھرجھری آ گئی۔ گدھ اور کتے مجھے خون آشام نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں دھڑکتے دل سے دوڑتا ہوا استاد مراد کے پاس پہنچ گیا۔ بعض گدھ میرے پیچھے خوفناک آوازیں نکالتے بھاگے، تو استاد مراد نے پلٹ کر انہیں ششکارا اور پھر اس کی پراسرار مسکراہٹ عود آئی "انتظار کرو ابھی تمہیں تمہاری خوراک دیتا ہوں۔ اس نے گدھوں اور کتوں کی طرف دیکھ کر کہا، پھر مجھے بتایا" کاکے۔ یہ گدھ اور کتے اس تھیلے میں رکھے تبرکات مانگ رہے ہیں۔"

اتنے میں بارہ دری آ گئی اور استاد مراد ملحقہ سیڑھیوں پر چڑھ گیا، پھر میں استاد کی معیت میں بارہ دری کے باغیچے میں آ گیا۔ وہاں کھجور کے درختوں کے جھنڈ تھے جس کے درمیان ایک صاف ستھری اور کشادہ جگہ پر دری بچھی تھی۔ استاد مراد مجھے لے کر جھنڈ میں داخل ہو گیا اور سامان دری پر رکھ کر مجھے ایک طرف بیٹھنے کو کہا۔ اس نے پھر میرے گرد ایک دائرہ کھینچ دیا اور میرے ہاتھ میں چھری تھما دی۔ میں خاموش اور خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ کسی عامل کے ساتھ چوکی پر بیٹھ رہا تھا۔

استاد مراد اب خود بھی دری پر بیٹھ گیا، اس نے تھیلے میں سے تمام مکروہ اشیاء نکال کر اپنے سامنے رکھ پھیلا دیں اور اپنے گرد بھی حصار کھینچ کر انگیٹھی جلانے لگا۔ اس نے پہلے کچھ خوشبویات اس میں ڈالیں پھر خون سے بھری ایک بوتل تیل کے مانند ان خوشبویات پر انڈیلی اور ماچس سے آگ لگا دی۔ شعلہ بھڑکتے ہی انگیٹھی نے یوں آگ پکڑی جیسے گیس کا چولہا جلانے سے پہلے گیس کھولی جائے اور بعد میں ماچس کی تیلی جلا کر قریب کی جائے، تو گیس یکدم لپک کر آگ پکڑ لیتی ہے۔

آگ جلد ہی دہکتے کوئلوں میں بدل گئی اور عجیب سی وحشت انگیز بو ماحول میں رچ بس گئی۔ استاد مراد نے تھیلے میں سے چوڑی ہڈیاں نکال کر سامنے رکھیں۔ پھر ایک قلم نکالا اور خون آلود بوتل میں ڈبو کر ہڈیوں پر کچھ لکھنے لگا۔ میں نے اس عبارت کو پڑھنا چاہا، مگر وہ کوئی آڑھی ترچھی لکیروں سے کوئی عجیب و غریب الفاظ لکھ رہا تھا۔ کچھ سے بعد اس نے وہ ہڈیاں انگیٹھی کے پاس رکھ دیں اور تسبیح پر کوئی علم پڑھنے لگا۔ تسبیح کا ایک دور پورا کرنے کے بعد اس نے تھیلے میں رکھا سامان بھی انگیٹھی کے پاس رکھ دیا اور انگشت شہادت سے اس کے گرد دائرہ لگا کر دوبارہ تسبیح پڑھنے لگا۔

میں دم بخود بیٹھا اس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ میرا دل بے اختیار تیز تیز دھڑکنے لگا اور مجھے نہ جانے کیوں احساس ہوا کہ یہاں کچھ ہو کر رہے گا۔ استاد مراد کی طاغوتی آنکھیں میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں اور مجھے اس کا چہرہ بھیانک دکھائی دینے لگا۔ میرے پورے بدن میں سنسنی پیدا ہو رہی تھی۔ جی میں آیا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں، مگر میں جانتا تھا کہ حصار قائم کیے جانے کے بعد عامل کی اجازت کے بغیر باہر نکل جانے سے کوئی مصیبت آسکتی ہے، لہٰذا خود پر جبر کیے بیٹھا رہا۔

استاد مراد جو زیر لب کچھ بڑبڑا رہا تھا، اب آہستہ آہستہ اونچی آواز میں پڑھائی کرنے لگا، اس کے جنتر منتر میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ وہ نہایت تیزی سے پڑھ رہا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اس کے منتروں میں شدت اور وحشت پیدا ہوتی گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بھاری بھر کم مشین چل رہی ہے۔ بیس پچیس منٹ کی پڑھائی کے بعد یکدم فضا میں کتوں کے بھونکنے اور گدھوں کی منحوس آوازوں کا شور بلند ہوا۔ ایسا لگا جیسے کتوں اور گدھوں کے درمیان گوشت کے حصول پر لڑائی شروع ہو گئی ہے، مگر کچھ ہی دیر بعد آوازیں دور جاتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس لمحہ مجھے کھجور کے درختوں پر پرندوں کے پھڑ پھڑانے کی آواز سنائی دی، دیکھا کہ بہت سارے گدھ جو کھجور اور دوسرے درختوں پر بیٹھے تھے، خوفزدہ ہو کر اڑ گئے ہیں۔ یکایک مجھے اپنے گرد پراسراریت محسوس ہونے لگی اور میرا جسم خوف سے تن گیا۔ میں نے چھری کی نوک آسمان کی طرف کر دی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر استاد کی طرف دیکھنے لگا۔

اسی لمحہ استاد نے بڑے زور سے انگیٹھی میں پھونک ماری، تو سلگتے کوئلوں میں نارنجی آگ کے شعلے زوردار آواز کے ساتھ بھڑک اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی کھجور کے درخت بھی زوردار انداز میں جھولنے لگے، یوں لگا جیسے طوفان آگیا ہے۔ مجھے خدشہ ہوا کہیں درخت ہم پر نہ گر پڑیں۔ ان کے جھولنے سے کچی پکی کھجوروں کے گچھے گرنے لگے اور بہت سے میرے سر پر یوں برسے جیسے بارش کے اولے پڑتے ہیں۔ میں نے قبل از وقت ہاتھ پر سر رکھ لیے تھے ورنہ کھجوروں کے بھاری گچھے گرنے لگنے سے دماغ چکرا جاتا۔ چند منٹ بعد طوفان تھم گیا اور ایک بھاری بھر کم آواز نے فضا کی وحشت میں زہر گھول دیا "مراد! تو نے مجھے کیوں بلایا؟"

"مجھے تجھ سے کام ہے۔" استاد مراد نے بھی جواباً سخت لہجے میں کہا۔

"کیا کام ہے تجھے نامراد۔" ایک بھاری بھر کم آواز گونجی۔ "کیا تو نہیں جانتا ہمیں تجریش کا مسکن چھوڑ کر آنا پڑا ہے اور کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ہم دن کے وقت حاضر نہیں ہو سکتے۔ اس کے باوجود تو نے یہ جرأت کیوں کی نا مراد۔"

"بکواس بند کرو۔" استاد مراد جلال و رعونت سے دھاڑا۔ "اپنا لہجہ درست کر۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے کب اور کہاں تجھے بلانا ہے، ادھر آ اور اپنا بھوجن کھالے۔ پھر تجھ سے بات کروں گا۔" یہ کہہ کر استاد نے حصار میں رکھی اشیاء پر خون کی ایک اور بوتل انڈیل دی۔

جواب میں نامعلوم وجود نے مکروہ قہقہہ لگایا اور بولا "نامراد تو ہمارے لیے یہ بھوجن لے کر آیا ہے۔ اتنے سے میرا پیٹ نہیں بھرے گا، تو ایسا کر وہ بالکا مجھے دے دے۔" یہ سنتے ہی مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"حرامزادے آرام سے بیٹھ جا۔ خبردار جو تونے کوئی شرارت کی، یہ میرے مرشد کا بیٹا ہے۔" استاد نے جھڑکا تو وہ ابلیسی قوت استہزائی انداز میں بولی:

"کیا مرشد کا بیٹا کھایا نہیں جاسکتا نامراد۔"

"میں کہتا ہوں زیادہ بکواس نہ کرو ورنہ میں تیری چمڑی ادھیڑ دوں گا۔ جو دے رہا ہوں آرام سے کھالے۔ جب میں تجریش آؤں گا تب تجھے خوش کردوں گا۔" استاد مراد نے اسے جھڑک کر کہا۔

"اچھا یہ ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر بھاری بھرکم، نحوست زردہ آواز ایک لمحے کیلئے خاموشی ہوئی اور پھر حصار میں رکھی اشیاء یکایک غائب ہو گئیں اور فضا میں چپ چپ کی آواز آنے لگی بالکل ایسے جیسے کتا پانی پیتے ہوئے نکالتا ہے۔

جب وہ اپنا بھوجن کھا چکا، تو استاد مراد نے اسے اجنبی زبان میں مخاطب کیا اور وہ بھی جواباً اس زبان میں بولنے لگا۔ دونوں کے درمیان تھوڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ استاد کے لہجے سے مجھے احساس ہوا کہ اس طاغوت سے کام لینے کیلئے اسے بار بار دھمکانا پڑ رہا ہے۔ بالآخر دس منٹ بعد وہ طاغوتی وجود رخصت ہو گیا، مگر جاتے جاتے اس نے ایک قہقہہ مارا اور انگیٹھی کو الٹا کر پرے پھینک دیا۔ اس کے جاتے ہی ایک بار پھر کھجور کے درخت لرزے اور فضا میں کتوں اور گدھوں کی منحوس آوازیں سنائی دیں۔

"حرامزادے کا دماغ بگڑ گیا ہے۔" استاد نے انگیٹھی سیدھی کرتے ہوئے اسے موٹی سی گالی دی۔ "میں تجریش آ کر تیری اکڑ نہ نکال دوں تو کہنا۔" پھر استاد نے جلدی سے سامان سمیٹا، کچھ پڑھنے کے بعد ارد گرد پھونک ماری اور پھر مجھے حصار سے باہر آنے کیلئے کہا۔ "چل بھئی کاکے۔"

میں گم سم اور وحشت زدہ سا ایک معمول کی طرح اس کے پیچھے ہو لیا۔ بارہ دری سے باہر نکلے تو گدھوں اور کتوں کے غول غائب تھے۔ مرے جانور اور گوشت اور ہڈیاں ویسی ہی بکھری تھیں۔ استاد نے تھیلے میں سے گوشت کے چند ٹکڑے نکالے اور انہیں ریت پر پھینک دیا۔ "کاکے تو پریشان ہے کیا۔" استاد نے راوی کے کنارے کی طرف چلتے ہوئے مجھے مخاطب کیا، مگر میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"میں تیرا سارا ڈر نکال دوں گا، ناگی یار۔" اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑا تو میں بے اختیار بول پڑا۔

"استاد یہ سب کیا ہے؟"

"میری جان یہ عاملوں کا مسکن ہے۔" استاد مراد نے نرم لہجے میں بتایا۔ "راوی عاملوں کیلئے نہایت مقدس مقام ہے۔ یہ صدیوں سے عاملین اور اللہ کے نیک بندوں کی چلہ گاہ ہے۔ گوشت، ہڈیاں اور سالم جانور جو دیکھ رہے ہو، یہ سب ان لوگوں نے یہاں پھینکے ہیں جو چوکی لگانے آتے ہیں یا کسی وظیفے کے بعد پرندوں اور جانوروں کو صدقہ خیرات کرتے ہیں۔"

"اور وہ کون تھا؟" میں نے دبی زبان میں پوچھا۔

"وہ..... ہاں تجھے اس سے ملواؤں گا خود پوچھ لینا کہ وہ کون ہے۔" استاد مراد نے خوشگوار انداز میں میرا کندھا تھپتھپایا، میرا تجسس بڑھ گیا۔

"استاد تم خود کیوں نہیں بتاتے ؟" اس وقت ہم راوی سے نکل کر بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ میری بات سن کر رک گیا اور میری آنکھوں میں اشتیاق دیکھ کر بولا، وہ تجریش کی پہاڑیاں ایران میں ہیں کا کے..... اور یہ جو عفونت آیا تھا، انہی پہاڑیوں میں رہتا ہے۔ تجریش کی برف پوش پہاڑیاں نہایت پراسرار ہیں، وہاں کالے علوم کے پجاری اور عملیات کرنے والوں نے اپنے مسکن بنا رکھے ہیں۔" استاد مراد نہایت رازداری سے آگے جھکا اور سرگوشی کے انداز میں بولا "تجریش کی یہ پہاڑیاں شاہ ایران کے محل کے پیچھے ہیں۔ شاہ ایران کے بہت سے عامل ان پہاڑیوں میں رہتے ہیں اور اپنے علوم کی مدد سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔"

یہ سن کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، استاد نے میری کیفیت دیکھ کر دھیمے اور پراسرار انداز میں کہا "میں تجھے تجریش کی پہاڑیوں میں لے کر جاؤں گا، کیا تم میرے ساتھ چلو گے ؟"

"ہاں استاد میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" میں نے بے ساختہ کہا تو اس کی آنکھوں میں طاغوتی قندیلیں روشن ہو گئیں اور اس کے حلق سے غراتے ہوئے درندے کی سی آواز نکلی۔ اس لمحے اس کا پراسرار اور عجوبہ چہرہ کسی سفاک درندے کی مانند تھا۔ میں اس کی یہ کیفیت دیکھ کر تھرا گیا۔

استاد مراد کا راز

میرے شب و روز استاد مراد کے ساتھ بسر ہونے لگے۔ ایک وقت تھا جب وہ میرا سایہ بن کر رہتا تھا، مگر جب مجھے اس نے ایران شناسی کی لت میں مبتلا کیا تو میں اس کا دیوانہ ہو گیا۔ فارسی جیسی میٹھی اور سحر افروز زبنا سیکھنے کی خواہش نے بھی مجھے استاد مراد کا گرویدہ بنا دیا، لہذا میں کالج سے آتے ہی اس سے ملنے چلا جاتا۔ راوی والے واقعہ کے بعد مجھے استاد مراد سے خوف بھی آنے لگا اور مجھے پراسرار دنیاؤں کے بارے میں جاننے کا تجسس بھی ہونے لگا، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ جونہی میرے اندر پراسرار علوم اور پراسرار دنیا کے بارے میں جاننے کی خواہش پیدا ہوتی میرے قلب و ذہن میں جنگ چھڑ جاتی۔ میرا ذہن ان واقعات کی پراسراریت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتا، مگر پدمنی اور استاد مراد کو چونکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس لئے ان دونوں واقعات نے میرے دل کو باور کروا دیا کہ ہماری ظاہری دنیا غیر مرئی لطیف اور پراسرار پردوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ انسانوں کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جو انسان سے زیادہ طاقتور ہے مگر ہمیں نظر نہیں آتی۔

اس زمانے میں پراسرار علوم اور مخفی دنیاؤں کے بارے میں جاننے کیلئے عام معلوماتی کتب دستیاب نہیں تھیں، صرف بزرگوں سے سنی ہوئی روایات، حکایات ہوتی تھیں۔ میں نے کم عمری ہی میں قرآن پاک پڑھ لیا تھا، لہٰذا جب مجھے پراسرار دنیاؤں کے بارے میں جاننے کا اشتیاق ہوا تو میں قرآن پاک اور احادیث کی کتب و تفاسیر پڑھنے لگا۔ خاص طور پر سورہ جن ترجمہ کے ساتھ بغور پڑھتا اور اس پر غور و خوض کرتا۔ مجھے یہ فائدہ ہا کہ میرا ذہن پراسرار دنیا کی مخلوق کے وجود کا قائل ہو گیا اور مجھے اپنی خاندانی روایات کی صداقت پر یقین آنے لگا۔

ویسے بھی انسان کی فطرت و جبلت میں ہے کہ وہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے، اس کا اثر ضرور قبول کرتا ہے۔ میرا ذہن جو ایک عرصہ سے خاندانی روایات اور علوم مخفی کی صداقت تسلیم نہیں کرتا تھا، لیکن جب خود پر بیتی تو ان علوم کی حقیقت کا قائل ہونے لگا۔

میاں جی کو معلوم تھا کہ میں آستانے پر صرف استاد مراد کی وجہ سے آنے لگا تھا، پس انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ استاد مراد کی عدم موجودگی میں مجھے کوئی چھوٹا موٹا کام کہہ دیتے اور میں نیم دلی سے انجام دے دیتا۔ میں جب ان سے استاد مراد کے بارے میں دریافت کرتا تو وہ ہمیشہ پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ مجھے تسلی دیتے ہوئے کہتے:

"ناگی پتر! تجھے استاد مراد سے بڑا پیار ہے، یار کبھی صرف اپنے باپ سے ملنے آجایا کر۔" ان کی مسکراہٹ میں شفقت ہوتی، مگر چہرے کے خدوخال میں چھپی پراسراریت ہمیشہ عود آتی۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ استاد مراد اور میاں جی کے درمیان استادی شاگردی کا رشتہ بہت طاقتور تھا اور دونوں مل کر کس قسم کے عملیات کرتے تھے۔ میاں جی کے علاوہ کوئی اور استاد مراد کی اصل حقیقت سے آگاہ نہیں تھا اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ہزاروں میل کی مسافتیں طے کر کے سال میں تین مہینے کیلئے میاں جی کے پاس کیوں آتا تھا۔ جب مجھے حقیقت کا علم ہوا، اس وقت بہت بدل چکا تھا۔ میں خود بھی عملیات کی لعنت میں گرفتار ہو گیا اور مجھے اس دلدل میں دھکا دینے والا استاد مراد تھا۔

استاد مراد ان دنوں بہت زیادہ پراسرار اور مصروف تھا۔ کالج سے آتے ہی جب میں اس سے ملنے آستانے پر جاتا تو میاں جی بتاتے کہ وہ کسی بڑے چلے کیلئے چو کی لگانے کیلئے فلاں قبرستان گیا ہوا ہے۔ میں وہیں انتظار میں بیٹھ جاتا۔ استاد مراد جب کبھی شام ڈھلے یا صبح منہ اندھیرے آستانے پر لوٹتا، تو خاصا بدلا بدلا اور تھکا تھکا نظر آتا۔ آتے ہی نڈھال سا ہو کر لیٹ جاتا، میاں جی کے گرگے اسے مٹھیاں بھرتے اور کسی سرخی مائل گاڑھے سیال سے اس کے بدن کی مالش کرنے لگتے۔ عموماً چانپی اور مالش کرنیوالے دو بھنگی قسم کے گرگے وہاں ہر وقت موجود ہوتے تھے۔ میری استاد مراد سے دو تین روز تک ملاقات نہ ہوئی تو اس روز میں عشاء کے بعد استاد مراد سے ملنے چلا گیا۔ آستانے کا دروازہ بند تھا، لیکن درزوں سے دیے کی روشنی چھن کر باہر آرہی تھی۔ میں بے دھڑک دروازے کو دھکا دے کر اندر جانے لگا کہ معاً خیال آیا کہ پہلے دیکھ تو لوں کہ اندر کون ہے اور کیا کر رہا ہے۔ آستانے کے اس حجرہ نما کمرے کی مشرقی جانب لکڑی کی ایک خستہ حال کھڑکی تھی جس کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا میں اس کے پاس گیا اور جھک کر اندر کا ماحول دیکھا تو محو حیرت رہ گیا۔ استاد مراد چٹائی پر چت لیٹا ہوا تھا، بدن پر صرف ایک لنگی تھی میاں جی سرخی مائل گاڑھے سیال سے اس کے سینے پر زور زور سے مالش کر رہے تھے۔ پاس ہی اگربتیاں جل رہی تھیں۔ دونوں بھنگی اس کی پنڈلیاں ریگ مال کی طرح رگڑ رہے تھے۔ میں حیران تھا کہ استاد مراد ایسا کونسا معرکہ سر کر کے

آیا ہے کہ اسے اتنی خدمت کی ضرورت پیش آگئی ہے کہ میاں جی بھی اس کی مالش کر رہے ہیں؟ پھر مجھے اس کی یہ حالت دیکھ کر پریشانی بھی ہوئی کہ خدا خیر کرے، استاد مراد کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے جھٹ سے دروازہ کھٹکھٹایا، چند لمحے بعد دروازہ کھلا تو میں جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔

استاد مراد مجھے دیکھتے ہی آسن جما کر بیٹھ گیا اور میاں جی بھی ہاتھ پونچھ کر تکیہ کے سہارے بیٹھ گئے۔ کمرے میں عجیب تعفن پھیلا ہوا تھا۔ اگر بتیاں نہ جل رہی ہوتیں تو میرے لیے اندر بیٹھنا مشکل تھا۔ استاد مراد نے مجھے مخمور اور وحشیانہ نظروں سے دیکھا پھر اپنی دائیں جانب، چٹائی پر رکھے ایک بڑے کوزے کو سرکا کر اپنے پاس کیا۔ کوزے میں کوئی سیال بھرا ہوا تھا جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ سخت گرمیوں کے دن تھے، اس موسم میں انسان ٹھنڈا پانی پینے کو ترجیح دیتا ہے مگر استاد مراد نے میرے دیکھتے دیکھتے یہ گرم سیال سے بھرا کوزہ منہ سے لگایا اور کسی درندے کی مانند شڑپ شڑپ کی آواز نکالتے ہوئے معدے میں انڈیل لیا۔

"شاباش، میرے شیر! ایک پیالہ اور پی جا ".....

میاں جی نے اسے حوصلہ دیا، تو استاد مراد نے خالی کوزہ پاس ہی کھڑے بھنگی کی طرف بڑھا دیا جس نے جھٹ سے ایک گھڑے میں سے وہی سیال کوزے میں ڈالا اور استاد مراد کو تھما دیا..... استاد وہ بھی غٹا غٹ پی گیا۔ اب کی بار وہ آسن توڑ کر اٹھا اور زور دار انگڑائی لینے لگا، تو اس کے بدن کی ہڈیوں کے تڑخنے کی آواز سنائی دی۔ استاد مراد پر مستی چھا گئی تھی۔ میں اس عجیب طلسمی اور پراسرار ماحول کی تاب نہ لا سکا اور غصے سے واپس پلٹنے لگا تو استاد مراد نے مدہوش کن لہجے میں مجھے پکارا "ناگی! تو ناراض ہو کر جا رہا ہے کیا؟"

استاد مراد کسی نشے باز کی طرح جھولتا میرے قریب آیا اور میرا بازو تھام کر اپنی طرف کھینچا۔ میں نے زور سے بازو چھڑا لیا اور گھور کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے منہ اور بدن سے بو آ رہی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے کراہت ہونے لگی اور دکھ بھی ہوا۔ میں نے کرب کے عالم میں سوچا کہ کیا یہ وہی استاد مراد ہے جو ہر وقت اپنے کپڑوں پر مشک کافور چھڑکتا تھا، مگر آج اس سے گھن آ رہی تھی۔

"استاد یہ تو نہیں لگتا، تیری جگہ کوئی بدروح کھڑی ہے!" میں نے قدرے جرأت سے کہا تو استاد مراد نے استہزائی قہقہہ لگایا۔

"میں تیرے استاد کی بدروح ہی تو ہوں۔" اس نے طاغوتی آنکھوں کے سحر میں مجھے لیتے ہوئے کہا اور میں جھرجھری لے کر بولا:

"کیا بک رہا ہے استاد؟"

"منہ سنبھال کر بات کر، ناگی۔" استاد مراد کے عقب سے میاں جی نے سرزنش کی۔ "تو نہیں جانتا استاد مراد کتنے بھاری چلے کاٹ کر آیا ہے۔ تجھے نہیں معلوم کہ بھاری چلوں کی کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ تجھے تو بس بکنا آتا ہے، جو تیرے منہ میں آتا ہے کہہ دیتا ہے۔"

میں نے میاں جی اور استاد سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور آستانے کا دروازہ زور سے بند کر کے چلا آیا۔ میں نے وہ رات بڑی مشکل سے گزاری۔ استاد مراد کی ہیئت گذائی اور اس کی طاغوتی حرکتوں کا بار بار خیال آتا اور میں اس کی شخصیت میں الجھ کر رہ جاتا۔

ماش کی گڑیا

رات تو جیسے تیسے کٹ گئی، مگر صبح فجر کے وقت جب والدہ مجھے نماز کیلئے اٹھانے آئیں، تو وہ قدرے گھبرائی ہوئی تھیں۔ میں سرخ و متورم اور جلتی آنکھوں سے اٹھا اور وضو کر کے نماز کیلئے جانے لگا، تو والدہ کو گھبرائے ہوئے دیکھ کر رک گیا۔ میرے پوچھنے پر وہ بولیں "تیرے ابا رات بھر نہیں آئے اس لیے پریشان ہوں۔"

"اماں تو کیوں فکر کرتی ہے، وہ آستانے پر ہیں۔ رات میری ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھے۔" میں نے ماں کو تسلی دینا چاہی تو وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولیں :

"استاد مراد بھی ادھر ہی تھا۔"

"ہاں اماں..... مگر آج....." میں اماں کو رات کے واقعات سے آگاہ کرتے کرتے رک گیا۔

"بول کیا کہنے لگ اتھا، تو.....؟"

"کچھ نہیں اماں....." میں ماں کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "اچھا میں نماز کیلئے چلتا ہوں۔"

"اچھا بات سن میرا ایک کام کرتے آنا" ماں نے ایک بار پھر سرگوشی کی اور کپڑے کی ایک پوٹلی مجھے تھما کر بولیں "یہ کالے ماش کی گڑیا گورا قبرستان دفن کر کے آنا۔"

"اماں یہ کیا ہے؟" میں نے ہاتھ پرے کھینچتے ہوئے کہا۔

"پتر میں نے وظیفہ پڑھ کر یہ عمل کیا ہے۔ اب اس گڑیا کو قبرستان میں دفن کرنا ہے اور دیکھ تو مجھ سے زیادہ بحث نہ کر۔ بس اپنی ماں کا یہ کام کر دے۔" اماں نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"لیکن اماں....." معاً مجھے وہ منظر یاد آ گئے جب میں چوکی لگانے کیلئے دریائے راوی پر گیا تھا، وہاں ریت پر اس قسم کی بے شمار پوٹلیاں بھی نظر آئی تھیں، لہٰذا میں نے اماں سے کہا: "ماں تو بھی میاں جی کے نقش قدم پر چل پڑی ہے۔"

"نہیں پتر، تو بحث بہت کرتا ہے۔" اماں الجھ کر بولیں "لا دے، میں افضل سے کہتی ہوں وہ اسے دفن کر آتا ہے۔" ماں ناراض ہو کر چچا افضل کو بلانے لگی، تو میں نے ان سے تھیلی جھپٹ لی اور کہا "چچا کو رہنے دے ماں، میں ہی یہ کام کر آتا ہوں۔"

اماں تعجب سے میرا منہ تکنے لگی پھر میری بلائیں لیتے ہوئے بولیں "پتر! نماز سے پہلے یہ کام کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تو نماز پڑھتے ہوئے اسے پیچھے رکھ کر بھول جائے۔ اگر تو نے ایسا کیا تو غضب ہو جائے گا۔ میرے عمل کی ساری کمائی برباد ہو جائے گی۔" ابھی نماز میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں ماں کو تسلی دے کر گورا قبرستان کی طرف چل پڑا۔

سحری کے تارے آسمان پر روشنی کی چادر تانے ہوئے تھے۔ قبرستان کی طرف چلتے ہوئے مجھے پچھلا واقعہ یاد آگیا، اس خیال کے ساتھ ہی میرے قدم لڑکھڑا گئے، مگر اماں سے چونکہ وعدہ کیا ہوا تھا، لہٰذا آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے قبرستان پہنچا اور نرم جگہ تلاش کر کے پوٹلی دفن کرنے لگا۔ اچانک خیال آیا کہ ایک بار دیکھ تو لوں کہ اس میں کیا رکھا ہے۔ میں نے پوٹلی کھولی تو اندر آٹے سے گندھی ایک عجیب ہیئت کی گڑیا تھی جس میں کپڑے سینے کی لاتعداد سوئیاں چبھی ہوئی تھیں۔ گڑیا کی آنکھوں کی جگہ دو سرخ دانے گڑھے تھے، ناک اور ہونٹوں کو زعفران سے نمایاں کیا گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میری والدہ عملیات کی ماہر نہیں تھیں، لیکن ان کا یہ روپ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی کہ انہیں عملیات کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ میں نے گڑیا تو دفن کر دی، مگر دل کرب سے تڑپ اٹھا۔ اس روز میں نے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا کی کہ یا اللہ مجھے اپنے گھرانے کی وہم پرستی سے بچا اور انہیں سچائی کا روشن راستہ دکھا۔

لیکن شاید میری دعاؤں میں اثر نہیں تھا یا میری گڑگڑاہٹ میں عاجزی نہیں تھی کہ اللہ کے حضور میری دعاؤں کو شرف بازیابی نصیب نہیں ہوئی۔ تقدیر نے میری التجاؤں اور ثابت قدمی کی لاج نہ رکھی اور میرے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ میں اپنی مرضی کے بغیر ہی گھر والوں کے متعین کیے ہوئے راستے پر چلنے لگا۔ میری مزاحمت دم توڑنے لگی اور میرا ذہن پراسرار علوم اور مخفی دنیا کے اسرار کو تسلیم کرنے لگا۔

اس روز میں کالج سے جلد لوٹ آیا۔ میری طبیعت بوجھل تھی اور گرانی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ گھر آ کر میں نے لاچارگی اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے کتابیں بستر پر پھینکیں اور چادر تان کر سو گیا۔ عرصے بعد میں دوپہر کو سوایا تھا ورنہ کالج سے آتے ہی آستانے پر استاد مراد کے پاس چلا جاتا تھا۔ رات جو میں نے مکروہ مناظر دیکھتے تھے، اس کے بعد استاد مراد سے ملنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس کی صورت سے گھن آتی تھی، لیکن استاد مجھے آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ جب میں معمول کے مطابق آستانے پر نہیں گیا، تو وہ خود گھر آ گیا اور میرے اوپر تنی چادر کھینچ کر مجھے اٹھا دیا۔ میں نے اس کی شکل دیکھتے ہی منہ پھیر لیا تو وہ بڑے مشفقانہ انداز میں میرے پاس بیٹھ گیا۔ اسکے کپڑوں سے وہی مشک کی مانوس سی خوشبو آ رہی تھی۔

"میرا یار ہم سے ناراض ہو گیا ہے۔" استاد مراد میرے سر کے بال سہلانے لگا، تو میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا :

"استاد مجھے تنگ نہ کر".....

"کیوں میرے یار، کیا ہوا ہے۔ بڑا موڈ خراب ہے، کچھ پتہ بھی تو چلے آخر ہوا کیا ہے؟" استاد مراد بھولپن سے بولا۔

"تجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ سے ناراض کیوں ہوں....." میں نے اس کی طرف چہرہ کیا تو اس کی طاغوتی آنکھوں میں جاں لیوا چمک اور لبوں پر محبت پاش مسکراہٹ تھی۔

"نہیں..... مجھے نہیں معلوم کہ تو کیوں ناراض ہے۔" استاد مراد مسکراتے ہوئے بولا۔

"استاد جھوٹ تو نہ بول۔" میں نے تلخ انداز میں کہا۔ "ایک تو اتنے غلیظ کام کرتے ہو اور اوپر سے جھوٹ بھی بولتے ہو۔ تم جیسے سنیاسی اور بزرگ شخص کو جھوٹ بولنے سے پہلے سو بار سوچنا چاہیے۔"

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔" استاد مراد میری تلخ نوائی پر سنجیدہ ہو گیا۔ "میں جانتا ہوں کہ تو کیوں ناراض ہے، مگر میرے یار تجھے نہیں معلوم کہ عملیات کی پراسرار دنیا میں عاملین کو کب کون سا روپ اختیار کرنا پڑتا ہے اور اسے کس عمل کی کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے؟"

"بس بس اب وضاحتیں پیش نہ کرو..... میں جو نہیں جانتا، اس کے بارے میں دریافت بھی نہیں کرنا چاہتا۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تم لوگ پورے ڈھونگی ہو اور صرف نام کے مسلمان ہو..... تم لوگوں میں ایک بھی شرعی کام نظر نہیں آتا۔"

سچائی میں گندھی یہ بات استاد مراد کو بہت بری لگی۔ اس کی بھنویں تن گئیں اور اس کے اندر جوار بھاٹا شروع ہو گیا۔ وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مٹھیاں بھینچ کر چہل قدمی کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری بات برداشت کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر سہلاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا "تو سچ کہتا ہے، مگر اس سچ کو تسلیم کرنا بہت مشکل کام ہے، ناگی یار..... بہر حال سچ تو سچ ہی رہے گا۔"

"تو پھر یہ کام کیوں کرتے ہو.....؟ میاں جی یہی کہتے ہیں کہ وہ کالا علم نہیں کرتے اور تم بھی۔ خدا کیلئے مجھے بتاؤ کہ تم دونوں مجھے گمراہ کیوں کر رہے ہو۔ ایک طرف تم لوگ نوری علم سے استفادہ کرتے ہو اور دوسری طرف یہ نجس، بدبودار اور مکروہ اشیاء کا استعمال۔ کیا یہ سب نوری علوم میں جائز ہے۔ کیا کتا، بلی، الو جیسے ناپاک جانوروں، پرندوں کا خون اور ان کے گوشت اور ہڈیوں کا استعمال نوری علم کا حصہ ہیں۔ مجھے بتاؤ، استاد مراد کیا اسلام میں یہ سب جائز ہے۔" میں قدرے چیخ کر دریافت کرنے لگا تو استاد مراد نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا:

"ناگی یار بس کرو۔"

"نہیں مجھے اس بات پر قائل کرو کہ یہ سب جائز ہے۔ خدا کی قسم! اگر اسلام ان مکروہ اشیاء کو اس طرح استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے، تو میں آج اور اسی وقت تمہارے ساتھ چلے، چوکیاں، مراقبے اور وظیفے پڑھنے کو تیار ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"میری بات ذرا ٹھنڈے دل سے سنو۔" استاد مراد کا رویہ بدستور نرم تھا۔ اسلام کی رو سے ہمارا یہ سارا دھندا ہی ناجائز ہے۔ رہا یہ سوال کہ ان علوم میں جو اشیاء استعمال ہوتی ہیں ان کی حیثیت کیا ہے تو سنو! ہمیں ہر عمل کے دوران اس کا مخصوص صدقہ دینا ہوتا ہے۔ اگر ہم ان نجس اشیاء کا استعمال نہ کریں تو عمل پورا نہیں ہو پاتا اور الٹا عامل کو نقصان ہوتا ہے۔"

"اس کے باوجود تم لوگ مجھے اس طرف لانا چاہتے ہو۔" میں نے کہا۔

"دیکھو، اب میں تم پر دباؤ نہیں ڈالوں گا کہ تم لازماً یہ کام سیکھو، مگر ایک بات یاد رکھنا کہ یہ سب تمہارے مقدر میں لکھا گیا ہے۔ اب تم یہ سوال کرو گے، کہ مجھے تمہارے مقدر میں لکھے مستقبل کے بارے میں کیسے معلوم ہوا تو تو یہ بھی سن لو، ہمیں یہ سب کچھ ہمارا حساب بتاتا ہے۔ تمہارے ہاتھوں کی لکیروں اور زائچے میں اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ تمہارا برج، ستارہ یہ بتاتا ہے کہ تم پیدا ہی مخفی علوم کیلئے ہوئے ہو..... یاد رکھو ہر شخص پر اسرار علوم نہیں سیکھ سکتا، صرف وہی یہ کام سیکھ سکتا ہے جس کے اندر یہ جوہر موجود ہو اور تمہارے اندر یہ جوہر بدرجہ اتم موجود ہے....." استاد مراد خاصی دیر تک مجھے پر اسرار علوم پر لیکچر دیتا رہا۔ میرا غصہ اور تلخی آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی۔

اس نے کہا "تمہیں کیا معلوم کہ اس پیشے میں کون لوگ آتے ہیں اور ان کی کیا مجبوریاں ہوتی ہیں"۔ آخر میں استاد مراد نے ہنس کر مجھ سے دریافت کیا "کیا تو اب بھی مجھ سے ناراض ہے۔"

"استاد بھلا تجھ سے کوئی ناراض ہو سکتا ہے!" میں نے منافقانہ طرز گفتگو اختیار کی۔ "مگر استاد تو اتنے دن غائب کہاں رہا اور رات کو تجھے کیا ہو گیا تھا؟"

"میں ایک بہت بڑے چلے میں مصروف تھا، لیکن ٹھہر و پہلے اس چلے کا پس منظر سن لو۔" استاد مراد چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "تجھے معلوم ہی ہے کہ میرا تعلق ایران سے ہے، مگر شاید تجھے یہ علم نہیں کہ میں ایران میں کیا کرتا ہوں۔ میں دراصل سبزہ وار کا رہنے والا ہوں۔ بچپن ہی سے میرا رجحان پر اسرار علوم سیکھنے کی طرف تھا۔ میرا باپ درمیانے درجے کا عامل تھا اور پہلوی خاندان کا شاہی نجومی کہلاتا تھا، لیکن چند پیش گوئیاں غلط ثابت ہونے پر شاہ ایران کے باپ نے اسے قتل کرا دیا اور میری ماں بڑی مشکل سے جان بچا کر پاکستان آئی۔ میری عمر اس وقت دس سال تھی۔

اس نے ایران سے چلتے وقت یہ قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے بچے یعنی مجھے بہت بڑا عامل بنائے گی اور رضا شاہ خاندان سے اپنے شوہر کے خون کا بدلہ لے گی، لہٰذا میری ماں نے میری تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ مجھے لے کر بھارت بھی گئی، ایک بار اس کی ملاقات لاہور میں تمہارے دادا سے ہو گئی اور اس نے مجھے ان کے قدموں میں بٹھا دیا، لیکن ہمارے حالات کچھ ایسے بنے کہ ہم زیادہ دیر تک لاہور نہ رہ سکے۔ چند برسوں بعد میری ماں کا انتقال ہو گیا اور مرنے سے پہلے اس نے مجھے تمہارے دادا سے ملنے کیلئے کہا تھا۔ میں یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ تمہارے دادا بھی وفات پا چکے ہیں اور میاں جی ان کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ میاں جی نے میری بپتا سنی اور مجھے سینے سے لگا کر کہا کہ آج سے تم میرے بھائی ہو۔ تمہارے باپ نے عملیات سکھانے کیلئے مجھ پر بہت محنت کی اور مجھے عملیات میں ناقابل تسخیر بنا دیا۔ کچھ علوم میں نے بھارت میں ہندو اور عیسائی عاملوں سے سیکھے تھے، لہٰذا میں نے وہ عمل میاں جی کو بھی سکھا دیے۔

عملیات میں مہارت کے بعد میں ایران چلا گیا اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ شاہی خاندان تک رسائی کیلئے راستے تلاش کرنے لگا اور کسی طرح رضا شاہ پہلوی کی دوسری مطلقہ ملکہ ثریا اسفندیار تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ثریا اسفندیار اٹھارہ سال کی تھی جب اس کی شادی تیس سالہ رضا شاہ سے ہوئی۔ سبز آنکھوں اور سیاہ بالوں والی دلربا حسینہ کی رگوں میں ایرانی اور جرمنی خون دوڑ رہا تھا، مگر وہ پیدائشی بیمار تھی۔ اسپر ستاروں کی نحوست اور نظر بد کے اثرات تھے۔ رضا شاہ اپنے باپ کی طرح بڑے فیصلوں سے پہلے نجومیوں اور عاملوں سے نیک ساعتوں اور نتائج کا حساب کراتا تھا، لہٰذا اس نے ثریا اسفندیار سے شادی کیلئے مہورت نکلوایا۔ نجومیوں نے 12 فروری 1957ء کو شادی کی اجازت دی اور کہا کہ یہ شادی بہت خوشگوار رہے گی۔

یوں ثریا ملکہ ایران بن گئی، مگر وہ اس روز شب عروسی کے قابل نہیں تھی، وہ بخار میں مبتلا تھی اور عروسی جوڑے کے نیچے بھی اس نے اونی لباس پہنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اور عاملین اس کی بیماری کا سبب نہ جان سکے..... اور شاہ سے کہا کہ ثریا بالکل ٹھیک ہے، لہٰذا رضا شاہ کی ہوس طبع نے ثریا کو مزید بیمار کر دیا۔ شاہ کو اپنا ولی عہد چاہیے تھا۔ اس سے پہلے وہ مصر کے شاہ کی بہن فوزیہ سے شادی کر کے اسے بھی طلاق دے چکا تھا جس سے اس کی بیٹی شہناز تھی۔ ثریا کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تو شاہ نے مارچ 1958ء میں یہ کہہ کر اسے طلاق دے دی کہ وہ بانجھ ہے۔ شاہ، اس کی بہنوں اور ماں نے ثریا اسفندیار کی نسوانیت اور وقار کو بے حد پامال کیا اور وہ مزید بیمار ہو گئی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ رضا شاہ پہلوی کو کبھی معاف نہیں کرے گی..... مجھے ان حالات کا علم ہوا تو میں ثریا اسفندیار تک پہنچ گیا اور عملیات کی طاقت و علوم کے ذریعے اسے باور کروایا کہ میں اس کے بہت سے غم دور کر سکتا ہوں، لہٰذا وہ میرا اعتبار کرنے لگی۔ شاہی محل میں اس کے کچھ بہی خواہ بھی تھے اس نے مجھے ان سے ملوایا اور پھر میں شاہی خاندان میں نفوذ کر گیا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب شاہ ایران نے مجھے اپنے مقرب عاملین کی صف میں شامل کر کے تجریش کی پہاڑیوں میں میرا مسکن تعمیر کروایا۔

تجریش کی برف پوش پہاڑیاں نامی گرامی عاملوں کی آماجگاہ ہیں۔ وہاں ایرانی، بھارتی اور افریقی عاملین شاہ ایران کی طویل العمری اور عنان اقتدار پر مضبوطی کیلئے عملیات کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ پہاڑیاں شاہ کے محل کی بائیں جانب ہیں۔ شاہ اور اس کی ماں یہ سمجھتی ہے کہ تجریش کے عامل و جادو گر وہاں بیٹھ کر ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں جب عاملوں کے قبیلے میں شامل ہوا تو میں نے اپنے عزائم کسی پر کھلنے نہیں دیئے اور اپنے کام میں منہمک رہا۔

میری بہت سی پیش گوئیاں اور عمل درست ثابت ہوئے، لہٰذا جلد ہی میں نے اپنا مقام بنا لیا جس سے پرانے عامل مجھ سے حسد کرنے لگے اور یوں میں جو شاہ ایران سے انتقام لینے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا پہلے مخالف عاملوں کو ختم کرنے پر جت گیا۔ مجھے تجریش کے کالے عاملوں کو کمزور کرنے کیلئے بہت سے امتحانوں اور عذابوں سے گزرنا پڑا اور اس کیلئے کالے علم کی انتہا تک بھی جانا پڑا۔ اگرچہ اب ان عاملوں کے ساتھ میری جنگ اختتام کو پہنچ چکی ہے اور بہت سے مخالف ختم بھی ہو چکے ہیں، مگر میری اپنی مخفی طاقتیں بھی زائل ہو رہی ہیں۔ اب کی بار جب میں یہاں آیا تو میاں جی نے مجھے از سر نو مخفی طاقتیں حاصل کرنے کیلئے کچھ نئے گر سکھائے ہیں۔ پچھلی رات تم نے آستانے میں جو کچھ دیکھا ہے وہ انہی علوم کا حصہ ہیں۔

میں نے تین روز تک ایک عیسائی عامل کی قبر میں دفن رہ کر چلہ کاٹا ہے جس کے باعث میرے اعصاب و ذہن پر اثر پڑا ہے۔ میرے یار! اگر میں حرام جانوروں کی چربی اور خون سے بنے تیل کی مالش نہ کرتا تو میرے اعصاب کمزور ہو جاتے اور اگر میں شبھ ساعتوں میں تیار کیا ہوا محلول نہ پیتا تو کالی قوتیں میرے بدن سے اپنی توانائیاں نکال لیتیں۔ میں جن طاقتوں کے حصول کے لئے یہاں آیا تھا وہ مجھے مل چکی ہیں' بس ایک آخری مرحلہ باقی ہے اور اسے طے کرنے کے لئے مجھے سندھ کے صحراؤں میں جانا ہے۔ وہاں ہر سال کالے علم کے ماہروں کا اجلاس ہوتا ہے اور سارے عامل کالی طاقتوں کی آشیر باد لینے کے لئے مخصوص جاپ کرتے ہیں۔ اگر مجھے ان جاپوں میں کامیابی مل گئی' تو میری زائل شدہ کالی طاقتیں از سر نو عود آئیں گی اور میں تجریش میں شاہ ایران کے رہے سہے ہمدرد عاملوں کو جہنم واصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

استاد مراد کی داستان سن کر میں بھونچکا رہ گیا اور مجھے کالے علوم کی خرافات سے آگاہی کے بعد مزید نفرت ہونے لگی کہ سیاہ کاروں کی یہ کیسی کالی اور مہیب دنیا ہے جس کو اختیار کرنے والا مسلمان..... مسلمان نہیں رہتا بلکہ کافروں سے بھی دس قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔

"استاد تو یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔" میں نے کہا" تو ایران جانے کے بجائے پاکستان میں رہ جا۔"

"نہیں میرے یار! اب ایسا نہیں ہو سکتا۔" استاد مراد کی طاغوتی آنکھوں میں انتقام کے شعلے بھڑکنے لگے۔ میری زندگی کا واحد مقصد باپ کے خون کے بدلہ لینا ہے۔" یہ کہہ کر استاد مراد اٹھا اور بولا" جب تیرا دماغ درست ہو جائے تو آستانے پر آجانا۔"

استاد کے جانے کے بعد میں گھنٹوں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں اس کی کہانی میں الجھ کر رہ گیا اور اس سے ملنے آستانے پر نہیں گیا۔

جادو کی گڑیا نے مجھے ڈس لیا

مجھے رات بھر سے کھجلی ہو رہی تھی اور دل بار بار اکسا رہا تھا کہ ناگی ایک بار قبرستان جا کر اس گڑیا کو تو دیکھ جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا ہے۔ صبح اماں نے مجھے فجر کی نماز کے لئے اٹھایا تو میں نماز پڑھنے کے بعد سیدھا قبرستان چلا گیا اور گڑھا کھود کر گڑیا نکالنے لگا۔ مٹی نرم تھی' لہذا میں ہاتھوں کی مدد سے مٹی پرے ہٹانے لگا کہ یکایک میرے بدن کو جھٹکا لگا اور انگلیوں میں سوئیاں چبھ گئیں جو گڑیا میں پیوست تھیں۔ میں بے اختیار چیخ اٹھا اور درد رفع کرنے کے لئے انگلیاں منہ میں ڈال کر چوسنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے گھاس پر پڑی ایک لکڑی اٹھائی اور اس کی مدد سے گڑیا کو باہر نکال لیا۔ گڑیا ابھی تک ویسی کی ویسی تھی اور اس میں سر مو تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اگر واقعی یہ عمل زدہ گڑیا ہوئی تو عملیات کے نتیجے میں اب تک اس میں کوئی حیرت انگیز تبدیلی آ چکی ہو گی' مگر گڑیا کو جوں کا توں دیکھ کر مجھے عملیات کے واہیات پن اور وہم پرستی پر ہنسی آ گئی۔ میں نے گڑیا کو دوبارہ دفن نہ کیا اور ایسے ہی گڑھے میں پھینک دیا۔ میں گھر واپس آیا' ناشتہ کیا اور کالج چلا گیا۔ پہلا پیریڈ ختم ہوا' تو میرے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں چبھن ہونے لگی۔ میں نے انگلیاں دیکھیں' تو انگشت شہادت اور چھنگلی کی آخری پوروں پر سرخ و کالے دانے نظر آئے۔ میں حیران ہوا کہ یہ دانے کیوں نکل آئے ہیں۔

میرا ذہن اس طرف بالکل نہ گیا کہ گڑیا نکالتے وقت میری انگلیوں پر سوئیاں چبھی تھیں۔ درد آہستہ آہستہ بڑھنے لگا اور دونوں انگلیاں متورم ہونے لگیں۔ بہت جلد یہ چبھن میرے پورے بدن میں سرایت کر گئی اور میں خارش کرنے پر مجبور ہو گیا۔ جوں جوں خارش کرتا اس کی طلب اور بڑھ جاتی اور میں ناخنوں کی مدد سے خارش کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں میرا پورا جسم انہی کالے اور سرخ دانوں سے بھر گیا۔ میری حالت دیکھ کر کلاس روم میں بے چینی دوڑ گئی اور لیکچرار صاحب بھی لیکچر چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں صرف پانچ دس منٹوں ہی میں اس زبردست اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ حلق و زبان اور ہونٹ سوکھ گئے' کانوں اور آنکھوں سے دھواں سا اٹھنے لگا اور دل بیٹھتا محسوس ہوا۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ یکایک مجھے کیا ہو گیا ہے۔ لیکچرار صاحب اور میرے کلاس فیلوز نے جلدی سے مجھے میو اسپتال پہنچایا اور میرے گھر والوں کو اطلاع کر دی۔ میاں جی اور استاد مراد دوڑے ہوئے آئے۔ میری حالت غیر ہو گئی تھی اور ڈاکٹر بھرپور طبّی امداد دے رہے تھے' لیکن ان کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ کونسی بیماری ہے جو لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی ہے' البتہ ان کی متفقہ رائے تھی کہ اس نے کوئی ایسا زہر کھا لیا ہے جو اس کے پورے بدن میں سرایت کر گیا ہے۔ میاں جی اور استاد مراد نے میری یہ حالت دیکھی تو دونوں کا ماتھا ٹھنکا۔ میں نیم مردہ ان کی طرف دیکھنے لگا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مسلسل خارش کے باعث دانوں سے پیپ بہنے لگی تھی اور عجیب طرح کی بو آنا شروع ہو گئی۔ میرے گرد موجود ڈاکٹر اور نرسیں کام کے بہانے بنا کر کھسک گئے اور خاکروبوں سے کہا کہ اس کا بستر وارڈ سے نکال کر برآمدے میں لگا دو..... انہیں خدشہ تھا کہ اس بیماری کے مہلک جراثیم کسی اچھوتی مرض کا باعث نہ بن جائیں اور باقی مریض یا عملہ بھی اس مرض میں مبتلا نہ ہو جائے۔

خاکروب میرا بستر لے کر برآمدے میں پہنچے تو استاد مراد نے چند نوٹ ان کی مٹھیوں میں دیئے اور کہا "تم لوگ تھوڑی دیر رکنا' میں تانگہ لے کر آتا ہوں۔"

میاں جی نے استاد مراد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا "میاں جی! یہ مرض اسپتال والوں کے بس کا نہیں' اسے جلد سے جلد آستانے پر لے کر جانا پڑے گا۔" یہ کہہ کر استاد مراد تانگہ لینے بھاگا اور میاں جی میرے سرہانے کھڑے ہو گئے۔ میں نے نیم جاں نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"میاں جی....." میں بمشکل بول پایا۔

"میرے بچے تجھے کیا ہو گیا ہے....." میاں جی کے اندر کا باپ قدرے روہانسا ہو کر مجھے چھونے پر مجبور ہو گیا۔ اللہ نے ماں باپ کے رشتے بھی خوب بنائے ہیں جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کی ہر تکلیف پر بلبلا اٹھتے ہیں۔ ایک وہ مسیحا تھے جنہوں نے میرا بستر وارڈ سے باہر نکال دیا اور ایک یہ میرا باپ تھا جس نے میرے رستے ہوئے دانوں سے بھرے ماتھے پر بوسہ دے کر اپنی محبت و شفقت کی مہر ثبت کی تھی۔ "بول میرے بچے تو نے کیا کھایا ہے۔"

میاں جی مجھے دلاسہ دینے لگے تو میں نے بولنے کی ایک بار پھر کوشش کی' مگر مجھے کچھ یاد نہیں آیا کہ میں نے کیا کھایا ہے جس کی وجہ سے یہ اذیت ناک اور غلیظ مرض میرے پیش پڑ گیا۔

"میاں جی' مجھے کچھ یاد نہیں" میرے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔اسی دوران استاد مراد تانگہ لے آیا۔اس نے خاکروبوں کی مدد سے مجھے تانگے میں ڈالا اور تیز رفتاری سے کچے راوی پر پہنچنے کی ہدایت کی۔

گھر والوں کو بھی میری بیماری کی خبر مل گئی تھی۔جونہی تانگہ کٹڑی میں رکا' بچے' جوان اور عورتیں دوڑتے ہوئے آئے اور مجھے دیکھ کر چیخنے لگے۔میری اماں تو مجھ سے والہانہ لپٹ گئیں۔میاں جی نے بڑی مشکل سے انہیں پرے ہٹایا اور مجھے آستانے کے اندر لے گئے۔

استاد مراد اس وقت کسی ماہر استاد کی طرح حرکت میں آگیا تھا۔اس نے جلدی سے کوئلوں سے بھری ایک بڑی انگیٹھی میں آگ سلگائی اور میاں جی سے دروازہ بند کرنے کے لئے کہا۔اس نے آستانے میں رکھی بند بوریوں میں سے کچھ خرافات نکالیں اور انہیں سلگتی انگیٹھی میں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔اس نے مجھے چٹائی پر الٹے رخ لٹا کر میری قمیص اتار دی اور شلوار اوپر کھینچ کر پنڈلیاں اور آدھی رانیں ننگی کر دیں۔

استاد مراد نے دھونی تیار کرتے ہی میاں جی کو اشارہ کیا اور انہوں نے موٹے منکوں والی کالی تسبیح کے دانے گھمانے شروع کر دیئے۔استاد مراد نے جیب سے ایک لوہے کی چھوٹی سی ڈبی نکالی اور اس میں سے چٹکی بھر سفوف نکال کر سلگتی انگیٹھی میں ڈالا تو حجرے میں سیاہی مائل دھواں گہری دھند کی طرح چھا گیا۔اس اثنا میں میاں جی تسبیح کا ایک دور ختم کر چکے تھے۔انہوں نے دھوئیں کی دبیز چادر میں لوبان کی دھونی تیار کی تو کمرہ مسحور کن خوشبویات سے معطر ہو گیا۔میں سر اٹھا کر نیم جاں حالت میں یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔

استاد مراد نے اب ایک تھیلے میں سے مٹھی بھر سفوف نکالا' اسے سلگتی انگیٹھی پر سات بار گھمایا' پھر اس میں کچھ پڑھ کر پھونکیں ماریں اور سفوف میری پشت پر گرا کر اسے مالش کے انداز میں پھیلانے لگا۔رستے دانوں پر مرچوں کی طرح جلن ہونے لگی اور کچھ ہی لمحوں بعد سفوف نے آگ سی سلگا دی۔میں نے تکلیف کی شدت سے چیخ ماری تو استاد مراد نے کونے میں رکھا گھنگرو والا ڈنڈا اٹھایا اور زہر خند لہجے میں بولا:

"خبردار اب اگر تو نے ہلنے کی جرأت کی' تو ڈنڈے سے تیری کھوپڑی توڑ دوں گا۔"

استاد کے لہجے میں درندگی عیاں تھی اور میری پشت پر آگ تیز ہوتی جا رہی تھی۔خوشبویات سے معطر فضا میں اب تعفن زدہ بو بھی پھیل رہی تھی۔یہ گوشت جلنے کی بو تھی۔میرا دم گھٹنے لگا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔میں تکلیف کی شدت سے چیخا' تو استاد مراد نے ایک کوزے میں سیال بھر کر میرے لبوں سے لگا دیا۔میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چلا تھا اور پیاس کے مارے حلق بھی سوکھ چکا تھا' لہذا میں نے ناگوار سیال سے بھرا کوزہ خالی کر دیا۔وہ سیال جیسے ابلتا ہوا کوئی لیس دار مادہ تھا جو حلق سے نیچے اترتے ہی جہاں جہاں سے گزرا ایک گرم و تلخ تاثیر پیدا کرتا گیا۔یکایک میری طبعیت اور بگڑ گئی۔میرا دماغ چکرانے لگا اور حجرے کے در و دیوار جھولتے دکھائی دینے لگے۔استاد مراد کی وحشی اور طاغوتی نظریں اب مجھ پر گڑ گئیں۔اس نے انگشت شہادت میرے ماتھے پر رکھی اور دباؤ ڈالنے لگا۔میں ماہی بے آب کی طرح مچلنے لگا اور وہ آگ جو سفوف سے سلگائی تھی' دھواں دھوں سی ہونے لگی۔اس کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا جیسے میری پور پور سے کوئی چیز سرک سرک کر حلق کی طرف آ رہی ہے۔میں درد زہ میں مبتلا عورت کی طرح چیخ و پکار کرنے لگا۔میرے بدن میں اکڑاؤ سا پیدا ہو گیا۔استاد نے انگلی کا دباؤ اور بڑھا دیا' میرے بدن سے اٹھنے والا دھواں اور گہرا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی میرا انگ انگ دکھنے لگا۔مجھے گماں ہو رہا تھا جیسے میرے اندر سے کوئی چیز اپنی جڑیں باہر کھینچ رہی ہے' بالکل ایسے جیسے کوئی کہن سالہ درخت زمین پر گرتا ہے' تو زمین میں دھنسی اس کی جڑیں ٹوٹ پھوٹ کر باہر نکل آتی ہیں۔میری تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تھی' لیکن شاید یہ میاں جی اور استاد مراد کے عملیات اور سیال مادے کا اثر تھا کہ میں بے ہوش نہیں ہوا اور اپنے ساتھ رونما ہونے والے پراسرار عمل کو دیکھتا رہا تھا۔

میں خاصی دیر تک تڑپتے' اچھلتے اور ذبح ہوتے جانور کی طرح ڈکراتا رہا۔میرے بدن سے اٹھنے والا دھواں میرے اوپر چھتر کی طرح اکٹھا ہو رہا تھا۔تھوڑی دیر بعد مجھے ابکائی آئی اور میں کسی دہشت زدہ درندے کی طرح اچھلا اور قے کر دی۔میرے اندر سے گوشت کے چھوٹے چھوٹے لوتھڑے نکلے۔ان کی رنگت سیاہی مائل تھی۔قے آنے کے بعد مجھے سکون سا محسوس ہوا' مگر گوشت کے لوتھڑوں سے ناقابل برداشت بو آنے لگی۔استاد مراد نے نہایت پھرتی سے وہ لوتھڑے اپنے ہاتھوں میں لئے اور سلگتی انگیٹھی میں ڈال دیئے۔یکایک حجرے میں چیخ و پکار اور آہ زاریوں کا حشر برپا ہو گیا۔ایک طوفان قیامت ساعود آیا اور کڑکتی بجلیوں میں سیاہ رات کا طلسم نمودار ہو گیا۔

"آگیا' آگیا..... میاں جی' ذرا سنبھل کر.....آج اس حرام زادے کو نہیں چھوڑوں گا۔" استاد مراد گھنگرو والا ڈنڈا ہاتھ میں لئے درندے کی طرح غرانے لگا۔

میاں جی جھٹ میرے پاس آ گئے۔انہوں نے میرا ہاتھ زور سے تھام لیا اور تیز لہجے میں بولے "مراد تو اس کی فکر نہ کر تا آج اسے سلامت نہ جانے دینا".....

میں اس طلسمی اور پراسرار ماحول سے لرزنے لگا' مگر میاں جی نے مجھے حوصلہ دیا۔

استاد مراد نے انگیٹھی کے گرد حصار قائم کر دیا اور پھر کچھ عملیات پڑھ کر پھونکنے لگا۔ چند لمحوں بعد ایک وحشیانہ قہقہہ گونجا اور دھپ کے ساتھ کوئی وجود حجرے میں آ کودا۔ میرے سامنے جہاں انگیٹھی سلگ رہی تھی' اس کے عین اوپر سیاہ دھوئیں میں وہ انگارہ آنکھیں چمکنے لگیں اور پھر کسی سیاہ عفونت کے نقش ابھرنے لگے۔

"مراد آج میں تیرا ناس مار دوں گا۔ تو آج بھی نامراد ہی رہے گا....." سیاہ عفونت غرایا تو اس کی سانپ نما زبان لبوں کو چاٹنے لگی۔

"تو نے میرے آقا کو مارنے کے لئے جو چلے کاٹے ہیں' ان سب کو غارت کر دوں گا۔ تجھے اپنی شکتی پر مان ہے تو سن' میرے آقا نے مجھے تیری شکتی کا توڑ دیا ہے..... تو اب کبھی بھی تجریش نہیں آ سکے گا۔" اس کے ساتھ ہی سیاہ عفونت قہقہے لگانے لگا۔

استاد مراد نے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا لہرایا اور کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا پھر ڈنڈا برق رفتاری سے سیاہ عفونت کے سر پر دے مارا' تو وہ لرزہ خیز چیخ کے ساتھ تڑپ اٹھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا وجود سلگتی انگیٹھی میں غائب ہو گیا۔

"اٹھ حرامزادے.....میں تیرے آقا کو اور تجھے آج ختم کر دوں گا۔"

استاد مراد نے عملیات پڑھ کر سیاہ عفونت کی طرف پھونک ماری تو جواباً سیاہ عفونت نے ایک اور چیخ ماری اور دوسرے ہی لمحے اس کی درندگی اور دہشت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی' وہ ملتجی انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔

"مراد تو بے شک بڑا عامل ہے۔ تو جانتا ہے کہ ہم اپنے آقا کے سیوک ہیں۔ مجھے میرے آقا نے جو کہا تھا وہ میں نے کر دیا۔ تجھے اپنے علم کا واسطہ ہے مجھے چھوڑ دے۔"

میں سیاہ عفونت کی لاچارگی دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا وحشیانہ جلال ایکدم کہاں گیا۔ غالباً استاد مراد نے اپنے علوم کی بدولت اسے کمزور اور بے بس کر دیا تھا تبھی تو وہ منمنانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"میں تجھے ایک شرط پر چھوڑ سکتا ہوں۔" استاد مراد نے غراتے ہوئے کہا۔

"میں تیری شرط ماننے کے لئے تیار ہوں۔ بس تو مجھے جلدی سے اس عذاب سے نجات دے دے۔" سیاہ عفونت کی سرخ انگارہ آنکھوں میں دہکتی چنگاریاں ماند پڑنے لگیں۔

"تو نے ہمارے اس لڑکے کے ساتھ کیا کیا ہے۔"

استاد مراد نے دریافت کیا۔

"اے عظیم عامل میں نے سات بیمار مردوں کے مسان اس کی رگوں میں اتارے ہیں۔" سیاہ عفونت بولا۔

"کیسے اتارے ہیں یہ مسان؟" استاد مراد غرایا۔

"میرے آقا کی ایک داسی نے پچھلی رات اس کی ماں کے روپ میں آ کر اسے عمل زدہ گڑیا دی تھی اور اسے کہا تھا کہ اسے قبرستان میں جا کر دفن کر دو۔ اگلے روز ہم نے اسے اکسایا کہ یہ اس گڑیا کو دیکھنے جائے یہ وہاں گیا تو مسان کے زہر میں بھیگی سوئیاں اس کے ہاتھوں میں چبھ گئیں۔ اس نے انگلیاں منہ میں ڈال لیں۔ یوں مسان انگلیوں اور منہ کے ذریعے اس کے اندر داخل ہو گئے۔ اے مراد' اگر تم لوگ کچھ دیر کر دیتے تو یہ لڑکا جسے تم

ہمارے آقا کے خلاف ایک بڑا عامل بنانے کی تیاری کر رہے ہو' ہمیشہ کے لئے مجذوب بن جاتا۔ اس کی بیماری اسے مرنے نہ دیتی اور اس کا ذہن ختم ہو جاتا اور..... ''سیاہ عفونت ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس نے ایک زوردار چیخ ماری اور اس کی آنکھوں میں زندگی کی رمق واپس آنے لگی۔

اس سے قبل کہ استاد مراد صورت حال کا اندازہ کر پاتا۔ سیاہ عفونت نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا ''مراد میرے آقا نے مجھے بچا لیا ہے۔ تجھے میں دیکھ لوں گا''۔

یہ کہہ کر سیاہ عفونت تاریکی میں غائب ہو گیا اور استاد مراد اور میاں جی ہاتھ مسلتے رہ گئے۔ استاد مراد نے بے بسی کے عالم میں ڈنڈا اپنی پنڈلی پر دے مارا اور گھنگرو ہذیانی انداز میں بجنے لگے۔

''مراد' دل چھوٹا نہ کر..... ہمت کر میرے یار۔'' میاں جی نے اسے دلاسہ دیا۔

''میاں جی! یہ کالی ناتھ شیرازی کا موکل تھا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہ کالا عامل میرے راستے کی سب سے بڑی دیوار ہے اور اسی کو گرانے کے لئے میں چلے کاٹنے یہاں آیا ہوں..... آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اس نے ہزاروں میل دور بیٹھ کر مجھ پر وار کیا اور اپنے موکل کو بھی بچا کر لے گیا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میاں جی..... اس نے مجھے بہت بڑا گھاؤ دیا ہے۔'' استاد اپنی ناکامی پر وحشی سا ہو گیا تھا۔

میں ماحول کی پراسراریت میں سہما ہوا لیٹا تھا کہ اچانک پھر میرے جسم میں جلن ہونے لگی۔ میں قدرے چیخ کر بولا ''میاں جی! مجھے پھر خارش ہو رہی ہے۔''

استاد نے مراد نے میری طرف دیکھا' اس کی شعلہ نما آنکھوں میں بے رحمی کے انگارے بھڑک رہے تھے۔

''میاں جی! کالی ناتھ شیرازی کا موکل اپنی راکھ اس کے بدن میں چھوڑ گیا ہے۔ جب تک اسے جلا کر راکھ نہیں کیا جائے گا' اس کو چین نہیں ملے گا۔ زہریلے خبیث بھوتوں کی یہ راکھ اس کا تن من جلاتی رہے گی۔''

''مراد' اس کا ایک توڑ میرے پاس ہے۔'' میاں جی صبر و استقامت سے بولے'' لیکن اس کے لئے تمہیں کچھ کرنا ہو گا۔''

''آپ حکم کریں میاں جی!'' استاد مراد بولا۔''میں آپ کی خوشنودی کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔''

''مراد' اس جمعرات کو سندھ کے صحراؤں میں کالے عاملوں کا میلہ ہے جہاں بھارت اور پاکستان کے بڑے کالے عامل جمع ہوں گے' تو اسے وہاں لے جا اور میلہ لگانے والے عامل گرو جی مہاراج کو بتانا کہ ناگی' باوا جی نہال شاہ کا پڑپوتا ہے..... باقی وہ خود سمجھ جائے گا..... گرو جی مہاراج سات مردوں کے مسان کا توڑ کر سکتے ہیں''۔

میں بے بسی سے اپنی تقدیر کے فیصلے سن رہا تھا۔ میاں جی کہہ رہے تھے''ناگی کو اب عملیات سیکھنے ہوں گی مراد..... اگر اس نے اب بھی بغاوت کی تو ہمارے خاندانی دشمن عامل اور تمہارے دشمن اس کی جان لے کر ہی ٹلیں گے۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ باوا جی نہال شاہ کی اولاد میں سب سے بڑا لڑکا ہی عامل بننے کے لائق ہوتا ہے۔ ناگی کی رگوں میں اس کے بزرگوں کی میراث گردش کر رہی ہے۔ اسے تو اپنے ساتھ لے جانا' جمعرات میں صرف چند روز رہ گئے ہیں''

میاں جی نے میری بیماری کے تدارک کا علاج تجویز کر دیا اور استاد مراد نے دو روز اپنی تیاریوں میں گزار دیئے' لیکن میرے لئے یہ دو دن روز قیامت کی طرح تھے۔

سندھ میں کالے عاملوں کی مجلس

گہری اور پر ہول سیاہ رات تھی جب استاد مراد اور میں سندھ کے اس صحرائی گوٹھ میں پہنچے جہاں کالے عاملوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ ہم دو دن کے لگاتار سفر کے بعد پہنچے تھے۔ میں سارے رستے تکلیف سے کراہتا، روتا اور تڑپتا رہا تھا۔ استاد مراد کے سارے عمل بے بس ہو گئے اور مجھے سکون کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آیا تھا۔ میری حالت دیکھ کر استاد مراد مجھے حوصلہ قائم رکھنے کی تلقین کرتا تو میں جواب میں چلا چلا کر اسے اپنی اذیت کے بارے میں بتاتا۔ کئی بار اس کی طاغوتی آنکھوں میں پدرانہ شفقت کا جذبہ امڈ آیا اور آنکھیں میری حالت پر بھر آتیں۔

ہم ریل گاڑی میں حیدر آباد تک آئے تھے۔ مسافر میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے، لیکن یہ استاد مراد ہی کا حوصلہ تھا کہ ایک طرف وہ مجھے دلاسے دیتا اور دوسری طرف مسافروں کو مطمئن کر دیتا۔ میں تو نیم بے ہوش تھا اور مجھے ارد گرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ بس یہ تکلیف دہ احساس تھا کہ استاد مرد سگے باپ کی طرح مجھے سینے سے لپٹائے سارا دن اونٹوں پر سفر کرتا رہا تھا اور گہری رات کو جب ہم گوٹھ پہنچے تو مجھے قدرے ہوش آ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ گوٹھ میں کالے عاملوں کا ٹھٹھ ہو گا اور شور شرابہ برپا ہو گا، لیکن وہاں سکوت چھایا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوا اور نیم دلی سے استاد مراد سے پوچھا

"استاد کہیں غلط جگہ تو نہیں پہنچ گئے.....؟"

"میاں جی نے جو نشانیاں بتائی تھیں اس کے مطابق تو یہی گوٹھ ہے۔" استاد مراد بولا

وہ نشانیاں کیا تھیں، استاد مراد نے مجھے ان کے بارے میں نہیں بتایا۔ سیاہ و گہری رات میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا مگر استاد مراد میرا ہاتھ پکڑ کر اندھے راستوں پر یوں چل رہا تھا جیسے راستے روشن ہوں۔ میں نے ایک دو بار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سیاہ و تاریک رات میں ایک آدھ فٹ کے فاصلے سے مجھے استاد کا چہرہ دکھائی نہ دیا مگر اس کی طاغوتی آنکھیں قندیلوں کی طرح روشن تھیں۔ اس لمحے میں حیران بھی ہوا کہ استاد مراد کیا چیز ہے۔ اسے اگر پراسرار علوم پر اتنی دسترس ہے تو اپنی پراسرار قوتیں بروئے کار لاتے ہوئے میرے مرض پر قابو کیوں نہیں پایا..... اور پھر دو دن اور دو راتوں کی تکلیف دہ مسافتیں میرے لیے راحت سکون کا سفر کیوں ثابت نہیں ہوئیں، مگر میرے پاس اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں تھا۔

میں ڈرا سہما استاد مراد کی انگلی پکڑے ایک سحر زدہ موکل کی طرح ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور کبھی کبھی اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ لیتا۔ اسکی روشن طاغوتی آنکھوں میں آتش فشانوں کی سی بے چینی و اضطراب اور وحشت پیدا ہو رہی تھی۔ ہم خاصی دیر ایک سیدھے راستے پر چلتے رہے اور پھر مجھے محسوس ہوا جیسے ہم اونچائی چڑھ رہے ہیں۔ ارد گرد کے سارے مناظر رات کے سیاہ لبادے میں چھپے تھے اس لیے معلوم نہ ہو سکا کہ ہم کس جگہ پہنچ گئے تھے۔ ایک کوس فاصلہ طے کر چکے تو استاد مراد درندوں کی مانند غریا اور چلتے چلتے یکایک رک گیا۔ وہ لمبے لمبے سانس اندر کھینچنے لگا اور یوں لگا جیسے فضا میں کچھ سونگھ رہا ہے۔

"منزل آ گئی ہے....." استاد مراد جوش سے بولا اور پھر فضا کو سونگھتا ہوا مانوس سی بو کے منبع کی جانب چل پڑا۔ استاد مراد کو جو بو آ رہی تھی مجھے محسوس نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد استاد نے وہ جگہ تلاش کر لی جہاں سے وہ منحوس و مانوس بو نکل رہی تھی۔

"ناگی ہم پہنچ گئے ہیں۔ شکر کر کہ ابھی مجلس شروع نہیں ہوئی۔" استاد مراد نے کہا تو میں نے ایک بار پھر دیدے پھاڑ کر ارد گرد کی عمارت کا وجود تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔

استاد مراد اب زیر لب کچھ پڑھنے لگا۔ پھر اس نے مجھ پر پھونک ماری اور اپنے ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیے۔ اس نے ایک بار پھر کچھ پڑھا اور مجھے آنکھیں کھولنے کیلئے کہا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سامنے ایک حویلی ہے جس کا ایک بڑا سا لکڑی کا دروازہ ہے۔ اوپر ایک کالی مورتی نصب ہے جس کے سر پر ایک بڑا سا دیا روشن تھا۔

"استاد یہ میری نظر کا فریب ہے یا".....

"میں نے تیری نظروں کا حجاب اتار دیا ہے۔" استاد مراد نے کہا "رات کے وقت یہ عمارت نظر نہیں آتی۔، صرف وہی لوگ اسے دیکھ سکتے ہیں جن کے پاس کالا علم ہو جسے کوئی کالا عالم یہ عمارت دکھانا چاہے تو منتر پڑھ کر اس کی آنکھوں میں اسرار کے پردے دیکھنے کی قوت بھر دیتا ہے۔"

"استاد تیرے پاس اتنی قوت ہے پھر تو مجھے ادھر کیوں لے کر آیا ہے۔ تم ادھر ہی اپنی طاقتوں سے میرا علاج کر سکتے تھے۔" میں نے شکوہ کے انداز میں اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"ناگی! تجھے اس علم کی طاقتوں اور مجبوریوں کا علم نہیں۔ میرے پاس طاقت اور گیان کا جتنا علم ہے میں اس سے اتنا ہی کام لے سکتا ہوں۔ جو مرض تجھے لگا ہے تیرے میاں جی بھی اس کا علاج نہیں کر سکے، میں تو میاں جی کے پیر دھو کر پیتا ہوں۔ جب میاں جی بے بس ہیں تو میری لاچارگی اس سے بھی زیادہ ہے۔ تیرے مرض کا علاج جہاں ہو سکتا تھا میں تجھے وہاں لے آیا ہوں۔ اب آگے تیرا مقدر ہے، میرے یار۔"

استاد مراد نے مجھے سمجھایا "ناگی، ایک بات ذہن میں بٹھالے۔ یہاں جو کچھ بھی دیکھو اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا اور نہ ہی مجلس کے دوران کسی کو مخاطب کرنا۔ ان عاملوں کی اپنا دنیا اور قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ انہیں توڑنے کی کوشش نہ کرنا....." استاد مراد نے حویلی کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد کنڈی کھلی اور ایک کالے چوغے والی عورت ہاتھ میں دیا پکڑے باہر آئی۔ استاد مراد اسے دیکھتے ہی اجنبی زبان میں مخاطب ہوا تو عورت نے جھٹ سے دیا نیچے رکھ دیا اور اسے پرنام کیا، وہ پھر ہمیں اندر لے گئی۔

یہ پرانی طرز کی حویلی تھی۔ راہداریوں میں دیے روشن تھے۔ پوری حویلی پراسرار ماحول میں غرق تھی اور عجیب سی بو آرہی تھی۔ ہمارے قدموں کی چاپ سے راہداری گونج اٹھی۔ عورت ایک دروازے پر پہنچی اور استاد مراد کو مخاطب کرتے ہوئے بولی "سبز واری پوجا کاسے ہے۔ ٹھہرو، میں مہاراج کو تمہاری خبر کر دوں۔"

وہ اندر گئی، مگر دوسرے ہی لمحے باہر آگئی اور استاد مراد کے پاؤں چھو کر بولی "شما کرنا سبز واری مہاراج، میں نے تجھے روک کر پاپ کیا ہے، گوروجی مہاراج تمہارے منتظر ہیں۔"

میں استاد مراد کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔ ناگوار سی بو اور طاغوتی وابلیسی ماحول کے طلسم میں غرق کمرے میں تیرہ کالے عامل برہنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سیاہ جسموں پر کوئی لیسدار سیال چمک رہا تھا۔ ان کا گرو ہمیں دیکھتے ہی اٹھا اور استاد مراد کو سینے سے لگا کر بولا "تو نے بڑا انتظار کرایا ہے سبز واری۔"

استاد مراد اسے اپنی مجبوریاں اور مسائل بتانے لگا تو گوروجی مہاراج بولا

"ہمارے یار نے تمہارے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔ اگر پوجا کاسے نہ بیت رہا ہوتا تو میں تیرا انتظار کرتا۔"

استاد مراد نے مجھے آگے کیا اور گوروجی کے قریب کھڑا کر دیا۔ وہ ایک پر ہیبت، پر جلال شکل کا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ ناف تک لمبی گھنی ڈاڑھی اور وہ بھی برہنہ تھا۔ اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔ نشے اور قہر میں ڈوبی نظروں میں سحر انگیز طاقت تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور بولا "ہم جانتے ہیں تو باوا جی نہال شاہ کا پڑپوتا ہے، مگر ہے تو مورکھ..... ترے گنوں نے تجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔" گوروجی مہاراج نے استاد مراد سے کہا" تو جانتا ہے کہ تیرہ کے اجلاس میں کوئی اجنبی شرکت نہیں کر سکتا۔ لیکن ہم اپنے باوا جی کے اس پڑپوتے کی خاطر یہ اصول توڑ ڈالیں گے۔ اسے لے کر بیٹھ جا..... ہماری پوجا کاسے ہو رہا ہے۔"

استاد مراد مجھے ایک کونے میں لے کر بیٹھ گیا اور گورو ایک بڑے سے جبوترے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چبوترے کے دونوں طرف چھ چھ کالے عامل بیٹھے تھے۔ گوروجی کے سامنے تیرہ موم بتیاں روشن تھیں جن کی لو دیکھ کر مجھے عجیب سی وحشت ہونے لگی۔ ہر عامل کے سامنے انسانوں کی کھوپڑیاں اور ایک ایک پیالا رکھا تھا۔ گوروجی کے سامنے اونٹ کے کولہے کی ہڈی، سؤر کی چربی کا تیل، سیہہ کے تکلے، الو کا خون اور مختلف جانوروں کی کھوپڑیاں اور ہڈیاں رکھی تھیں۔ ان چیزوں کے درمیان ایک کالے رنگ کا بڑا سا پتیلا تھا۔ یہ سب اشیاء سفید لٹھے کی چادر پر رکھی تھیں۔ گوروجی کے پہلو میں ایک لمبا سا کالے دستے والا کرپان نما چھرا پڑا تھا۔

سب عامل گرو کی تقلید میں لمبے لمبے سانس لینے لگے، پھر ہاتھ جوڑ کر پتلے کو دیکھنے لگے۔ اس اثنا میں دور کہیں گھنٹیاں بجنے لگیں تو گورو جی مہاراج منتر جنتر پڑھنے لگا..... وہ خاصی دیر تک اشلوک نما منتر پڑھتا رہا۔ پھر اس نے پہلو سے چھرا اٹھایا اور اس کی نوک پتلے کے سینے میں گھونپ دی۔ ماحول میں شیطانی پراسراریت حلول کر گئی اور سب عامل چبوترے پر سر جھکا کر اونچی اونچی آواز میں کچھ پڑھنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گریہ زاری کر رہے ہوں۔ گرو نے چھرا پتلے کے سینے سے باہر نکالا تو یکدم کمرے میں مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ سنائی دی اور یوں لگا جیسے کوئی مخلوق کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ شور بتدریج بڑھنے لگا تو گرو اٹھ کر ناچنے لگا۔ اب اس نے اونٹ کے کولہے کی ہڈی اٹھائی اپنے سامنے رکھے پیالے میں سے کوئی سیال نکال کر اس پر انڈیلا اور ہڈی پاس کھڑے عاملوں کے سروں پر باری باری لہرانے لگا۔ پھر اس نے پتلے کو اٹھایا اور اسے ہڈی پر رکھ کر چھرے سے پتلے کی گردن کاٹ ڈالی، ایک دردناک، اذیت ناک آواز گونجی، یوں لگا جیسے کوئی انسان ذبح کر دیا گیا ہو۔ میں اس وقت حیرت زدہ رہ گیا جب پتلے کی گردن الگ ہوتے ہی خون ابل کر فوارے کی صورت میں عاملوں پر برسنے لگا۔ جونہی خون کے چھینٹے ان کے ننگے بدنوں پر ٹپکے، وہ والہانہ انداز میں اٹھے اور سرشاری و وحشیانہ انداز میں رقص کرنے لگے۔ کمرے میں ناقابل برداشت تعفن بڑھ گیا۔ عامل ناچتے ناچتے اپنے بدن نوچنے لگے تو گرو نے خون آلود چھرے سے ان کے بالوں کی لٹیں کاٹنی شروع کر دیں، پھر انہیں اکٹھا کر کے پتلے پر رکھا اور روشن موم بتی کی مدد سے انہیں آگ لگا دی۔ ایک شعلہ بھڑکا جو رفتہ رفتہ گہرے نارنجی دھویں میں بدل گیا اور بلند ہو کر کمرے کی چھت کو چھونے لگا۔

"اے ماتا تیرے سیوک، تیرے داس، تیری بھینٹ لے کر آئے ہیں، تو اسے قبول کر اور اپنی شکتی سے ہمارے دلوں کو مضبوط کر دے۔" گرو جی مہاراج ہذیانی انداز میں کھڑے ہو کر گڑگڑانے لگا پھر وہ دھویں کے سامنے جھک گیا۔ اس کی تقلید میں دوسرے عامل بھی جھک گئے اور کافی دیر تک ایسی ہی خرافات میں کھوئے رہے۔ بالآخر وہ بے سدھ ہو کر ہانپنے لگے۔ آخر میں گرو نے موم بتیاں انسانی کھوپڑیوں پر رکھیں اور چبوترے کے عقب میں ایستادہ کالی مورتی کے پاس پہنچا۔ مورتی کی سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی، آنکھوں کے دیدے بھی سرخ تھے۔ مورتی کی آنکھیں دیکھ کر مجھے استاد مراد کی آنکھیں یاد آ گئیں، میرے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

گرو، مورتی کے چرنوں میں بیٹھ گیا، اس نے موم بتی قدموں میں رکھی اور سجدے میں گر کر گریہ زاری کرنے لگا "اے ماں، تیرے سیوک تیری رکھشا کے سوالی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک پیالی اٹھائی اور اسے مورتی کے سر پر الٹا دیا۔ موم بتیوں کی روشنی میں پیالے کا سیال ابلتے لاوے کی طرح لگ رہا تھا۔ کالی اور خوفناک مورتی سیال میں لتھڑ گئی تو گرو جی مہاراج واپس چبوترے پر آ گیا۔ اس نے موم بتیاں ہٹا کر انسانی کھوپڑیاں سیدھی کیں اور پیالوں کا سیال کھوپڑیوں میں ڈال کر عاملوں کو دے دیا۔ ہر عامل بے تابی سے کھوپڑیوں سے غٹاغٹ سیال پینے لگا۔ ان کے سیال پینے سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کتا برتن سے پانی پیتے ہوئے نکالتا ہے۔

ایک گھنٹے تک مکروہ رسومات کا سلسلہ جاری رہا۔ استاد مراد بڑے غور سے رسومات دیکھ رہا تھا۔ کئی بار تو اس کے اندر کا درندہ غرایا بھی، مگر مجھے امید تھی کہ اس کا یہ درندہ اس کے قابو میں ہے، میں پہلی بار بے خوف ہو کر اس کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔

گرو نے آخر میں مجلس ختم کرنے کیلئے اختتامی منتر پڑھے اور پھر اس کے بعد باقی تمام عامل اپنا سامان اٹھا کر برہنہ حالت میں کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب کمرے میں صرف گرو جی مہاراج، استاد مراد اور میں ہی رہ گئے۔ گرو نے اشارہ کر کے استاد مراد کو بلایا اور خاصی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ استاد مراد نے پھر مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا "ناگی کپڑے اتار دو" .....

میں ہچکچایا تو استاد مراد بولا "یار تیرا علاج کرنے کیلئے یہ ضروری ہے۔" بات ماننے کے سوا چارہ نہ تھا۔ گرو نے مجھے چبوترے پر لٹا دیا اور ساری شمعیں بجھا کر ایک دیا روشن کر دیا۔ پھر ایک کالا پتلا میرے اوپر رکھ کر ذبح کیا اور ایک بار پھر کمرے میں مکھیوں کی وہی بھنبھناہٹ سنائی دی اور پتلے میں سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ ان سطور میں ان خرافات کے بارے میں مزید ذکر کرنا مناسب نہیں جو گرو نے میرے اندر سے سات بھوتوں کی راکھ نکالنے کیلئے کیے۔ میری حالت اس بے بس و لاچار انسان جیسی تھی جس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر کانوں اور منہ میں روئی ٹھونس کر ایک طرف ڈال دیا جائے اور کسی تیز دھار آلے اسے اس کے بدن کھال اتار لی جائے۔ میرے ساتھ عملاً تو ایسا نہیں ہوا، لیکن مکروہ عملیات کے دوران گرو نے مجھے ایسی ناگوار اور مکروہ اشیاء کھلائیں اور خون سے سلگتے کوئلوں پر لٹا کر سات بھوتوں کی حاضری لگائی کہ میری روح تڑپ اٹھی اور میں شدت اذیت سے بے ہوش ہو گیا۔ پھر جب ہوش آیا تو میں بیماری سے نجات پا چکا تھا۔ میں نے اس پراسرار بیماری میں جتنے بھی دن گزارے، آج بھی انہیں یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

واپسی سے پہلے استاد مراد نے گرو جی مہاراج سے کچھ عملیات سیکھے، ہم ایک ہفتہ وہاں رہے۔ اس دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ گرو، استاد مراد کا پرانا آشنا تھا اور کچھ عرصہ ایران رہ کر آیا تھا۔ گرو کے پاس بھارت، ایران اور نیپال سے کالے عامل علوم سیکھنے آتے تھے۔ میں جتنے روز وہاں رہا، مجھے ایک بات نے بے چین رکھا۔ میں اس جستجو میں رہا کہ گرو نے اس رات باقی بارہ عاملوں کے ساتھ جو مکروہ رسومات ادا کی تھیں، ان کا مقصد کیا تھا۔ وہاں تو مجھے کسی نے نہیں بتایا، مگر واپسی پر استاد مراد نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اس کی یہ باتیں بڑی عجیب اور خوفناک تھیں۔

"استاد یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ہماری حکومت اور یہاں کے علماء ان شیطانوں کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔" میں نے استاد سے کہا۔

"نہیں....." استاد مراد نے کہا" اس لیے کہ یہ لوگ ہمیشہ ایک جگہ نہیں رکتے۔ آج انہوں نے اس حویلی میں شیطان کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے تیرہ بڑوں کا اجلاس کیا ہے تو اگلے سال یہ میلہ کسی اور گوٹھ میں سج سکتا ہے، لیکن ایک بات طے ہے۔ تیرہ کالوں کا یہ اجلاس ہوتا سندھ میں ہی ہے۔" استاد مراد نے پوری وضاحت کے ساتھ بتایا کہ کالے عامل شیطانی رسومات کی ادائیگی کیلئے صدیوں سے ایسی تقریبات کرتے آرہے ہیں۔ باواجی نہال شاہ کے دور میں نمولیاں کے قریب ایک گاؤں میں ہر کالی رات کالے عامل اکٹھے ہوتے تھے، لیکن پاکستان بننے کے بعد کالے عاملوں نے سندھ کے صحراؤں میں ایسے مقامات مقرر کر دیے ہیں جہاں ہر سال گروجی مہاراج اور اس پائے کا عامل بارہ دوسرے بڑے عاملوں کے ساتھ مل کر شیطان کی عبادت کرتا ہے۔ اجلاس بہت خفیہ ہوتا ہے مگر کالا علم کرنے والوں کو اس کی اطلاع ہوتی ہے کہ یہ اجلاس کب اور کہاں ہو گا"۔

بچے جو جادو سے پیدا کئے گئے

پراسرار دنیا کے ہوشربا پہلو اب مجھ پر آشکار ہونے لگے تھے۔ تیرہ کالے عاملوں کا اجلاس دیکھنے کے بعد اس علم کی مکروہ دنیا کے گھناؤنے روپ دیکھتا چلا گیا۔ اس وقت تک میں یہی سمجھتا تھا کہ تیرہ کالے عاملوں میں صرف ہندو پنڈت شامل ہوتے ہیں لیکن بعد میں عقدہ کھلا کہ ان میں چار مسلمان، چار عیسائی اور پانچ ہندو عامل ہوتے ہیں اور سب مقدس کتابوں کی بے حرمتی کرتے اور شیطانی علوم پر دسترس حاصل کرنے کیلئے شیطانی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ بعد میں جب میں اس علم سے آشنا ہوا اور جدید دنیا کے علوم سے بھی استفادہ کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ کالے جادو میں شیطانی رسوم کی ادائیگی اور عبادت صرف ہندو پاک میں ہی رائج نہیں ہے بلکہ صدیوں پہلے آج کے متمدن، مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی اس عقیدے کے پیروکار موجود تھے۔

بات شیطانی رسومات کی ہو رہی ہے، لہٰذا میں یورپ میں رائج کالے علوم اور کالے عاملوں کی شیطانی عبادات کی رسومات بھی بتاتا چلوں تاکہ ہمارے وہ قاری میری کہانی سمجھ سکیں جو اب تک اسے فرضی اور افسانوی داستان سمجھ رہے ہیں۔ میں کہوں گا کہ وہ آج کی مہذب و متمدن اقوام کے اس چہرے کو دیکھ لیں کہ وہ شیطانی رسومات اور کالے علم کی دلدل میں کس قدر غرق تھیں اور یہ رسومات ان کے ہاں فیشن کے طور پر بھی ادا کی جاتی تھیں۔

کالے علم کی دنیا میں شیطانی مجالس کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ لطف اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ تقریبات آج کی مہذب دنیا کے سرخیل ممالک نے صدیوں پہلے رائج کی تھیں۔ مشہور یورپی مصنف اے وی ویٹی نے اپنی کتاب ''سفلی رسومات کی قدیم تاریخ'' میں لکھا ہے کہ کالے جادو اور شیطان کی اطاعت و فرمانبرداری کے لیے بھوتوں سے بدفعلی کرانا، آزادانہ جنسی اختلاط کے ذریعے شر انگیزی پھیلانا واجب تھا۔ مصنف کے بقول سولہویں صدی میں شیطان کی حقیقی فرمانبرداری اور اس کی بندگی کے طور پر مسیحی عبادت کی پیروڈی کی گئی اور سفلی رسومات ایجاد کی گئیں۔ ان رسومات میں سفلی علوم کا عامل اپنی تمام تر عقیدت اور بندگی شیطان کے نام موسوم کرتا تھا۔ ویٹی لکھتا ہے کہ کالے جادو کی حقیقی مجالس یا تقریبات فرانس کے شہنشاہ ہنری دوم کی بیوی کیتھرائن ڈی میڈیسی (۱۵۱۹۔۸۹ء) کی اختراع ہیں۔ وہ پرلے درجے کی بدکار اور عیاش عورت تھی۔ اس نے یورپ میں پھیلے ہوئے کالے عاملوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور جب ۱۵۵۹ء میں ہنری دوم مر اتو اس نے سفلی علوم کے ماہرین کو اپنے دربار میں عہدے دیے۔

کیتھرائن نے سفلی علوم میں تجربے کر کے شیطان کی عبادت کے طریقے وضع کیے۔ ان عبادات میں مقدس اشیاء کی بے حرمتی کی جاتی۔ یہ لوگ مسیحی عبادات کی تحریف و تضحیک کر کے شیطان کی عبادت کرتے۔ کیتھرائن نے مذہبی کتب کی بے حرمتی کا ایک انتہائی شرمناک طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی کو عریاں کر کے مذہبی کتب اس کے برہنہ بدن پر رکھتی اور انتہائی مکروہ انداز میں مقدس کتب کا مذاق اڑاتی۔ اس کے درباری جو عموماً تیرہ کی تعداد پر مشتمل ہوتے، اس کی تقلید کرتے۔

کیتھرائن نے کالے جادو اور شیطان کی عبادت میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اسے درباری عمائدین کی بیگمات و افسران میں رائج کر دیا۔ کیتھرائن کی ان رسومات کا چرچا چہار دانگ عالم پھیل گیا۔ جرمنی، آسٹریلیا، اٹلی اور انگلستان میں بھی کیتھرائن کے پیروکار پیدا ہو گئے۔ ان عبادت میں چونکہ تشنہ شہوانی خواہشات بیدار ہوتی تھیں، اس لیے نفس پرست معاشرہ شیطانی رسومات ادا کرنے کیلئے ایسی تقریبات کرنے لگا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ شہنشاہ ہنری سوئم بھی شیطانی مجالس میں شرکت کرنے لگا۔ اس دور میں یورپ کے تمام بڑے ممالک میں سفلی علوم کے ماہر درباروں سے منسلک تھے اور ان کے مخالفین بھی سفلی علوم کے ماہرین کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ یورپ کا اگر ریکارڈ اکٹھا کیا جائے تو آج کے متمدن ممالک کا یہ شرمناک چہرہ سامنے آتا ہے کہ اس زمانے میں مذہب سے برگشتہ اور اخلاق باختہ پادریوں کی کثیر تعداد کالے جادو کے مذموم کاروبار میں ملوث تھی۔

مثال کے طور پر فرانس کا مشہور عامل ابی بکار بلی جب کالے عاملوں کی سفلی تقریبات منعقد کرتا تو حاضرین میں چھوٹی چھوٹی چوسنے والی میٹھی ٹکیاں تقسیم کرتا جن کے متعلق خیال تھا کہ ان سے کھانے والے کی جنس تبدیل ہو جاتی ہے۔ فرانسیسی علاقے باسل میں سینٹ سیکائرے کی رسومات میں جادو کے ذریعے موت طاری کی جاتی تھی۔ اس کیلئے ایسے اندھے کنویں کا پانی استعمال کیا جاتا تھا جس میں بغیر ماں باپ کے پیدا ہونے والا بچہ ڈوب مرا ہو۔

جدید دنیا کے لیے غالباً یہ ناقابل یقین ہو گی، مگر فرانس کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ اس زمانے میں سفلی عبادات کے نتیجے میں لاتعداد ایسے بچے پیدا ہوئے جن کے ماں باپ نامعلوم ہوتے۔ ان بچوں کو کوئی عورت گود نہیں لیتی تھی بچے یا تو سفلی علوم کی بھینٹ چڑھا دیے جاتے یا انہیں عیسائی تعلیمات کے خلاف استعمال کیا جاتا۔ ان بچوں کی تعداد چونکہ بہت زیادہ تھی، اس لیے ایسی خصوصی تنظیمیں بنائی گئیں جو ان نومولود بچوں کو ٹھکانے لگاتی تھیں۔

ایک فرانسیسی عورت کیتھرائن ڈیشے ایئسس نے بھی ان سفلی بچوں کو ٹھکانے لگانے کیلئے تنظیم قائم کی تھی۔اس گھناؤنے کاروبار کے خلاف چیمبر آرڈ سینٹی آفیئرز نامی ایک تنظیم میدان میں اتری اور اس نے کیتھرائن کے جرائم کے ثبوت اکٹھے کر کے عدالت میں پیش کیے۔یوں روح فرسا رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں منظر عام پر آئیں۔کئی یورپی مورخین نے اپنی کتب میں لکھا ہے کہ کالے عامل باقاعدگی سے گرجا گھر جاتے اور عبادت کرتے تھے، مگر باطنی طور پر شیطان کی تسکین کا سامان اکٹھا کرتے تھے۔اس دور میں سفلی علوم کا کاروبار کرنے والوں نے کالے جادو کی بائبل تیار کر رکھی تھی جس پر انسانی چمڑی کو بطور جلد استعمال کیا جاتا تھا۔اسپین اور اس کی سفلی تقریبات میں ایسی موم بتیاں استعمال ہوتیں جو بچوں کی چربی سے تیار کی جاتی تھیں۔انگلینڈ میں بعض ایسے آلات اور دیگر اشیاء استعمال کی جاتیں جن سے سفلی مجالس کا جلال اور نحوست بڑھ جاتی تھی۔

فرانسیسی مورخ اور ناول نگار کارل ہائسس مین نے اپنی کتاب، ''لاباس''، میں لکھا ہے کہ اس نے ایک قدیم تباہ شدہ گرجا گھر میں شیطان کی عبادت کا منظر دیکھا تو اس پر حقیقت کھلی کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں شیطان کی پرستش کی جاتی ہے۔اس نے امریکہ کے مطلق بھی معلومات حاصل کیں اور جانا کہ تمام امریکی نو آبادیاں کالے جادو کے گھناؤنے کاروبار میں شریک ہیں۔ان کا سربراہ سکاٹ لینڈ کا باشندہ لانگ فیلو تھا جو شیطان کی تعلیمات میں نت نئے گھناؤنے، مکروہ اور سفاکانہ تجربے کرنے میں مشہور تھا۔

ہائسس مین لکھتا ہے کہ چیمبر آرڈ سینٹی آفیئرز نے بہت کم عرصے میں سفلی علوم کے ماہرین کے خلاف کام کیا تھا۔یہ ایسے نوجوانوں کی تنظیم تھی جو علوی علوم کی حامی تھی اور معاشرے سے شرمناک اور غیر انسانی علوم کو ختم کرنا چاہتی تھی۔

تنظیم نے معاشرے کے بارہ افراد کو بھی بے نقاب کیا۔اس دور میں جادو گری کی پاداش میں جن لوگوں پر مقدمات چلائے گئے، انہوں نے تنظیم کے سامنے جو انکشافات کیے وہ بلاشبہ لرزہ خیز تھے۔ان انکشافات سے پادریوں کا کردار کھل کر سامنے آیا جو بظاہر نیکی کے مبلغ تھے، مگر باطنی طور پر شیطان کے پجاری تھے۔پادری شیطان کی خوشنودگی کیلئے خوبصورت اور نوجوان برہنہ اجسام عورتوں پر نومولود بچوں کے گلے کاٹا کرتے تھے۔تنظیم نے سفلی علوم کا کاروبار کرنے والے معززین اور طبقہ اشرافیہ کے بارے میں بتایا کہ کس طرح شرفاء امراء کی بیویاں اپنے خاندانوں اور رشتہ داروں کو شیطان کی خوشنودی کی خاطر قتل کر دیتی تھیں اور کس طرح شاہی محل میں سفلی علوم کی ماہر عورتیں بادشاہ کی توجہ حاصل کرنے کیلئے کالے علم کو بروئے کار لاتی تھیں۔شاہ فرانس کی ہدایت تھی کہ تنظیم کالا جادو کرنے والوں کے خلاف کھلی کارروائی کرے۔ٹربیونل ایک ایسے کمرے میں بیٹھتا تھا جہاں سیاہ پردے لٹکے تھے اور موم بتیوں کی روشنی میں کام ہوتا تھا۔

تقریباً ایک سال کی پیہم کوششوں سے چیمبر جادو گری کے مذموم کاروبار میں ملوث امراء، شرفاء، ان کی بیگمات اور داشتاؤں کے پیغام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا مگر جب بادشاہ کی ایک سابق داشتہ مادام ڈی مونسٹیاں نے شاہ کی محبت دوبارہ حاصل کرنے اور اس کی داشتہ کو ہلاک کرنے کیلئے سفلی علوم کا سہارا لیا تو شاہ نے چیمبر کو آئندہ ہر کارروائی میں رازداری برتنے کی ہدایت کی اور کہا کہ چیمبر فرانس کے شرفاء اور امراء کو ٹربیونل میں طلب نہ کرے۔اس دور میں فرانس کے امراء و شرفاء شہوت پرستی، عیاشی اور قتل و غارت گری کے معاملات میں سفلی علوم کا سہارا لیتے اور سفلی تقریبات کا اہتمام کرتے تھے۔متمدن و مہذب ملک کے شرفاء اور اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد کالے جادو سے وابستہ تھے اور اپنی اخلاق باختہ رسومات کی سیرابی کیلئے شیطان کے آگے سجدہ ریز رہتے تھے۔

سفلی عامل ننگے ہو جاتے ہیں

یورپی ممالک میں شیطانی عبادات ور سومات اوران تقریبات میں نئے کالے عاملوں کو شامل کیے جانے کی رسومات کا بھی سنئے۔

جادو گروں اور جادو گرنیوں میں 'راز داری' کو انتہائی اہمیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سفلی تقریبات دور دراز جگہوں مثلاً پہاڑوں کے دامن، جنگلات یا کسی ویران علاقے میں واقع گھر یا پھر بالکل بند گھروں میں منعقد کی جاتیں۔ تقریبات میں اہم بات چونکہ برہنہ پن ہوتا اس لیے خیال کیا جاتا تھا کہ اگر کوئی بیرونی شخص انہیں اس حالت میں دیکھ لے گا تو نقص امن کا اندیشہ ہو گا اور جادو گر نہیں چاہتے تھے کہ ان کے خلاف قانونی کارروائیاں کی جائیں۔ اسی لیے وہ آبادی سے دور ویران جگہوں پر رسومات ادا کرتے۔

سفلی تقریب میں ایک بڑی سی میز ہوتی جس پر سفید کپڑا بچھا ہوتا تھا، یہ میز قربان گاہ کا کام دیتی۔ اس کے گرد فرش پر چاک یا فیتے سے نو فٹ قطر کا دائرہ لگایا جاتا۔ دائرے کے گرد جادو گری کے مذہبی نشانات ہوتے جن کی مدد سے دیوتاؤں سے طاقت حاصل کی جاتی۔ دائرے کے باہر نزدیک ہی چار موم بتیاں جلائی جاتیں تاکہ دائرے کے نشانات واضح رہیں اور نظر آتے رہیں۔ قربان گاہ (میز) پر ایک برتن رکھا ہوتا جس میں خوشبویات جل رہی ہوتیں۔ اس کے علاوہ ایک کوڑا یا درہ، چھوٹا سا چاقو جسے "اپتم" کہتے تھے، ایک لمبی دھار والی تلوار، نمک اور پانی کے برتن ہوتے تھے۔

تقریب کا سربراہ جادو گر بھی ہو سکتا تھا اور جادو گرنی بھی۔ جادو گرنی، عظیم ماں، (زرخیزی کی دیوی) کو ظاہر کرتی اور جادو گر (شکار کے دیوتا) کو ظاہر کرتا۔ یہ یا تو بالکل برہنہ ہوتے یا صرف سفید چوغے پہنے ہوئے ہوتے۔ جب تقریب کا سربراہ کوئی مرد ہوتا تو پھر گروہ کی عورت کارکن علامتی، عظیم ماں، کی حیثیت سے رہنمائی کرتی۔ ویسے آج کل انتہائی اہم گروہوں میں رہنما کی حیثیت حاصل کرنے کیلئے کسی شخص کو تین سال تک جادو گر رہنا پڑتا ہے اور اپنے آپ کو جادو گری کا ایمان دار سچا، اور وفادار پیرو کار ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اس سفلی تقریب میں جب تمام کام تیار ہو جاتا تو جادو گروں کا سردار سفلی ناموں والے بارہ پجاریوں کو بلاتا اور ایک ساتھ کھڑا کرتا۔ یہ سفلی نام دراصل ان پجاریوں کے اصل ناموں کی جگہ رکھے جاتے اور سفلی تقریبات میں اصل نام کی بجائے انہیں سفلی ناموں سے پکارا جاتا۔ بارہ پجاری دائرے کے گرد کھڑے ہو جاتے، تمام برہنہ ہوتے۔ جادو گروں کا عقیدہ ہے کہ اگر وہ تقریبات میں برہنہ نہ ہوں بلکہ کپڑے پہنے ہوں تو نیکی کی قوتیں غالب آجاتی ہیں۔ جب برہنہ پجاری دائرے کے گرد کھڑے ہو جاتے تو بڑا جادو گر دعا کہتا اور پجاری ان الفاظ کو دہراتے جاتے۔ یہ تقریباتی دعا جادو گری کی ضخیم کتاب "دی بک آف شیڈوز" (سایوں کی کتاب) سے پڑھی جاتی جو قربان گاہ کے ایک طرف سٹینڈ پر رکھی ہوتی۔

یہ کتاب قدیم زمانے میں لکھی گئی تھی۔ جب کسی پجاری کو 'برے جادو گر' کا عہدہ دیا جاتا تو وہ اپنے استعمال کیلئے اس کتاب کی ایک نقل اپنے ہاتھوں سے تیار کرتا۔ سفلی دائرے پر سب سے پہلے نمک اور پانی چھڑکا جاتا اور بڑا جادو گر پجاریوں کے جھکے ہوئے سروں پر قدیم دعائیں پڑھتا۔ پھر پجاری (جادو گر اور جادو گرنیاں) ہاتھوں سے ہاتھ جوڑ کر تقریبی دائرہ بناتے اور سفلی دائرے کے گرد آہستہ آہستہ رقص کرتے۔ پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد بڑا جادو گر پکارتا:

"شمال، مشرق، جنوب اور مغرب کی عظیم طاقتور ہستیو! میں تمہیں حاضر ہونے کیلئے پکارتا ہوں تاکہ تم ہماری رسومات دیکھ سکو اور ہمارے آدمیوں کی رہنمائی کر سکو۔"

اس موقع پر بعض اوقات پس منظر میں موسیقی بجائی جاتی تاکہ رقص میں ترتیب رہے۔ اس دوران بڑا جادو گر محور قص ارکان کو ہلکے ہلکے کوڑے بھی مارتا تاکہ ان سے گندی روحیں دور ہو جائیں۔

اگر جادو گروں کی اس ٹولی میں کسی نئے ممبر کو شامل کرنا ہوتا تو اس موقع پر وہ بھی رسم ادا کی جاتی۔ نیا پیرو کار قربان گاہ کے سامنے ایک مقام پر برہنہ کھڑا ہو جاتا، بڑا جادو گر چاقو بلند کرتا اور مشرق کی طرف مڑتا۔ اس طرح وہ دیوتاؤں کو مطلع کرتا کہ ایک نیا شخص مذہب جادو گری میں داخل ہو رہا ہے، اس پر عنایات اور کرم کیا جائے پھر اس نووارد کو ایک چھوٹے سفلی دائرے میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی جو اسی مقصد کیلئے وقف ہوتا تھا۔

یہ خصوصی دائرہ بڑے سفلی دائرے کے اندر بنایا جاتا۔ نو مذہب دائرے میں کھڑا ہوتا تو قربان گاہ اس کے بالکل سامنے ہوتی پھر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی اور ہاتھوں کو پشت سے باندھ دیا جاتا۔ بندھی رسی کو اس کی گردن کے گرد بھی لپیٹ دیا جاتا۔

جادو گروں کے بعض گروہوں میں نو مذہب کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا جاتا۔ اس چادر کو ہٹانے کا مطلب یہ ہوتا کہ نو مذہب کو جادو گری میں نئی زندگی عطا ہوئی ہے۔ اس کے بعد نو مذہب کو بڑا جادو گر بتاتا کہ وہ ایک نئی زندگی میں داخل ہو رہا ہے اور اسے تنبیہہ کی جاتی کہ جو راز اسے بتائے جائیں وہ کسی اور کو نہ بتائے۔ اس کیلئے وہ قسم کھاتا اور اپنی انگلی پر چھوٹا سا چیرا لگا کر اپنے وعدہ پر اپنے خون سے مہر ثبت کرتا۔ تقریب جب عروج پر ہوتی تو تلوار نئے پیرو کار کی چھاتی کے نزدیک لائی جاتی اور اسے کہا جاتا کہ وہ جادو گر سے پوری زندگی وفادار اور مخلص رہنے کی قسم کھائے۔ چونکہ جادو گر اس عقیدے پر یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ جسم عطا ہوتا ہے اسلیے نئے پیرو کار کو ڈرایا جاتا ہے کہ اگر اس نے قانون ابلیس کی خلاف ورزی کی تو وہ سسک سسک کر مرے گا اور اگر اس نے مسلک جادو گری سے انحراف، بے وفائی یا غداری کی تو وہ مرنے کے بعد دوبارہ جسم عطا ہونے کا موقع بھی گنوا بیٹھے گا۔

جب یہ رسم مکمل ہو جاتی تو بڑا جادو گر نو پیرو کار کی آنکھوں سے پٹی اور ہاتھوں سے رسی کھول دیتا، پھر نئی زندگی عطا ہونے کی علامت کے طور پر نو پیرو کار سے پانچ بوسے لیتا۔ اب مختصر وقفہ ہوتا جس میں نو مذہب بڑے دائرے کے گرد کھڑے اپنے دوسرے ساتھیوں سے جا ملتا، تھوڑی دیر بعد بڑا جادو گر دیوتاؤں سے مردوں کیلئے صحت اور خوشحالی اور عورتوں کیلئے حسن سلوک اور زرخیزی کا انعام طلب کرتا۔ آخر میں بھرپور رقص ہوتا اور محفل ختم ہو جاتی۔

کئی سال تک مفکرین اس سوال کا جواب تلاش کرتے رہے کہ دیوتاؤں کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے آیا جادو گرنیاں گروہوں میں اکٹھی ہوتی تھیں یا اجتماع میں ملا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر ہار گریٹ مورے نے اپنی کتاب، مغربی یورپ میں جادو گری کی رسم، میں بتایا ہے کہ جادو گرنیوں کے ان اجتماعات میں روایتی طور پر تیرہ ارکان ہوتے تھے۔ اس بات کے ثبوت میں ڈاکٹر مورے فرانس، جرمنی، سکاٹ لینڈ اور انگلینڈ سے مثالیں پیش کرتی ہے۔ اس کے مطابق جادو گرنیوں کے اجتماع کا لفظ سب سے پہلے ۱۶۶۳ء میں استعمال ہوا جب سکاٹ لینڈ کی جادو گرنی آئزو بیل گوڈی نے عدالت میں کہا تھا کہ ہر اجتماع میں تیرہ ارکان ہیں تاہم اس بات کے بھی کافی امکانات ہیں کہ وقت کے ساتھ اجتماع میں ارکان کی تعداد میں کمی بیشی آتی تھی۔ بعض دوسرے مفکرین نے کہا ہے کہ یورپ کے بعض ملکوں میں ہر ضلع میں جادو گرنیوں کے گروہوں کا ایک چیف آفیسر ہوا کرتا تھا۔ ہونٹیگ سمرز نے اپنی کتاب "تاریخ جادو گری اور علم بھوتیات" میں اس کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ بعض مفکرین کا یہ بھی خیال ہے کہ جب نئے مذہب (عیسائیت) کی طرف سے قدیم مذہب (جادو گری) کے ماننے والوں پر تشدد کیا جانے لگا تو جادو گرنیوں نے رازداری سے علاقائی سطح پر ایک دوسرے سے ملنا جاری رکھا تاکہ ایذا رسانی کے متعلق مشورہ کیا جا سکے۔ جادو گرنیوں کے بعض اجتماعات کا علم عام لوگوں کو بھی تھا۔

معتبر ترین ذرائع کے مطابق جادو گرنیاں دو قسم کے اجتماعات میں شرکت کیا کرتی تھیں، ایک کا نام السبت تھا۔ یہ جادو گرنیوں کا چھوٹا سا اجتماع ہوتا تھا جس میں جادو گرنیوں پر ایذا رسانی وغیرہ پر تبادلہ خیال کیا جاتا۔ دوسرے اجتماع سبت میں وہ اپنے خفیہ اعتقادات کا بھرپور مزا لوٹا کرتی تھیں۔ سبت کے علاوہ کسی اور اجتماع کے متعلق تاریخ کے صفحات بالکل خالی ہیں۔

جادو گرنیاں اجتماع کیلئے جگہ کا انتخاب انتہائی احتیاط اور سوچ سمجھ کر کرتی تھیں۔ روایات کے مطابق جادو گرنیاں ان اجتماعات میں جھاڑو کے ڈنڈے پر سوار ہو کر پرواز کر کے شرکت کرتی تھیں۔ ڈاکٹر مار گریٹ مورے کے مطابق بعض افراد نے جادو گرنیوں کو جھاڑو کے ڈنڈے پر سوار محو پرواز دیکھا بھی تھا۔ پندرھویں اور سترہویں صدی کے دوران شائع ہونے والی کئی کتب میں سبت کے اجتماعات کا ذکر ہے۔

۱۶۷۳ء میں ایک قابل ذکر کتاب "جادو گرنیوں کا خوشگوار معاہدہ" شائع ہوئی تھی۔ جس میں مصنف نے جادو گرنیوں کے متعلق بعض انتہائی حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہر جادو گرنی کے متعلق یہ ثابت ہے کہ اس کے قبضے میں ایک روح یا تہینہ (شیطان کا بچہ) ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ روح جادو گرنیوں کی رہنمائی کرتی ہے اور ہر وہ خدمت بجالاتی ہے جس کا اسے حکم دیا جاتا ہے۔ یہ جادو گرنیوں کو سنجیدہ قسم کی ملاقاتوں اور اجتماعات میں خطرات سے خبردار رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جادو گرنیاں اپنے آپ کو دوسری مخلوقات سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں اور کسی کو نظر نہیں آتیں۔ جب رات گہری ہو جاتی ہے تو پھر اپنے بھتنوں، ہمزاد یا جھاڑو کے ڈنڈے پر سوار کھڑکی، دروازے یا چمنی کے راستے گھر سے نکلتی ہیں اور اجتماع میں شرکت کرتی ہیں۔ یہ ہمزاد بکری، بھیڑیا اور اژدھے کی شکل کے ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں ہر جادو گرنی اور جادو گر اپنے ہمزاد پر سوار ہو کر آتا ہے۔ عام طور پر اجتماع کا مقام ان کی رہائش گاہوں سے سینکڑوں میل دور ہوتا ہے۔ پھر یہ جادو گرنیاں شیطان کے اپنے تخت پر ششنشاہ کی حیثیت سے جلوہ گر ہونے سے قبل اس کی عبادت کرتیں، پوجا کرتیں، اس کو اپنا مالک ماننے کا اعلان کرتیں اور اس کا نام عزت جاہ و جلال سے منسوب کرتیں۔ جب یہ سنجیدہ باضابطہ تقریب اختتام پذیر ہوتی تو جادو گرنیاں ایک میز کے گرد بیٹھ جاتیں اور خوب دعوتیں اڑاتی۔ اس موقع پر دل پذیر موسیقی کی آواز سنائی دیتی۔ جب میز ہٹائی جاتی تو محفل موسیقی محفل رقص میں بدل جاتی۔ یہ رقص بھی عجیب و غریب اور پراسرار ہے۔ بیضوی شکل کے دائرے میں رقص ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو زمین سے اوپر اٹھاتیں، پھر مسخروں کی طرح اپنے سر کو زور زور سے ادھر ادھر جھٹکے دیتیں اور جسم کو اس طرح حرکت دیتیں جیسے پاگل ہوتے ہیں۔

یورپ صدیوں تک کالے جادو کی لپیٹ میں رہا ہے۔ آج بھی کالے علم کے سب سے زیادہ پجاری یورپ ہی میں ہیں جو وہاں بلیک میجک اور وائٹ میجک کہلاتا ہے۔ اہل یورپ کی مافوق الفطرت قوتوں میں دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ وہاں بننے والی ڈراؤنی فلمیں، ڈرامے اور کتابیں پوری دنیا کی ڈیمانڈ پوری کرتی ہیں۔ یہ کہنا کہ کالا جادو صرف ہند و پاک میں رائج ہے، حقائق کے منافی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کالے جادو کے ماہر اور شیطان کی عبادت و فرمانبرداری کی رسومات ادا کرنے والے ہر ملک میں موجود ہیں۔ کچھ ظاہر ہیں اور کچھ چھپ کر کام کرتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت میں ظاہری اور خفیہ دونوں طریقوں سے کام ہو رہا ہے۔

کالی ناتھ شیرازی کے طلسمات

استاد مراد سندھ سے لوٹ کر کیا آیا اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ اسے دو خوشیاں اکٹھی ملی تھیں۔ ایک تو اس نے گرو جی مہاراج سے کچھ عملیات سیکھے اور دوسری خوشی اسے میری تھی۔ میں بیماری سے نجات پا گیا تھا۔ میری صحت بھی قابل رشک ہو گئی تھی اور میں اب عملیات میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ لیکن میں نے استاد مراد سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک میں ایک بار ایران نہیں چلا جاتا، عملیات سیکھنے میں سنجیدگی اختیار نہیں کروں گا۔ استاد مراد بھی یہی چاہتا تھا اس نے میاں جی سے بات کی، مگر وہ مجھے ایران بھیجنے پر رضامند نہ ہوئے۔ استاد مراد نے ان پر دباؤ ڈالا تو میاں جی نے ایک عجیب بات کہی۔

" میں ناگی کو ایران بھیج کر تباہ نہیں کرنا چاہتا، یہ ابھی ستاروں کی نحوست کا شکار ہے اور مراد، وہاں تیرے دشمن بہت ہیں، تو اپنی حفاظت کرے گا یا اس کی فکر کرے گا۔ تیرے وہاں بہت سے بکھیڑے ہیں، پہلے انہیں سلجھا لے پھر بے شک اسے لے جانا۔ "

"میاں جی! یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں، میں نے ناگی کو ایران لے کر جانا ہے، یہ بات طے ہو چکی ہے۔ پھر آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔" استاد مراد نے کہا۔

"ناگی کے اندر ایک ہٹیلا اور ضدی انسان ہے، یہ عقل سے کام نہیں لیتا۔ تو جانتا ہے کہ ایران کے حالات کیسے ہیں، وہاں آئے دن سازشیں تیار ہوتی ہیں۔ اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تو مارا جائے گا۔ "

میاں جی نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو استاد مراد نے انہیں بڑی تگ و دو کے بعد مطمئن کر دیا، لیکن میاں جی نے ایک شرط رکھ دی اور کہا کہ پہلے اس کی منگنی کر دیتے ہیں، پھر اسے لے جانا۔ یوں میری منگنی چچا افضل کی بیٹی شفقت سے ہوئی۔ پھر میں اور استاد مراد ایران جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ہم کچھ دنوں بعد ایران جانے کیلئے کوئٹہ پہنچ گئے۔ سفر ہم نے بس میں کیا، کوئٹہ سے تفتان جاتے ہوئے بس ایک جگہ رکی اور مسافروں کو کچھ دیر ستانے اور کھانا کھانے کا موقع مل گیا۔ وہاں استاد مراد کی ایک ٹرک ڈرائیور سے ملاقات ہوئی جو سبز وار ایران کا رہنے والا تھا اور مال برداری کیلئے ایران سے کوئٹہ آتا جاتا تھا۔

وہ مال لے کر زاہدان جا رہا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ ہم بھی زاہدان جا رہے ہیں، تو استاد مراد سے کہا کہ وہ باقی کا سفر اس کے ساتھ کرے۔ استاد مراد نے اپنا سامان اٹھایا اور ٹرک میں رکھ دیا، یوں ہم بس والوں کو بتائے بغیر ٹرک میں سوار ہو کر چل دیے۔ ٹرک ڈرائیور بہت باتونی اور نڈر تھا۔ دونوں فارسی میں گفتگو کرنے لگے اور کبھی کبھار بیچ میں اردو کا تانکا بھی لگا لیتے۔ بہر حال میں دلچسپی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔

شام کا وقت تھا اور ٹرک ایک ریگزار علاقے سے گزر رہا تھا۔ چھوٹی سی ایک روپہ سڑک کے کنارے سرخی مائل ریت کے ٹیلے دور تک پھیلے ہوئے تھے اور اکا دکا جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جب گرمی بڑھی تو میں ٹرک کے شیشے نیچے کر کے منہ باہر نکال کر چہرے پر تازہ ہوا لینے لگا۔ سڑک پر سفر شروع کیے ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ پیچھے سے ہماری بس بھی آ گئی۔ اس نے رستہ لینے کیلئے ہارن بجایا۔ ٹرک ڈرائیور نے بس والے کو موٹی سی گالی دی اور ٹرک ایک طرف کر کے رستہ دے دیا، مگر بس والے نے آگے نکلتے ہی بس سڑک کے درمیان روک دی۔ بس کا ڈرائیور اور کنڈیکٹر نیچے اترے تو ان کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آئے۔ ان کے عزائم خطرناک تھے۔ ٹرک ڈرائیور پہلے تو حیران ہوا، پھر برق رفتاری کا مظاہرہ کیا، منہ پیچھے کر کے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا اور استاد مراد سے کہا۔

" مرشد! اس لڑکے کو لے کر نیچے اتر جائیں، میں ان حرامزادوں کو دیکھتا ہوں۔ "

میں اور استاد مراد پریشان تھے کہ بس والوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم دونوں جلدی سے نیچے اترے۔ استاد مراد مجھے ٹرک کے پیچھے لے گیا۔ اس دوران ٹرک ڈرائیور بھی بندوق پکڑ کر نیچے آ گیا۔ بس ڈرائیور چند قدم پیچھے ہی رک گیا اور ٹرک ڈرائیور سے کہا

"تم نے ہماری سواریاں کیوں اٹھائی ہیں۔" اب معاملہ ہماری سمجھ میں آ گیا کہ بس والوں کو کیا تکلیف ہے حالانکہ بس والوں کو اس بات پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ ہم نے انہیں پورا کرایہ ادا کر دیا تھا۔ اب ہم بس سے اتر جاتے تو انہیں فکر نہیں ہونی چاہیے تھی، مگر انہوں نے اس بات کو اپنی توہین سمجھا اور ٹرک ڈرائیور سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

پہلے تو دونوں کے درمیان زبانی جنگ ہوئی پھر دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہوئی۔ بس کی سواریاں اتر کر ریت کے ٹیلوں کی طرف بھاگ اٹھیں۔ استاد مراد بھی مجھے لے کر ایک ٹیلے کی طرف بھاگ گیا۔ خاصی دیر تک دونوں پارٹیوں میں فائرنگ ہوتی رہی۔ کئی مسافر گولی لگنے سے زخمی بھی ہوئے مگر ڈرائیوروں کو ان کی فکر نہیں تھی۔ میں اور استاد مراد ٹرک سے ایک میل دور واقع ٹیلے پر چھپے ہوئے تھے۔ استاد مراد بہت پریشان تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ یہ جنگ یوں نہیں رکے گی تو اس نے عملیات والا تھیلا اٹھایا اور مجھے کہا "ناگی! یہ جنگجو اس طرح نہیں رکیں گے مجھے کچھ کرنا ہو گا۔"

"تو کیا کرے گا استاد؟" میں نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

"دیکھتا جا کہ تیرا استاد کیا کرتا ہے۔" استاد مراد نے ایک نظر ڈوبتے سورج کو دیکھا پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبیہ نکالی اور اسے کھولتے ہوئے بولا "ناگی! یہ عین زوال کا وقت ہے اور یہ وقت شیطان کے بیدار ہونے کا ہے۔ گروجی مہاراج نے مجھے اس سمے میں ایک عمل دیا تھا، آج اسے آزما کر دیکھتا ہوں۔"

"استاد تو کالا علم کرے گا؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہاں کالا علم پڑھوں گا۔" یہ کہتے ہوئے استاد مراد کے اندر کا درندہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ اس نے ڈبیہ میں سے چٹکی بھر راکھ نکالی، کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری پھر راکھ کو چار قدم آگے بڑھ کر ریت کے اوپر پھینک دیا اور میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں نے استاد مراد کی جانب دیکھا، وہ آنکھیں بند کیے سڑک کی اس جانب رخ کر کے کھڑا تھا جدھر ٹرک اور بس والے ایک دوسرے پر فائرنگ کر رہے تھے۔ میری بائیں جانب والے ٹیلوں میں بس کے مسافروں نے پناہ لی ہوئی تھی اور ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

استاد مراد پھر ادھر گیا جدھر اس نے چٹکی بھر راکھ پھینکی تھی اور ریت پر پھونکیں مارنے لگا۔ پھر وہ نیچے جھکا، دائیں ہاتھ میں ریت اٹھائی، ایک دلخراش چیخ مار کر ریت کو آسمان کی طرف پھینکا اور زور زور سے کچھ پڑھنے لگا۔ میں استاد کا یہ بہروپ دیکھ کر کانپ اٹھا۔

فائرنگ سے گونجتی فضا میں تیز ہواؤں کے شور کا اضافہ ہونے لگا۔ اچانک استاد مراد کھڑا ہو گیا اور پھر ریت میں سے سیاہ طوفانی بگولا اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ریت کے ٹیلوں پر قیامت برپا ہو گئی۔ بگولا جلد طوفان بن گیا اور اس کا رخ سڑک کی طرف ہو گیا۔ استاد کا سیاہ چوغہ طوفانی ہواؤں کی شدت سے لہرانے لگا۔ اس نے دونوں بازو کھول دیے اور انہیں یوں لہرانے لگا جیسے بڑے بڑے پنکھ ہوا پیدا کرنے کیلئے لہرائے جاتے ہیں۔ سیاہ بگولا سڑک پر پہنچا تو دونوں پارٹیاں فائرنگ کرنا بھول گئیں اور طوفان سے بچنے کیلئے بھاگ اٹھیں۔ طوفان نے آدھ گھنٹے تک خوب تباہی پھیلائی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جب تک استاد مراد وہاں کھڑا رہے گا طوفان ختم نہیں ہو گا۔ مجھے فکر ہوئی کہ اگر طوفان نے ٹرک اور بس کو الٹا دیا تو مسافر یہاں پڑے رہ جائیں گے کیونکہ شام ہوتے ہی اس علاقے میں ٹریفک رک جاتی تھی۔ میں اٹھا اور استاد مراد کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ پہلے اسے آوازیں دیں، مگر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا میں نے اپنا ہاتھ اس کے کندے پر رکھا تو مجھے شدید جھٹکا لگا جیسے میں نے بجلی کی ننگی تاروں کو چھو لیا ہے۔ مجھے دوبارہ ہمت نہ ہوئی کہ استاد مراد کو ہاتھ لگا کر روکوں، لیکن اسے روکنا بھی بہت ضروری تھا کیونکہ ٹیلوں میں چھپے لوگ استاد مراد کو دیکھ کر اسے کوئی مافوق الفطرت ہستی سمجھ رہے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارا یہاں تماشا بنے۔ مجھے استاد پر غصہ آنے لگا کہ وہ اپنے طوفان کو اب روک کیوں نہیں دیتا۔ سوچتے سوچتے مجھے ایک خیال آیا، لیکن اس پر عمل کرنا موت کو گلے لگانے کے مترادف تھا۔ میں تیزی سے استاد مراد کے سامنے آ گیا۔ طوفان نے مجھے اپنے اندر چھپا لیا اور اب میں اس تند و تیز بگولے کی لپیٹ میں آ گیا۔ بگولا کسی بڑی مشین کی طرح گردش کر رہا تھا۔ میں اس کے اندر اتنی تیزی سے گھومنے، چکرانے لگا کہ میری چیخیں بھی سیاہ بگولے میں دب کر رہ گئیں۔ میرے حواس جواب دے گئے اور ذہن پر تاریکی چھا گئی۔

☆☆☆☆☆☆

میرے ارد گرد قیامت کا شور برپا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسرافیل نے صور پھونک دیا ہے۔ سیاہ' کتاریک اور مہیب ریت کے طوفان نے مجھے نگل لیا اور میرے بدن کی پور پور میں ریت کے ذرے تیروں کی طرح پیوست ہونے لگے۔ میرے دماغ پر گھٹاٹوپ اندھیرے قابض ہو گئے اور طاغوتی طوفان کی تیزی و تندی نے میرے دل کو پارہ پارہ کر دیا۔ میں تو اس زعم میں استاد مراد کے طاغوتی طوفان کے آگے ڈھال بن کر کھڑا ہوا تھا کہ اسے روک دوں گا مگر کیا معلوم تھا کہ اس کی پراسرار اور آسیبی قوتیں سیل رواں کی طرح مجھے تنکوں کی طرح بہالے جائیں گی۔ طوفانی جھکڑوں میں میرا بدن پہیے کی طرح گھوم رہا تھا اور میری کربناک چیخیں اس کے شور میں دب کر رہ گئیں۔

طوفان نہ جانے کب تک جاری رہا مگر مجھے جس بات کا احساس رہا وہ یہ تھا کہ میں پہیے کی طرح گھومتا طاغوتی طوفان کے اندر ہی اندر کسی انجانی دنیا کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہوں۔ کوئی طاقت مقناطیس کی طرح مجھے طوفان کے آماخذ کی طرف کھینچ رہی تھی اور میں الٹ پلٹ ہو کر قلابازیاں کھاتا ہوا اس جانب کھنچا جا رہا تھا۔ میرے تمام احساسات و مدافعت دم توڑ گئے۔ لہذا میں طاغوتی طوفان سے نکلنے کے لئے کوئی تدبیر نہ کر سکا۔ طوفان کے آماخذ پر پہنچ کر میں بے سدھ ہو کر گر پڑا بلکہ اسے یوں بیان کیا جائے تو زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز بات ہو گی کہ میں کسی کانچ کے بت کی طرح سنگلاخ زمین پر گرا تو میرا پورا بدن چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس لمحے میرے ساتھ ایک اور عجیب بات ہوئی۔ میرے ذہن پر مسلط تاریکی چھٹ گئی اور میں اپنی بے بسی و ذلت اور خستہ حالی دیکھنے لگا۔ میرا ذہن جاگ رہا تھا مگر پورا بدن کانچ کے ٹکڑوں کی طرح بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید یہ میری روح تھی جو بدن کی قید سے نکل کر اپنے خاکی پیرہن کا نظارہ کر رہی تھی۔

میں جس جگہ گرا وہاں سنگ ریزے پڑے تھے اور اس سے کچھ ہی فاصلے پر بدبودار اور گندے پانی کا جوہڑ تھا۔ میرا بدن کنارے پر کرچیوں کی صورت میں بکھرا پڑا تھا اور میری روح چند قدم کے فاصلے پر حسرت و یاس کا نمونہ بنی کھڑی تھی۔ میرے تمام احساسات بیدار ہو گئے۔ یہ کوئی جزیرہ دکھائی دیتا تھا۔ غلیظ و گندے پانی نے اس کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ زندگی کے آثار ناپید تھے' فضا میں عجیب سی ناگوار بو رچی ہوئی تھی ملگجی اندھیرا ماحول پر طاری تھا۔ کہیں کہیں سوکھی جھاڑیاں اور کھجور کے ٹنڈ منڈ درخت تھے۔ میں اپنے لطیف بدن کے ساتھ ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے جھاڑیوں کی طرف گیا۔ یہ جھاڑیاں عجیب قسم کی تھیں۔ ان کی شاخیں نیزوں کی طرح تھیں اور ان پر خون کے قطرے جمے ہوئے تھے۔

میں گھبرا کر دوبارہ اسی جگہ آنے لگا جہاں میرے جسم کے ٹکڑے پڑے تھے کہ معاً نظر جھاڑیوں کے اندر ہڈیوں پر پڑی۔ میں نے قدرے جرأت کے ساتھ جھاڑیوں کو ہاتھوں سے ہٹانا چاہا تو میرا ہاتھ جھاڑیوں سے سرسراتی ہوئی ہوا کی طرح گزر گیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ تو میری روح ہے جس پر کوئی مادی شے غالب نہیں آتی اور نہ ہی کوئی شے اس کے لئے رکاوٹ بن سکتی ہے میں پورے کا پورا ان جھاڑیوں میں سے گزر گیا اور ان ہڈیوں کو دیکھنے لگا۔ یہ بہت ساری ہڈیاں تھیں۔ میں نے ہڈیوں کی ساخت پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انسانوں کی ہڈیاں ہی ہو سکتی ہیں۔ یہ جن بدقسمت انسان کی بھی ہڈیاں تھیں ان کی کھوپڑیوں غائب تھیں اور سارے اعضاء کی ہڈیاں الگ ہو کر بکھری ہوئی تھیں۔ ہاتھ' پاؤں' کولہے' بازو' پسلی کی ہڈیاں اس بات کا ثبوت تھیں کہ یہ کوئی جوان قدو قامت انسان ہوں گے۔

میں دل فگار لے کر اٹھا اور بے بسی سے آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو اس کی بلندیوں پر بھوکے گدھ اڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں جھاڑیوں سے باہر نکلا اور ایک بار پھر ویران جزیرے کا جائزہ لینے لگا' اس کی لمبی لمبی گھاس میں بھی انسانی ڈھانچے پڑے ملے۔ یہ دیکھ کر میں بدحواس ہو گیا اور ایک فلک شگاف چیخ مار کر گندے جوہڑ کی طرف بھاگ نکلا۔ جونہی میں جوہڑ کے پاس پہنچا تو اس کے گندے اور متعفن پانی پر بھی انسانی ڈھانچے تیرتے دکھائی دیئے۔ یہ دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا اور میری روح پر رعشہ طاری ہو گیا۔ میں اپنے بدن کے ٹکڑوں کے پاس بیٹھ گیا اور اپنی پور پور کو بے جان لوتھڑوں میں دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا میری روح یہ عجیب الفطرت' دردناک اور پراسرار مناظر دیکھ کر تڑپ رہی تھی۔ میں نے اپنے بدن کے چند ٹکڑوں کو ہاتھوں میں لیا اور بے بسی سے انہیں دیکھنے لگا کہ کبھی خاکی بدن کے ان ٹکڑوں میں میری روح کا بسیرا تھا۔ یہ پوریں اور یہ اعضا میرا وجود تھے مگر استاد مراد تیرا اناس ہو تو نے طاغوتی طوفان کو جنم دے کر مجھ سے میرا بدن چھین لیا اور میری بے بس روح کو اپنے خاکی بدن کے ٹکڑوں پر رونے اور بلکنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ میری روح دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میں نے جسم کے ریزوں کو چننا شروع کیا اور بے خیال میں اپنی پور پور جوڑ کر اعضا کی ترتیب لگاتا رہا مگر میں کرچی کرچی بدن کا کوئی عضو بھی نہ بنا سکا۔ میں کسی ایک لوتھڑے اور ٹکڑے کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ ٹکڑا میرے وجود کے کس حصے کا ہو گا۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا' آسمان پر اڑتے ہوئے گدھ اب تیزی سے نیچے اتر رہے تھے۔ وہ جوں جوں ویران جزیرے کے قریب آرہے تھے۔ ان کی وحشیانہ اور پرجوش چیخیں تیز ہو رہی تھیں۔ شاید انہوں نے ویران جزیرے میں کسی نئے مردہ انسان کے گوشت کی بو سونگھ لی تھی۔ سینکڑوں گدھ دیکھتے ہی دیکھتے میرے ٹکڑوں میں بٹے بدن پر ٹوٹ پڑے اور گوشت کا ایک ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے چھینا جھپٹی کرنے لگے۔ اسی کوشش میں گدھ ایک دوسرے پر حملے کرتے۔ یہ بڑے بڑے گدھ تھے۔ ان کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک تھی۔ میرے لئے ایک اور عجیب نظارہ تھا۔ میں ابھی تک اسی جگہ بیٹھا تھا اور گدھ میرے ارد گرد سنگریزوں پہ بکھرے ٹکڑے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ میں نے زندگی میں اتنے خوفناک اور خونخوار گدھ نہیں دیکھے تھے۔ اس سے پہلے صرف ایک بار' استاد مراد کے ساتھ جب راوی پر جانے کا اتفاق ہوا تھا تو وہاں گدھوں کو گوشت کھاتے اور مرداروں کو نوچتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر یہ گدھ تو ایک بھاری جسامت کے انسان کو چونچ میں پکڑ کر اٹھا سکتے تھے۔

گدھ مجھ سے بے نیاز تھے' انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ جس خاکی بدن کے ٹکڑوں کو وہ نگل رہے ہیں اس کی روح ان کے درمیان بے کسی سے بیٹھی ہوئی ہے۔

گدھ ایک دوسرے سے الجھتے' لڑتے ہوئے مجھ پر بھی گرتے تھے مگر انہیں میرے لطیف بدن کا کوئی احساس نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے ان کے چھونے کا کوئی احساس ہوتا تھا۔ میں نے اس دوران ایک پتھر اٹھا کر گدھوں پر پھینکنے کی کوشش کی مگر میرا ہاتھ پتھر کے آر پار ہو گیا اور میں پتھر نہ اٹھا سکا۔ کائنات کے پراسرار پردوں میں ملفوف لطیف ابدان کی دنیا کے انسانوں (روحوں) کی یہ بے بسی نہیں ہوتی تو اور کیا ہوتی ہے' روح جب خاکی پیراہن کی قید سے نکل کر اپنے لباس حقیقی میں آتی ہے تو مادی دنیا کی ہر شے اس کی دسترس میں ہوتے ہوئے بھی اس کی گرفت میں نہیں آتی اور نہ ہی وہ اپنے اس خاکی پیرہن کی حفاظت کر سکتی ہے جس میں وہ برسوں رہ چکی ہوتی ہے۔

میں کوشش کے باوجود اپنے خاکی پیرہن کو نہ بچا سکا اور حسرت ناک انداز میں ان گدھوں کو دیکھتا ہوا اٹھ پڑا۔ میری پیٹھ گندے جوہڑ کی طرف تھی اور میں قدم بہ قدم پیچھے ہٹ رہا تھا' جوہڑ کے اندر تلاطم سا برپا ہوا اور گدھ پھڑ پھڑا کر اڑنے لگے۔ میں نے وحشت بھرے انداز میں پلٹ کر دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔

وہ ایک عجیب الخلقت انسان تھا جو جوہڑ کے درمیان سے نمودار ہو رہا تھا۔ گنجا سر' بڑی بڑی آنکھیں' لمبوترے کان' بڑے اور بھدے ہونٹ' چوڑے نتھنے' پتلی گردن پر بھاری بھرکم سر' اس کی ہیئت کذائی کو ظاہر کر رہے تھے۔ وہ شانوں تک پانی سے باہر تھا۔ اس کی سرخ و ابلیسی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میرا خیال تھا کہ مجھے نہیں دیکھ سکتا ہو گا۔ لہذا میں یکدم الٹے قدموں ہٹنے لگا تو اس کے ہونٹوں پر ابلیسی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے بدحواس ہو کر گدھوں کی طرف دیکھا تو خونخوار گدھ بھی سہمی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ پانی جوں جوں اسے بلند کر رہا تھا اس کا چوڑا چکلا اور لمبے لمبے بالوں سے بھرا ہوا وجود باہر آنے لگا۔ اس کے چہرے کی خباثت اور ابلیسی نقوش انجانی مسرت سے بیدار ہو رہے تھے۔ پھر اچانک اس نے پانی میں چھپے ہوئے اپنے ہاتھوں کو پتوار کی طرح لہرایا اور ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔

"جے کالی ماتا....." اس کی آواز دہشت و کرب سے بھری ہوئی تھی۔ گدھ بے بسی سے پھڑ پھڑا کر رہ گئے اور یکدم ویران جزیرے میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ایسی گھنٹیاں میں نے سندھ کے مندر میں اس وقت سنی تھیں جب وہاں کالے عاملوں کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس کے نعرہ مارنے اور ابلیسی ماحول سے احساس ہو گیا کہ یہ انسان یقیناً کالے علوم کا پجاری ہو گا۔ اس کے چہرے سے نحوست اور ابوالہوسی چھلک رہی تھی۔ میں ابھی تک اسی بدگمانی کا شکار تھا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ رہا ہو گا مگر مجھے کیا معلوم کہ اس کی ابلیسی مسکراہٹ مجھے دیکھ کر ہی پیدا ہوئی تھی۔ میں اس جزیرے سے فرار کی تدبیر سوچنے لگا اور ٹنڈ منڈ کھجور کے درختوں کی طرف بھاگا لیکن اس موٹے مورکھ پجاری کا مکروہ قہقہہ سن کر وہیں رک گیا:

"کہاں بھاگتا ہے بالکے۔"

میں نے سہم کر اس کی طرف دیکھا' وہ اپنے وجود کی غلاظت کے ساتھ جوہڑ سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کا دہانہ کھلا ہوا تھا اور دانتوں سے لیسدار سیال بہہ رہا تھا۔ اس نے لنگی پہنی ہوئی تھی۔ اگر وہ لنگی نہ بھی پہنتا تو اس کے جسم پر گھنے اور لمبے بال اس کا ستر ڈھانپنے کے لئے کافی ہوتے۔ لنگی اس نے تکلف کے طور پر ہی باندھی تھی۔ وہ جوہڑ کے کنارے پر آکر جھکا اور زمین سے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر میرے طرف پھینک کر بولا:

"اپنا ماس تو لیتا جا مورکھ"!

میں یکدم پیچھے ہٹا تو گوشت کا وہ ٹکڑا میرے قدموں کے پاس آ گرا۔ اس نے ابلیسی قہقہہ لگایا اور ترچھی نظروں سے گدھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ کبھی گدھوں کی طرف دیکھنے لگتا اور کبھی میری جانب۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے تو اس نے وحشیانہ انداز میں ناچتے ہوئے اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ اس کے بعد زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر گدھوں کی طرف بڑھا۔ اس وقت جزیرے پر تاریکی چھا گئی تھی اور گھنٹیاں مسحور کن آواز میں بج رہی تھیں۔ آسمان پر تارے نمودار ہو رہے تھے۔ وہ ایک گدھ کے پاس پنچا' گدھ کسی پالتو جانور کی طرح اس کے قدموں میں لوٹنیاں لگانے لگا۔ اس نے گدھ کو گردن سے پکڑا اور اپنے دانت اس میں گاڑ دیئے۔ گدھ وحشیانہ انداز میں چیخا اور پھڑ پھڑایا۔ میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ میں جان چکا تھا کہ یہ وحشی اور ابلیس فطرت پجاری مجھے دیکھ چکا ہے اس لئے اگر میں بھاگا تو مجھے پکڑ لے گا۔ میں خوف سے کانپنے لگا تھا۔ اس نے کافی دیر تک گدھ کی گردن منہ میں دبائے رکھی۔ جب اس کا سارا خون چوس چکا تو گدھ کو یوں پھینک کر ڈکرایا جیسے کوئی انسان گنڈیری چوس کر پھینک دیتا ہے۔ مردہ گدھ کو چشم زدن میں دوسری گدھوں نے نوچ نوچ کر کھا لیا۔

اس مکروہ انسان نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کی وحشت دوچند ہو گئی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور ایک اور گدھ کو اٹھا کر اسی طرح اس کا خون چوسنے کے بعد پھینک کر میری طرف پلٹ آیا۔ اس کی چال میں مستی تھی اور وہ لہک لہک کر میری طرف آ رہا تھا۔

"تراماس تو میری گدھیں کھا گئی ہیں بالکے اور اب میں تیری آتما کو اپنی قید میں کر کے سبزواری کو ناچ کراؤں گا۔" اسکی زبان سے استاد مراد کا نام سن کر میرے لڑکھڑاتے قدم سنبھل گئے۔

"تجھے وہ اس لئے لایا ہے کہ تو کالی ناتھ شیرازی کو مارے گا۔ میرے پربھو کو مارے گا مورکھ۔ اور تو کیا سمجھتا ہے کہ ..... کالی ماتا کا پجاری سورما تیرے استاد کے ہاتھوں آ جائے گا۔ ارے او مورکھ بالکے! تجھے تو مہاراج کی راکھ کا طوفان لے بیٹھا ہے۔ تو ایک جھکڑ نہیں سہہ سکا مورکھ' کالی ناتھ شیرازی کے کالے طوفان کا مقابلہ کیسے کرے گا۔"

"تو کالی ناتھ شیرازی ہے۔" میں ہکلایا۔ اس کی ہئیت کذائی اور درندگی دیکھ کر میری روح بھی خوف سے پھڑ پھڑانے لگی تھی۔

"میں تو سیوک ہوں بالکے! تو کالی ماتا کے پجاری کالی ناتھ شیرازی کے ایک سیوک کا جھٹکا برداشت نہیں کر سکا تو میرے دیوتا سمان استاد سے کیا ٹکرائے گا۔" کالی ناتھ کا سیوک میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تو نے دیکھ لیا کہ اس استھان میں انسانوں کی ہڈیاں پڑی ہیں۔ میرے یہ پالتو گدھ منش کا ماس کھانے کے لئے تڑپتے رہتے ہیں۔ میں اس استھان کا رکھوالا ہوں بالکے۔ یہاں جتنی ہڈیاں تجھے نظر آتی ہیں یہ سب میرے دیوتا سمان کالی ناتھ شیرازی کے بھینٹ چڑھائے ہوئے انسانوں کی ہیں۔"

وہ میرے قریب پہنچا تو میں اس کی دسترس سے نکلنے کے لئے پوری قوت سے بھاگ اٹھا۔ وہ عفریت تھا' اس نے کوئی کھنڈی نما چیز مجھ پر پھینکی اور میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ یہ کوئی سخت چیز تھی جو میری روح کے آر پار ہو گئی اور اس نے مجھے جکڑ لیا۔ یہ دیکھ کر وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا تو وہ بولا "آؤ تمہیں دکھاؤں کہ میرا آقا انسانوں کی بلی کیسے دیتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا۔ کھجور کے درختوں کے پاس پہنچ کر اس نے زور سے زمین پر پاؤں مارا تو زمین دولخت ہو گئی اور اس میں سے ایک سندر سی لڑکی باہر نکلی۔ اس نے سفید لباس پہنچا ہوا تھا۔ وہ نہایت خوبصورت اور ادھ کھلے گلاب کی صورت والی تھی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں یاسیت بھری تھی۔ عفریت نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی طرف کھینچ کر بولا "یہ ہے ہماری ماتا کی شکتی اور آشیرواد۔ جب سورج نکلے گا میں کھانڈے کے ساتھ اس کی گردن کاٹ دوں گا۔ یہ سندر کنواری ناری ماتا کی بھینٹ چڑھا کر اس کے لہو سے اپنے آقا کے پوتر استھان میں بکھیر دوں گا..... ماتا کی شکتی اس استھان میں تیرے جیسے بلیچھ بالکوں کا شمشان گھاٹ بن جائے گی۔"

اس کی لایعنی باتیں سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میں حیران بھی تھا کہ وہ مجھے یہ سب باتیں کس مقصد کے لئے سنا رہا ہے۔ اس لمحہ اس نے ایک ہاتھ سے لڑکی کو پکڑا اور دوسرے سے مجھے تھام لیا تو لڑکی اس کے ہاتھوں میں کسمسائی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر اس کا چہرہ نہایت پرسکون اور تروتازہ تھا۔ مرے دل میں آیا کہ لڑکی کے لئے کچھ کروں۔ میں نے عفریت سے کہا "اتنی خوبصورت اور پیاری لڑکی کو جان سے مار کر تجھے کیا ملے گا۔"

اس نے قہقہہ لگایااور بولا" مجھے اور میرے آقا کو شکتی ملے گی بالکے۔"

"شکتی لے کر کیا کروگے۔ایک دن تو نے بھی مر جانا ہے۔" میں نے جرأت سے کہا۔

"نہیں بالکے' ماتا کی شکتی پانے والے کبھی نہیں مرتے۔" اس نے رعونت سے کہا۔"یہ بات تیرا استاد بھی جانتا ہے کہ کالی ناتھ شیرازی اور اس کے سیوک کبھی نہیں مر سکتے۔"

"کالی ناتھ خود کہاں ہے۔" میں نے پوچھا۔

"میرا آقا ادھر ہے۔وہ دیکھو کالے پانیوں کے اس پار جہاں بادل اس کے استھان پر چھتر بنے رہتے ہیں۔" اس نے مدہوش لہجے میں ایک طرف اشارہ کیا تو رات کے اندھیروں میں بہت دور سے پہاڑ نظر آنے لگا۔اس دوران لڑکی اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگی تو عفریت نے اسے آرام سے زمین پر کھڑا کیا اور دھیرے دھیرے سے مسکرانے لگا۔"مچلتی کیوں ہے ناری، لے تو بھی بھاگ لے۔"

مگر وہ زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔اس کے چہرے کی تازگی پر خزاں طاری ہو گئی۔

وہ بولی" مجھے مت مارو۔مجھے مت مارو،خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔"عفریت اس کی حالت پر قہقہے لگاتا رہا۔اس نے مجھے باندھ کر ایک طرف پھینک دیا۔یونہی روتے بلکتے ہوئے رات گزر گئی۔صبح جب سورج نکل رہا تھا وہ ہم دونوں کو گندے جوہڑ کے پاس لے گیا۔مجھے ایک طرف پھینک کر اس نے لڑکی کو جوہڑ میں اشنان کرایا اور پھر ایک بڑے سے تھال میں لڑکی کو کھڑا کر کے اس کا رخ چڑھتے سورج کی طرف موڑ کر کھانڈا لہرانے لگا۔میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اس تمام عرصے میں پہلی بار اللہ کو یاد کیا۔میری والدہ اور میاں جی بتایا کرتے تھے کہ شیطانی وسوسوں اور شیطان کے جال سے بچنے کے لیے اگر کوئی مسلمان آیت الکرسی پڑھے تو وہ محفوظ رہتا ہے۔مجھے اپنی کم ہمتی پر ندامت ہوئی کہ میں نے عفریت سے بچنے کے لیے اللہ پاک سے مدد کیوں نہیں مانگی۔

زرد زرد روشنیاں مشرق سے نمودار ہو رہی تھیں اور میرے دل میں نور الہیٰ کا یقین ابھر رہا تھا۔میں آیت الکرسی پڑھنے لگا۔پہلے زیر لب پھر اونچی اونچی آواز میں پڑھنے لگا تو عفریت یکدم پریشان اور بدحواس ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔اس کے چہرے کی وحشت بڑھ گئی اور وہ کھانڈا لہراتا ہوا میری طرف بڑھا"اوئے ملیچھ خاموش ہو جا۔"

مگر میں خاموش کہاں ہونے والا تھا۔مدتوں بعد تو مجھے اللہ پاک کو یاد کرنے اور اس سے مدد مانگنے کی توفیق ہوئی تھی۔لہٰذا میں پورے خشوع و خضوع کے ساتھ آیت الکرسی پڑھتا رہا۔ہر بار آیت الکرسی پڑھنے کے بعد عفریت کی طرف پھونک مار دیتا۔عفریت کھانڈا ہاتھ میں لہراتا ہی رہ گیا۔اچانک ایک دیوار سی میرے اور اس کے درمیان آ گئی۔سورج بلند ہو گیا تھا اور عفریت میرے سامنے تڑپ رہا تھا۔اس کے بدن میں آگ لگ گئی تھی۔میرا ایمان مزید پختہ ہو گیا اور میں پورے جذبے کے ساتھ آیت الکرسی کے ساتھ درود پاک بھی پڑھنے لگا۔میری آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ماحول سے بے نیاز ہو کر اللہ کے کلام کو پڑھتا رہا۔میرے اندر اعتماد اور زندگی کی روشنیاں اور توانائیاں پیدا ہو رہی تھیں۔میں جس طلسم میں جکڑا گیا تھا اس کی بندشیں ٹوٹ رہی تھیں اور میرا بدن ایک نئی افزائش پا رہا تھا۔میرا ذہن و جسم بیدار ہو رہا تھا اور قلب و زباں سے کلام الٰہی جاری تھا۔میں لہک لہک کر پڑھ رہا تھا۔جھوم جھوم کر سرمستی و جذب سے اللہ کے کلام کی تاثیر سے فیض یاب ہو رہا تھا۔میرے ذہن و قلب سے غبار چھٹ گیا۔تاریکی سحر میں بدل رہی تھی اور کوئی نادیدہ وجود مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔کوئی پیار بھرے لہجے میں مجھے پکار رہا تھا"ناگی اٹھو! میرے یار تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

مگر میں پڑھے جا رہا تھا۔کلام الٰہی پڑھنے کی مدتوں بعد سعادت نصیب ہوئی تھی۔مجھے بہت دکھوں سے نجات مل رہی تھی۔میرا وہم و خیال ختم ہو رہا تھا۔میری نجاست دھل رہی تھی۔

"ناگی اٹھو۔اٹھو اور دیکھو یہ سب لوگ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔تیری سلامتی کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔" کوئی مجھے مسلسل جھنجوڑ رہا تھا اور میں روح کی سرشاری میں کھویا ہوا تھا۔کچھ دیر تک وہ مجھے یونہی جھنجھوڑتا رہا تو میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں چندھیا گئیں تو میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند رک لیں۔

''اٹھو میرے یار۔ بہت ہو گیا۔ اٹھ میرے بھائی۔'' یہ استاد مراد تھا جو مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔

میں جیسے یکدم حواس میں آ گیا۔ ''میں کہاں ہوں۔'' میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو بہت سے لوگ میرے گرد کھڑے تھے اور ہاتھ اٹھا کر میری سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔

استاد مراد نے میرا ہاتھ تھاما اور پیار بھرے لہجے میں بولا ''میرے یار اپنی دنیا میں واپس آ جا''۔ میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ استاد مراد کی طاغوتی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں اور وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ ''یار تم نے طوفان کو پلٹنے کے لیے اپنی جان کی بازی کیوں لگا دی۔''

''تم وہیں ہو جہاں پہلے تھے۔'' استاد مراد نے کہا اور کچھ لمحے سوچنے کے بعد بولا

''وہ ایک خواب اور سراب تھا میرے یار۔ تم کالی ناتھ شیرازی کے طلسمات کی دنیا میں پھنس گئے تھے۔'' استاد مراد مسکرایا اور میرے کندھے پر تھپکی دے کر بولا ''تو نے اس بدذات عامل کی دنیا دیکھ ہی لی ہے، میرے یار اب اٹھ۔ تجھے اس پاپی کو ختم بھی کرنا ہے۔''

''وہ لڑکی کہاں ہے۔'' میں بے خیالی سے ارد گرد دیکھنے لگا تو معاً نظر سامنے کھڑی ایک لڑکی پر ٹک گئی۔ وہ ہو بہو وہی تھی۔ میں اٹھا اور اس کے پاس پہنچ کر اسے حیرت و مسرت سے دیکھنے لگا۔

''تم زندہ ہو؟ عفریت نے تمھاری بلی تو نہیں چڑھائی۔''

لڑکی سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ استاد مراد میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ''لگتا ہے تیرا دماغ چل گیا ہے۔''

''استاد یہ وہی لڑکی ہے۔ وہی لڑکی ہے۔'' میں قدرے جوش میں بولا۔

''استاد یہ وہی لڑکی ہے جس کی کالی ناتھ کا سیوک بلی دے رہا تھا اور میں۔'' استاد مراد نے مجھے بات پوری نہ کرنے دی اور کھینچتا ہوا بس کی طرف لے گیا۔ ٹرک والا بھاگ گیا تھا اور اب صرف بس ہی رہ گئی تھی۔

''استاد تم میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے۔''

''بہت تماشا ہو گیا ہے۔ ناگی اب خاموش رہو۔ جذبات میں آ کر بہت بڑی غلطی نہ کر بیٹھنا۔'' اس نے سخت لفظوں میں سرزنش کی اور ساتھ ہی بس والے کو اشارہ کیا کہ مسافروں کو بس میں سوار کر کے چلے۔ میں ہونقوں کی طرح کبھی بس کو اور کبھی مسافروں میں اس لڑکی کو تلاش کرنے لگتا جو سہمے سہمے سے بس میں سوار ہو رہے تھے۔ ہم آخری سیٹ پر بیٹھے تھے۔ کچھ مسافر گولیاں لگنے سے زخمی ہو گئے تھے۔ استاد مراد نے بس والے سے کہا کہ وہ تیز رفتاری سے چلے تاکہ زخمیوں کو بروقت ہسپتال پہنچایا جا سکے۔ پوری بس میں سوائے زخمی مسافروں کے سب خاموش اور ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ کوئی ایک کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ لیتا تھا۔ انہیں استاد کی پراسرایت سے خوف آ رہا تھا۔ استاد مراد کے چہرے سے بھی پریشانی مترشح تھی۔ جلد ہی اس نے اپنی پریشانی بھی بتا دی۔

''یار ناگی! ان پراسرار طاقتوں کو سنبھالنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اگر یہ حرام خور آپس میں نہ لڑتے اور اگر لڑے تھے تو کم از کم لڑائی جلد بند کر دیتے تو میں طاغوتی طاقتوں کا استعمال نہ کرتا۔'' وہ پشیمان تھا'' اچھا ہوا تو طوفان کی ڈھال بن گیا ورنہ آج یہاں قیامت برپا ہو جاتی۔ مہاراج کی دی ہوئی یہ راکھ بہت بڑی خطرناک شے ہے ناگی! میں نے اسے آزما تو لیا ہے مگر اب دھڑکا اس بات کا ہے کہ اگر ان مسافروں میں کوئی 'ساوک' کا ایجنٹ ہوا تو ہم دھر

لیے جائیں گے۔'' استاد مراد نے سرگوشی میں شاہ ایران کی جلاد محافظ تنظیم 'ساوک' کے بارے میں بتایا مگر مجھے اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری نظریں تو اس لڑکی کو تلاش کر رہی تھیں۔ جلد ہی میں نے اسے پا لیا۔ وہ اگلی سیٹ پر کسی لڑکے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کی طرف جانے لگا تو استاد مراد نے مجھے پیچھے کی طرف کھینچ کر بٹھالیا اور غرایا ''انسان بنو، کوئی تماشا نہ لگا بیٹھنا۔ یہ ایران ہے۔ یہاں تو انسان اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کرتا اور تم اس لڑکی کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔''

''نہیں استاد میں بھاگ نہیں رہا۔ یہ لڑکی بالکل وہی ہے۔'' میں نے استاد مراد کو سارے واقعات سنائے تو وہ دھیرے سے بولا ''یہ سب کالی ناتھ شیرازی کے طلسمات اور اس کے موکلان کا جادو ہے۔ وہ بڑی پہنچ والا ہے۔ میں گھر پہنچ کر اس بات کا حساب لگاؤں گا کہ ریت کے اس طوفان میں کالی ناتھ شیرازی نے اپنا ہاتھ کیسے دکھایا۔ اب ہمیں یہ سفر خاموشی سے طے کرنا چاہیے تم آرام سے سو جاؤ، تمہارے اعصاب تھکے ہوئے ہیں۔'' مگر مجھ پر استاد مراد کی پند و نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا اور میں چیخ کر بولا'' استاد مجھ پر پابندیاں نہ لگاؤ۔ مجھے لڑکی سے ملنے دو۔'' وہ لڑکی جانتی ہو گی کہ اسے بلی کیوں چڑھایا جا رہا تھا۔''

میری چیخ سن کر سارے مسافر ہڑبڑا کر ہماری طرف دیکھنے لگے تو استاد مراد نے زندگی میں پہلی بار زوردار طمانچہ میرے منہ پر مارا اور بولا ''خاموش ہو جا اور آرام سے بیٹھ جا۔'' اس کے لہجے میں درندوں کی سی غراہٹ تھی۔

میں نے خشمگیں نظروں سے استاد کی طرف دیکھا اور گال سہلا کر رہ گیا۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگا کہ استاد تو نے تھپڑ مار کر اچھا نہیں کیا۔ تو سمجھتا ہے کہ تیرے پاس پراسرار قوتیں ہیں تو بہت تگڑا ہو گیا ہے مگر یاد رکھ میں بھی اب یہ طاقتیں حاصل کر کے رہوں گا اور تیری اس غراہٹ کا جواب دوں گا۔

ڈرائیور بس بہت تیز چلا رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی جب ہم زاہدان پہنچے۔ زخمی مسافروں کو وہاں اتارنے کے لیے بس رکی تو وہ لڑکی بھی نیچے اتر گئی۔

استاد مراد نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولا'' چلو اب نیچے اترو۔'' میں اور استاد مراد لڑکی کے پیچھے پیچھے بس سے اترے۔ لڑکی اکیلی تھی۔ بس کے اڈے سے نکل کر تہران جانے والی اوتوتاش بس سروس کے اڈے پر پہنچی تو استاد مراد کہنے لگا۔

'' ناگی تیرا کام بن گیا۔ لڑکی تہران جا رہی ہے۔ میری بات غور سے سن۔ میں تجھے اس کے ساتھ بٹھا دوں گا مگر یاد رکھنا کہ کوئی ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا کہ مسافر تجھے مارنا شروع کر دیں۔'' استاد مراد کے لہجے میں اب شرارت تھی۔

ہم بھی بس میں سوار ہوئے تو استاد نے اس سیٹ کی طرف اشارہ کیا جس پر وہ تنہا بیٹھی تھی۔ گلابی چہرے والی دبلی پتلی لڑکی ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ میں بے خوفی سے اس کے ساتھ جا بیٹھا تو وہ پہلی بار مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کے چہرے کی تازگی لوٹ آئی تھی۔ میں نے استاد مراد کی طرف دیکھا تو وہ دھیرے سے مسکرا کر بیٹھ گیا۔

باپ نے بیٹی جن کے حوالے کر دی

میں استاد کی ہدایت کے مطابق محتاط ہو گیا تھا۔ جب سفر شروع ہوا تو مجھے لڑکی سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ بندر عباس کی رہنے والی تھی۔ اس کی ماں پاکستانی تھی اور کوئٹہ میں رہتی تھی۔ وہ اکیلی واپس جا رہی تھی۔ اس کا نام سندس تھا۔ کوئٹہ میں ہی پیدا ہوئی اور وہیں پروان چڑھی تھی۔ چونکہ باپ ایرانی تھا اس لیے ایران آتی جاتی تھی۔ وہ باپ سے ملنے بندر عباس جا رہی تھی۔ اس کے باپ نے دو شادیاں کی تھیں۔ دوسری بیوی ایرانی تھی۔ سندس کو سوتیلی ماں اور اس کے بچوں سے بڑا پیار تھا۔ اس لیے وہ سال کے کچھ مہینے بندر عباس میں گزارتی تھی۔ سندس نے مجھے بندر عباس کا پتہ دیا اور وعدہ لیا کہ میں اس سے ملنے وہاں آؤں گا۔ میں نے سندس سے پوچھا کہ اس کا باپ ہماری ملاقات پر اعتراض تو نہیں کرے گا۔ اس نے بتایا "میرا باپ مجھ پر اعتماد کرتا ہے۔ وہ تم سے مل کر خوش ہو گا۔"

سندس بہت پیاری اور میٹھی باتیں کرتی تھی۔ اس کے چہرے کی تروتازگی اور آنکھوں کی یاسیت نے اس سے کی شخصیت کو پیچیدہ بنایا ہوا تھا۔ سوچتی اور کسی کرب ناگہانی میں مبتلا آنکھیں اس کے کسی غم کی مظہر تھیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس سے اس کے اندرونی کرب کی کھوج لگا سکوں مگر وہ ہر بار ٹال جاتی۔ تہران پہنچ کر وہ بندر عباس جانے کے لیے دوسرے اڈے پر چلی گئی اور جاتے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اپنے استاد کے ساتھ اس سے ملنے آؤں۔

☆☆☆☆☆☆

میں تین ماہ تک استاد مراد کے گھر ہی رہا۔ اس دوران وہ مجھے فارسی اور عملیات سکھاتا رہا۔ لیکن چھ مہینے میں کوئی ایک روز بھی ایسا نہ تھا جب سندس میرے خوابوں میں نہ آئی ہو۔ میں نے کئی بار استاد مراد سے کہا ہم ایک بار ہی بندر عباس چلے جائیں۔ آخر ایک روز استاد مراد نے مجھے کہا کہ عملیات کا ساز و سامان لانے کے لیے ہم دونوں بندر عباس جائیں گے۔ میرے تو خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ استاد مراد نے بتایا کہ ہمیں بندر عباس سے آگے فجیرہ جانا ہے جہاں اس کا ایک ہندو دوست سورج مل رہتا ہے۔ وہ افریقہ اور بھارت سے عملیات کی مکروہ اشیاء اسمگل کر کے لاتا ہے۔ سورج مل کالی گھاٹ (انڈیا) کا رہنے والا تھا۔ فجیرہ میں اس نے اڈہ بنایا تھا اور وہاں سے اس کے ایجنٹ ایران کے کالے عاملوں کو یہ سامان پہنچاتے تھے۔ استاد مراد ان دنوں ایک بڑا چلہ کاٹنے کی تیاری کر رہا تھا جس کے لیے وہ سورج مل سے کچھ سامان منگوانا چاہتا تھا۔ استاد کو خدشہ تھا کہ اگر اس نے یہاں سامنے منگوایا تو کالی ناتھ شیرازی کو خبر ہو جائے گی لہٰذا اس نے احتیاط پسندی کا مظاہرہ کیا۔

بندر عباس سمندر کے کنارے آباد ہے۔ اس کے ساتھ دبئی اور فجیرہ کے ساحل لگتے ہیں۔ تہران سے اس کا سفر 25 گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ میں اور استاد دو دن کے لگاتار سفر کے بعد وہاں پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ سمندری علاقہ ہونے کے باوجود سخت گرمی تھی۔ استاد نے مجھے ایران کی سماجی اور سیاسی زندگی کے بارے میں بہت کچھ سمجھا دیا تھا اور مجھے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

استاد مراد کو میرے تجسس و اضطراب اور بے کلی کا احساس تھا لہٰذا اسی شام اس نے سندس کا گھر تلاش کر لیا۔ ساحل کی جانب ایک کشادہ مگر بوسیدہ سا حویلی نما گھر تھا۔ درختوں اور پھولوں نے اسے چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ موسم ٹھنڈا تھا اور نم آلود ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ سندس کے گھر کا نظارہ دلوں کو مسحور کر دیتا تھا۔ گھر کے باہر ایک دربان بیٹھا ہوا تھا۔ استاد مراد نے اسے میرے بارے میں بتایا کہ یہ لڑکا کوئٹہ سے آیا ہے اور سندس بی بی سے ملنا چاہتا ہے۔ دربان اکھڑ مزاج تھا، اس نے پہلے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر پاٹ دار آواز میں کہا "تم اس وقت بی بی سے ملنے کیوں آئے ہو۔ اس وقت جاؤ اور اگر ملنا ہی ہے تو صبح سویرے چلے آنا۔"

ہم نے صبح فجیرہ جانا ہے۔ اس لیے ان سے آج ہی ملنا ہے۔" استاد مراد نے کہا۔ "اگر تم نے سندس بی بی کو اطلاع نہ دی تو پھر جب انہیں معلوم ہو گا کہ تم نے ہمیں ان سے ملنے نہیں دیا تو وہ تم سے ناراض ہوں گی۔"

''ناراض ہوتی ہیں تو ہوں مگر ہم اصول نہیں توڑ سکتے۔ رستم صاحب کا حکم ہے کہ رات کو اگر اس کا بھائی بھی ملنے آئے تو اسے واپس بھیج دیا جائے۔''

یہ عشاء کا وقت تھا اور ابھی شہر کی روشنیاں پوری آب وتاب کے ساتھ جل رہی تھیں۔ بازاروں اور گلیوں میں بھی چہل پہل تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ شہر کے مکین بھی جاگ رہے تھے۔

''بھائی یہ لڑکا اتنی دور سے ملنے آیا ہے اور ابھی کوئی زیادہ وقت بھی نہیں ہوا۔ گھر کی بتیاں بھی روشن ہیں اس لیے تم جاؤ اور نہیں اطلاع دو۔ اگر تمھیں رستم صاحب کا ڈر ہے تو مجھے ان کے سامنے کر دینا کہ میں نے تمھیں یہ اصول توڑنے پر مجبور کیا تھا۔''

مگر اس نے استاد مراد کی بات چٹکی میں اڑا دی اور تنبیہ کی'' تم دونوں دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا''۔

یہ سن کر استاد بپھر گیا۔ اس کی طاغوتی آنکھوں میں وحشت عود آئی۔ میں نے جھٹ سے استاد کے کندھے پر ہاتھ رکھا''نہیں استاد، یہاں کوئی تماشا نہ لگانا۔''

اس نے گہری سانس بھری اور کہا''چلو واپس چلتے ہیں، صبح آ جائیں گے۔''

ہم دونوں پلٹے اور ابھی چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ کوئی بھاری بھر کم پرندہ ہمارے سروں کے اوپر سے گزرا اور گھر کے درختوں کے اوپر جا کر بیٹھ گیا۔ پرندے کا ہمارے سروں کے اوپر سے گزرنا شاید قابل توجہ اور حیرت انگیز بات نہیں تھی مگر اسی لمحے ناگوار سی بو اور کراہت کا ماحول میں احساس پیدا ہوا۔ استاد مراد تو ہوا کو سونگھ کر بتا سکتا تھا کہ یہاں سے ابھی کون گزرا تھا۔ اس کی قوت شامہ اور اسرار کے پردوں میں نادیدہ وجود تلاش کرنے کی حس بہت تیز تھی۔ وہ یکدم پلٹا اور اس درخت کو دیکھنے لگا۔

اس لمحے دوا اور چونکا دینے والی باتیں رونما ہوئیں۔ گھر کی بتیاں گل ہو گئیں اور دربان نے ہڑبڑا کر دروازہ بند کر دیا۔

''وہ کیسی بو تھی۔'' میں نے اس کو فضا سونگھتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

''ناگی! معاملہ پراسرار ہے۔'' اس کے حلق سے غراہٹ نکلی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک بار پھر دروازے کے پاس گیا۔ دروازہ زیادہ اونچا نہیں تھا، اس نے ایڑیاں اٹھا کر اندر جھانکا تو ستاروں کے روشن ماحول میں اسے چوکیدار درختوں کی جانب جاتا ہوا دکھائی دیا۔

اس لمحے گھر کے شمالی جانب والے کمرے کی روشنی جلنے اور بجنے لگی اور ساتھ ہی کافور، عنبر اور اگربتی کے جلنے کی بو آنے لگی۔ استاد مراد کی وحشت اب بڑھنے لگی۔ اس نے دروازے کو کسی طرح کھول لیا اور اندر داخل ہونے لگا۔ مجھے بھی اس معاملے میں دلچسپی ہونے لگی اور ہم دونوں نہایت خاموشی کے ساتھ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے اندر جانے لگے کہ معاً درختوں پر بیٹھا وہی پرندہ پھڑ پھڑایا اور قیامت خیز شور پیدا ہوا۔ اس نے غالباً ہمیں دیکھ لیا تھا لہٰذا وہ چیخنے لگا تو معلوم ہوا کہ وہ گدھ ہے۔ یہ گدھ بالکل ویسا طاغوتی تھا جیسا مجھے خواب میں دکھائی دیا تھا۔ استاد نے اس دوران چند عمل پڑھ کر مجھ پر پھونک دیئے اور ہم بڑی خاموشی کے ساتھ اس کمرے کے پاس پہنچ گئے جس کی بتی جل بجھ رہی تھی۔ اس کی ایک بڑی سی کھڑکی باہر کو کھلتی تھی۔ خوشبوئیں اس کمرے سے آ رہی تھیں۔ استاد نے کھڑکی پر ہلکا سا داؤ ڈال کر اس کا ایک پٹ تھوڑا سا کھول دیا اور اندر کا ماحول دیکھنے لگا۔ گدھ بدستور درختوں پر چلا رہا تھا۔ استاد نے اس کی پرواہ نہ کی اور اندر دیکھتا رہا۔

اندر کا ماحول دیکھ کر احساس ہو رہا تھا کہ کوئی عامل کسی عمل کی تیاری کر رہا ہے اور جس طرح بتی روشن ہو کر بجھ رہی ہے وہ یقیناً موکلان وجنات کی حاضری کے لیے جلائی بجھائی جا رہی ہے۔

استاد نے مجھے بھی اندر دیکھنے کے لیے کہا۔ یہ وسیع و عریض کمرہ تھا جس کے درمیان میں ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ سفید لبادے میں ملبوس ایک شخص دیوار کے پاس کھڑا تھا اور بار بار روشنی جلا اور بجھا رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چٹائی پر آ کر بیٹھ گیا اور چار موم بتیاں روشن کر کے شمال کی جانب منہ کر کے بیٹھ گیا۔ کمرے میں اب خاصی روشنی ہو گئی تھی۔ اس نے جس جانب منہ کیا تھا اس جانب کی دیوار پر شاہ ایران کی قد آور تصویر آویزاں تھی۔ سفید پوش شخص اٹھا، اس نے ایک موم بتی تصویر کے نیچے رکھ دی اور پھر نہایت عقیدت کے ساتھ اس کے سامنے جھکا پھر وہ دروازے کے پاس گیا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

اسی لمحے کمرے میں بھونچال آنے لگا۔ کوئی بھاری بھرکم وجود کمرے میں کود آیا تھا۔ اس نے سر سے پاؤں تک خود کو کالے چوغے میں چھپایا ہوا تھا اور بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ یکایک اس نے گہری سانس بھری اور گمبھیر آواز میں بولا "اندر آ جاؤ، باہر کیوں کھڑے ہو۔"

میں نے استاد مراد کا بازو تھام لیا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے مگر استاد مراد نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور وہی سفید لبادے والا ایک جوان لڑکی کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ بلاشبہ سندس تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ معصوم گلابی چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں اور چال میں مردنی چھائی ہوئی تھی۔ سفید لبادے والا اسے سہارا نہ دیتا تو یقیناً وہ گر پڑتی۔

"آ جا سندس، آ جا کالے چوغے والا بولا۔ سفید لبادے والے نے اسے چٹائی پر بٹھایا اور خود کالے چوغے والے کے سامنے جھک گیا۔ اس نے اسے تھپکی دی اور وہ جس طرح اندر آیا تھا اسی طرح باہر چلا گیا۔ اب کمرے میں سندس تھی اور وہ کالے چوغے والا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کوئی غیر مرئی چیز ہے۔ سندس کو اس حالت میں دیکھ کر میرے دل پر چھریاں چلنے لگیں اور میں بے چین سا ہو رہا تھا۔ کالے چوغے والا سندس کے بالوں کو سہلانے لگا پھر اسے چٹائی پر لیٹ جانے کے لیے کہا۔ سندس کسی سحر زدہ موکل کی طرح لیٹ گئی۔ سیاہ چوغے والے نے ایک موم بتی اٹھائی اسے سندس کے سرہانے کی جانب رکھا اور باقی موم بتیاں گل کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سیاہ چوغا اتار پھینکا اور کمرہ اس کے وجود کی حرارت سے دھک اٹھا۔ میں نے بے قراری سے استاد مراد کا ہاتھ پکڑ لیا تو اس بار اس نے مجھے کھڑکی سے پیچھے ہٹا لیا۔ پرندہ مسلسل درخت پر پھڑ پھڑا رہا تھا اور اس کی چیخوں میں اب مدہوشی سی عود آئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ترنگ میں ہے اور مستی سے چہک رہا ہے۔

"استاد وہ کون ہے اور سندس کے ساتھ کیا کرنا چاہ رہا ہے"۔ میں نے بے قراری سے پوچھا۔

استاد نے جو بات بتائی اسے سن کر میرے رگ و پے میں آگ لگ گئی"۔

"استاد اگر یہ بات ہے تو خدا کے لیے سندس کو اس شیطان سے بچا لے"۔ میں تقریباً روہانسا ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ عفریت سندس کو ہوس کا نشانہ بنانے لگا ہے۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ سرکش جنات عورتوں کو ایذا پہنچاتے ہیں لیکن مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا مگر اس وقت میری گناہ گار آنکھیں ایک سرکش اور شیطان صفت جن کو دیکھ رہی تھیں جو سندس کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے جا رہا تھا۔ میں نے استاد مراد سے کہا

"استاد میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد تو جو کہے گا میں وہی کروں گا مگر سندس کو بچا لو۔"

استاد مراد نے مجھے تسلی دی اور کہا "میرے استاد اللہ نے چاہا تو یہ بدبخت اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا"۔ اس کے ساتھ ہی استاد نے عملیات کی پٹاری کھولی اور مجھ سے کہا حالات کا کوئی پتہ نہیں کہ کس کے حق میں جائیں۔ یہاں عفریت کے ساتھ ساتھ ابلیس نما انسان بھی ہیں جن کا مقابلہ کرنے کے لیے طاقت کی بھی ضرورت ہو گی۔ تم ادھر جم کر کھڑے ہو جاؤ۔ جو بھی سامنے آئے اس کی ٹانگیں توڑ دینا۔ باقی میں سنبھال لوں گا"۔

استاد مراد نے مجھے سمجھاتے ہوئے میرے گرد حصار قائم کر دیا اور پھر ایک دم کھڑکی کے پٹ کھول کر اندر کود گیا۔ درخت پر بیٹھا پرندہ جو کیف و مستی میں ڈوبا چہک رہا تھا، یکدم چیخنے لگا اور اس کی وحشت عود آئی۔ اور وہ چیختا ہوا مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس کے نوکیلے آہنی پنجوں سے لہو ٹپک رہا تھا اور زرد طاغوتی آنکھوں میں وحشت تھی۔ جونہی وہ مجھ پر جھپٹنے کے لیے حصار کے علاقے میں داخل ہوا۔ اس کے پروں میں آگ لگ گئی اور وہ دھڑام سے مجھ سے چار قدم پیچھے گر گیا۔ معاً کمرے میں طوفان برپا ہو گیا۔

"سبزاری چلا جا، میں کہتا ہوں چلا جا ورنہ تجھے بھسم کر دوں گا۔ میں کالی ناتھ شیرازی کا موکل ہوں۔ اگر تو نے مجھے مارنے کی کوشش کی تو میں سندس کو مار ڈالوں گا"۔ یہی وہ لمحات تھے جب گدھ کے پروں میں آگ لگی تھی اور اندر عفریت چلانے لگا جواب میں استاد نے کوئی عمل، پڑھ کر اس پر پھونک ماری تھی اور وہ عفریت چیخنے چلانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے سندس کو پکڑنا چاہا تو استاد نے مراد نے اسے تنبیہہ کی

"خبردار لڑکی کو اپنے ناپاک ہاتھ نہ لگانا"۔

جواب میں عفریت نے قہقہہ لگا لیا اور زور سے پکارا

"جے کالی ناتھ..... رستم"۔ اس کی آواز کرب و وحشت میں ڈوبی تھی۔ کمرے کا دروازہ زوردار دھماکے سے کھلا اور اسکے ساتھ ہی سندس کی چیخ سنائی دی۔

عملیات کی دنیا میں پہلا قدم

استاد مراد نے ساتھ ہی لذت آمیز سسکاری بھری۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے سوچا استاد عفریت کا نشانہ بن گیا ہے لیکن استاد عملیات پڑھ رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی رستم اندر آیا اور اس نے سندس کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا جس کے جواب میں استاد نے عفریت کو پکڑنے کے لئے علم کی دھونی سلگائی اور اس کے اندر کا وحشی درندہ عود آیا۔ وہ سسکاریاں بھرتا ہوا عفریت پر جھپٹا۔

اندر اب باقاعدہ جنگ شروع ہو چکی تھی۔ استاد مراد عفریت کے ساتھ الجھا ہوا تھا اور رستم سندس کو پکڑنے کے لئے طاقت کا استعمال کر رہا تھا۔ یکایک مجھے خیال آیا کیوں نہ میں حصار سے نکل کر رستم کو پکڑ لوں تاکہ استاد مراد کی توجہ صرف عفریت ہی پر مرکوز رہے۔

گدھ میری آنکھوں کے سامنے جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ لہذا میں بھی بے دھڑک اندر کود گیا۔ سندس نے مدہوش نظروں سے میری طرف دیکھا۔ رستم اس وقت استاد مراد کو پیچھے سے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ قد آور اور مضبوط بدن کا مالک تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ایک زوردار مکا اس کی گدی پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا اور تڑپنے لگا۔ میں نے اسے پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا اور اسے ادھ موا کر کے چھوڑ دیا۔ اس کی اپنی حالت کسی عفریت سے کم نہ تھی۔ چہرہ سیاہ اور بھیانک تھا۔ آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ عفریت کسی پلے کی طرح چٹائی پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور استاد مراد دونوں ہاتھ کھولے منہ میں مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں اور آنکھوں سے ایک طلسماتی روشنی نکل کر عفریت کے گرد حلقہ بنا رہی تھی۔

میں سندس کے قریب گیا اور اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا "سندس! اب تم محفوظ ہو ہم نے اس شیطان کو پکڑ لیا ہے۔"

اس نے خالی خالی اجنبی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اسی لمحے استاد مراد کی دہشت ناک آواز گونجی "ناگی..... لڑکی کو مت چھیڑنا۔"

میں نے حکم کی تعمیل کی اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

کمرہ اب خوشبودار دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ استاد نے عفریت کو قابو کرنے کے لئے موم بتیوں سے دھونی سلگائی تھی۔ اس نے ایک موم بتی اپنے اور عفریت کے درمیان رکھی اور مجھے مخاطب کیا "ایک موم بتی اٹھاؤ اور اس تصویر کو جلا دو۔"

میں نے موم بتی اٹھائی اور دیوار پر لگی شاہ ایران کی تصویر جلا ڈالی۔ تصویر جل کر نیچے گری تو اس کے پیچھے دیوار میں ایک بڑا سا سوراخ نظر آیا جس میں ایک دیا روشن تھا۔ دیئے کے پاس ایک چھوٹی سی پوٹلی پڑی تھی۔ میں اسے پکڑنے ہی لگا تھا کہ استاد مراد نے مجھے ہاتھ لگانے سے روک دیا۔ اس دوران استاد نے عمل شروع کیا۔ اسے کمرے میں اپنے مقصد کی چیزیں مل گئی۔ اس نے فتیلہ سلگایا اور اس کا دھواں عفریت کی جانب پھونکوں سے پھینکنے لگا۔ جونہی دھواں عفریت تک پہنچتا وہ اپنے آپ کو نوچنے لگتا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ پورا فتیلہ جل جانے کے بعد استاد مراد اٹھا اور اس نے اپنی جیب سے وہ چھوٹی سی ڈبیا نکالی جس میں گرو مہاراج کی دی ہوئی راکھ تھی۔ استاد نے چٹکی بھر راکھ عفریت پر پھینکی تو نارنجی رنگ کا ایک شعلہ بلند ہوا۔ عفریت نے دلدوز چیخ ماری اور جل کر راکھ ہو گیا۔ استاد مراد نے اس کی راکھ ایک پڑیا میں بند کی اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"استاد اس کا کیا کرنا ہے؟" میں نے بے ہوش رستم کی طرف اشارہ کیا۔

"ہوں۔" اسے دیکھ کر استاد کے اندر کا عفریت پھر جاگ اٹھا۔ "اس کا کریا کرم بھی کر کے ہی جاتے ہیں۔"

وہ اسے مارنے کے لئے آگے بڑھا تو سندس یکدم چیخنے لگی اور دوڑ کر استاد مراد کے ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''میرے باپ کو نہ مارنا۔'' اس کی اداس اور بے ثبات آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

استاد نے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولا''تو جانتی ہے کہ تیرا باپ کیسا انسان ہے؟''

''ہاں جانتی ہوں' مگر ہے تو میرا باپ۔'' سندس روتے ہوئے بولی۔

''تیرا باپ تجھے اپنے کالے علم کی بھینٹ چڑھاتا رہا ہے۔ وہ اپنے گرو اور شیطان کو خوش کرنے کے لئے تیری عصمت کا سودا کر چکا تھا پھر بھی تو اس گندے شخص کو بچا رہی ہے۔ یہ پاپی ہے' شیطان ہے ایسے لوگ باپ نہیں ہوتے صرف شیطان ہوتے ہیں شیطان.....'' استاد مراد نے نفرت سے بے ہوش رستم کو ٹھوکر ماری۔

''اس کے باوجود میں اسے اپنی نظروں کے سامنے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔'' سندس کے لہجے میں التجا بھی تھی اور درد بھی..... ایک ایسا درد جس کی وجہ سے ستم ظریف بیٹیاں باپ کا ظلم سہنے کے باوجود اس پر کوئی افتاد گرتے نہیں دیکھ سکتیں' جوان کے اندر حسرت و رحمدلی کے جذبات سے نمو پاتا ہے۔

استاد مراد نے رستم پر تھوکا اور غراتے ہوئے بولا

''سندس تم کہہ رہی ہو تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں مگر یہ شیطان نہیں بدلے گا۔''

یہ کہہ کر استاد مراد باہر نکلنے لگا تو میں نے دیئے کی طرف توجہ دلائی۔ اسے دیکھتے ہی استاد کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ اس نے سوراخ سے وہ پوٹلی اٹھائی اور دیا بجھا دیا۔ اس نے پوٹلی جیب میں ڈالی اور باہر نکل آیا۔ میں اور سندس بھی باہر نکلے تو استاد مراد کہنے لگا''سندس تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں کوئٹہ جانا چاہتی ہوں۔'' وہ نقاہت کے عالم میں بولی۔

استاد مراد اس کی حالت دیکھتے ہوئے بولا''تم میرے ساتھ چلو..... جب ٹھیک ہو جاؤ گی تو کوئٹہ بھیج دوں گا۔''

سندس ہمارے ساتھ چل پڑی۔

استاد مراد ہمیں گنجان آباد علاقے کے ایک مکان میں لے گیا۔ یہ مکان چھوٹا اور تاریک تھا۔ اس کی فضا میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ استاد نے بتایا کہ اس کا دوست سورج مل جب عملیات کے لئے سامان لاتا ہے تو یہاں رکھتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بو ان مکروہ اشیاء کی ہو گی۔

وہ رات اور اگلی صبح ہم نے اسی مکان میں گزاری۔ جب عصر کا وقت ہوا تو میں نے استاد سے کہا''استاد سندس بیمار ہے۔ اس کا علاج کرانا بہت ضروری ہے۔''

''ہاں اس کا علاج کرانا واقعی بہت ضروری ہے۔'' وہ فکر آمیز انداز میں بولا۔''لیکن میں لڑکی کو ابھی باہر لے کر نہیں جانا چاہتا۔ اس لئے گھر ہی میں اس کا علاج کرنا پڑے گا۔''

''تو پھر علاج کیسے کیا جائے؟''

''اس کا علاج تم کرو گے ناگی''

استاد مراد کی بات سن کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''ہاں ناگی! سندس کا علاج تو ہی کرے گا۔'' اس نے پھر کہا۔

''مگر استاد میں علاج کیسے کر سکتا ہوں؟'' میں اس کی بات سن کر الجھ گیا۔'' مجھے نہ تو کسی دوائی کی سمجھ ہے نہ کسی عمل کی۔''

''پہلے میں تجھے سکھاؤں گا پھر تم اپنی سندس کا علاج کرنا۔'' استاد مراد کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ میں نے سندس کی محبت کی خاطر اپنی زندگی کا پہلا عمل استاد مراد سے سیکھا۔

سندس پر جن وشیاطین نے قبضہ کر رکھا تھا اور ان کے اثرات بہت گہرے تھے۔ استاد مراد نے سندس کو بھی ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ استاد مراد اگر چاہے تو خود بھی سندس کا علاج کر سکتا تھا مگر اس نے علوم مخفی سے میری دلچسپی بڑھانے کیلئے سندس کو استعمال کیا۔ وہ نہایت گھاگ اور کایاں تھا۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں یہ عمل پورا نہ کر سکا تو وہ خود اس کا علاج کرے گا۔ استاد مراد نے اس رات' جب میں یہ عمل شروع کیا' پورے گھر کے گرد حصار قائم کر دیا۔ اس نے مجھے اور سندس کو عمل کے بارے میں سمجھایا اور میرے سامنے ضروری سامان رکھ دیا۔ میں باوضو ہو کر ایک سفید چٹائی پر بیٹھ گیا۔

سندس میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے زرد چہرے اور متورم آنکھوں میں وحشت وخوف کی ملی جلی کیفیت تھی۔ میں نے سامان ترتیب سے رکھا اور ایک چھوٹے سے کاغذ پر نقش لکھا۔

اللّٰھم احرق الشیاطین

ھذا التکسیر

نقش بنانے کے بعد میں نے اس کا فتیلہ بنایا اور فتیلہ کو کلھم بحق کے کونے کی طرف سے شروع کیا اور اظہر کے کونے پر ختم کیا۔ پھر اظہر کی طرف سے ہی فتیلے کو روشن کیا مگر پہلے اظہر والے کونے پر سیاہی کا ایک نشان ڈال دیا۔ روشن کرنے سے پہلے روئی میں فتیلہ لپیٹا' کورے چراغ میں چنبیلی کا تیل ڈال کر اسے روشن کیا اور سندس سے کہا کہ وہ اس کی طرف دیکھے۔ ہم مغرب کے وقت بیٹھے اور عشاء تک میں یہ عمل دہراتا رہا۔ فتیلہ جلنے سے ماحول میں خوشگوار مہک پھیل گئی اور اس کی روشنی بتدریج تبدیل ہونے لگی۔ یہ عمل صرف ایک روز کا نہیں تھا۔ جب تک سندس کو فتیلے کی اصل روشنی نظر نہ آتی ہمیں یہ عمل کرتے رہنا تھا۔ پہلے روز ہم نے ڈیڑھ گھنٹہ تک فتیلہ روشن کیا مگر اگلے روز صرف ایک گھنٹہ تک فتیلہ جلایا۔ تیسرے روز سندس نے فتیلے کی اصل روشنی تلاش کر لی اور اس کا چہرہ کھلتے گلاب کی مانند نظر آنے لگا۔ آنکھوں میں تروتازگی لوٹ آئی اور اس کے لبوں پر پہلی بار مسکراہٹ ابھری۔

میرا عمل پورا ہوا اور میں اس حیرت انگیز عمل کا کرشمہ دیکھ کر مسرور ہو گیا۔ استاد مراد نے مجھے شاباش دی اور کہا'' ناگی! لگتا ہے ہمیں اس مکان میں ٹھہر کر کچھ اور بھی کام کرنے ہوں گے۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا!"ناگی بعض عامل بڑے خوش بخت ہوتے ہیں۔ تیرے اندر عملیات کے سوتے پھوٹ چکے ہیں۔ بظاہر تو انہیں نہیں دیکھ سکتا لیکن میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ لہذا میں تجھے وقت کی نزاکت کے پیش نظر یہ تجویز دوں گا کہ سب سے پہلے تو اپنے ہمزاد کو اپنے قابو میں کر۔ اس ہمزاد کو جو تیرے پاس ہے۔"

"ہمزاد؟ میرا ہمزاد کون ہے.....؟ میں نے ارد گرد نظر دوڑا کر دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا" یہاں تو میرا کوئی ہمزاد نہیں۔"

عملیات کی دنیا میں باقاعدہ وارد ہونے سے قبل میں ہمزاد کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر اس روز استاد مراد نے ہمزاد اور تسخیر ہمزاد کے بارے میں مجھے تفصیل کے ساتھ سمجھایا۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ کو بھی علوی اور سفلی دنیا کے اس پراسرار وجود کے بارے میں بتادوں جو ہر عامل کے ساتھ سایہ بن کر رہتا ہے اور اس کا حکم بجالاتا ہے۔ ہر عامل کا ہمزاد اس کے علم کی طاقت سے دوگنی قوت رکھتا ہے یعنی اگر ایک عامل ایک من وزن اٹھا سکتا ہے تو اس کا ہمزاد دو من وزن اٹھانے کی قوت رکھتا ہے۔

ہمزاد کی تلاش

عملیات کی پراسرار دنیا میں تسخیر ہمزاد کے کئی طریقے ہیں اور اس ضمن میں اختراعات بھی ہیں۔ ہمزاد کے تصورات کے بارے میں چند باتیں ہیں۔ ہمزاد کی حقیقت کے بارے میں ہر انسان کا الگ الگ خیال ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمزاد ہر وقت انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی مرتا ہے۔ بعض اسے شیطان کہتے ہیں کیونکہ آدمی کو برے کاموں میں لگاتا' اور نیک کاموں سے روکتا ہے اور مرنے کے بعد بھوت پریت بن جاتا ہے۔ اس ہمزاد کی وجہ سے انسان گناہ کرتا ہے۔ اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ اگر انسان مر جائے پھر بھی زندہ رہتا ہے اور انسان کی روح کے جسم سے الگ ہونے پر بھی انسان سے جدا نہیں ہوتا۔ اس کو لوگ 'بھور' کہتے ہیں۔ چند خیال کرتے ہیں کہ ہمزاد کا جسم لطیف انسان کا سایہ ہے اور یہی سایہ جب کسی اور شکل میں ڈھل جاتا ہے تو بات چیت کرتا ہے' چلتا پھرتا ہے اور کام کاج وغیرہ کرتا ہے اور مرنے والے کا ہمزاد مرتا نہیں ہے۔ چنانچہ جو عملیات مردوں کے لئے کئے جاتے ہیں ان سے وہ زندہ ہو کر چلنے پھرنے لگتا ہے۔

کچھ عامل کہتے ہیں کہ ہمزاد مرنے والے کا نہیں ہوتا بلکہ عامل کا ہمزاد مرنے والے میں داخل ہو کر کام کاج کرتا رہتا ہے۔

ہمزاد مختلف قسم کی طاقتیں اور اختیارات رکھتا ہے وجہ یہ ہے کہ جو جیسے کام کرے گا ویسے ہی کر دے گا۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر آدمی کا ہمزاد ایک علیحدہ قوت رکھتا ہو۔ بلکہ وہ ہر کام میں ایک خاص اثر رکھتا ہے۔

اول درجے کے ہمزاد کا یہ کام ہوتا ہے:

☆ہر ایک جگہ کا پتہ دینا اور جو کام وہاں پر ہوتا ہے یا ہو رہا ہے اس کی اطلاع دینا۔

☆وہ چیزیں لانا جو عامل کے ملک میں نہیں ہوتیں مثلاً ہری سوگی الائچی' لونگ' بادام وغیرہ

☆ہر ایک مرد و عورت کے دل میں ایک دوسرے کے لئے محبت پیدا کرنا اور ورغلا کر کسی قسم کا فساد برپا کرنا۔

☆حکم دینے پر جس کے گھر چاہے اینٹیں' پتھر وغیرہ برسانا۔

دوسرے درجہ کے ہمزاد یہ کام کرتے ہیں:

☆کسی دوسری جگہ کی خبر لانا اور اطلاع دینا۔

☆چھوٹی چھوٹی چیزیں قیمت ادا کر کے لانا۔

☆جس چیز کو جہاں چاہے پہنچا دینا۔

تیسرے درجے کے ہمزاد کی قوتیں یہ ہیں:

ہر شخص کے ضمیر کی آواز عامل کو ہمزاد کے ذریعہ معلوم ہو سکتی ہے۔ اس لئے عامل کسی کی بھی مرضی جان سکتا ہے۔ کسی پوشیدہ طریق سے لوگوں کی خبر دینا اور شہرت بڑھانا۔

ہمزاد سے کئی خرابیاں بھی سرزرد ہیں مثلاً اول درجے کا ہمزاد زندگی میں ہر برا کام کرنے سے روکتا ہے اور کوئی بھی کام سرانجام نہیں ہونے دیتا۔ ہر وقت خیالات کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے اور جب اس کا دل مر جاتا ہے بعض آدمیوں کے جسم میں حلول کر جاتا ہے۔

دوسرے درجے کا ہمزاد انسان کو چوری کرنا سکھاتا ہے اور ہر وقت فکر میں ڈالے رکھتا ہے۔ ہر قسم کی خوشی منانے سے روکتا ہے اور عامل پر برائی کے آثار پیدا کرتا ہے۔ انسان کو دلیری کے اختیارات دیتا ہے۔ تاہم گندہ رہتا ہے اور ایک لباس رکھنے کو پسند کرتا ہے۔ عامل تو یہ چاہتا ہے کہ اپنی زندگی کو بہتر بناؤں لیکن ہمزاد کہتا ہے کہ جس طرح اس نے مجھ پر تمام عمر حکومت کی ہے اس طرح میں اس سے بدلہ لوں گا۔ خلاصہ یہ کہ روح اور ہمزاد میں ایک قسم کا مقابلہ ہو جاتا ہے' اس میں خواہ روح کامیاب ہو یا ہمزاد۔

تیسرے درجے کا ہمزاد مرنے کے بعد عامل پر قابو نہیں پا سکتا مگر اسے غمگیں کر دیتا ہے۔ ہر وقت اس کے دل میں ڈر رہتا ہے اور اگر کسی کے گھر جائے تو بڑا ڈرتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ مجھے کوئی مار دے۔

مطلب یہ کہ ہر وقت موت سے ڈرتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں لیکن اپنی زندگی کو خراب کرتے رہتے ہیں اور خدا کو بھول جاتے ہیں۔ ہر وقت لالچ کے پھندوں میں پھنسے رہتے ہیں جس سے ان کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔

میں یہاں واضح کر دوں کہ صرف دو ہی عملیات رائج الوقت ہیں..... ایک علوی عملیات اور دوسرے سفلی علوم۔ علوی عملیات پاکیزہ علوم پر مبنی ہوتے ہیں جبکہ سفلی علوم کو کالا علم کہا جاتا ہے یعنی ایسا علم جو شیطان کی بیعت کے بعد حاصل کیا جاتا ہے۔ سفلی علوم سیکھنے والوں میں مسلمان بھی غیر مسلموں سے کم نہیں۔ لہذا جب میں نے یہ سنا کہ رستم نے کالی ناتھ سے کالے علوم سیکھے ہیں اور ان علوم کی انتہا تک پہنچنے کے لئے اس نے اپنی خونی رشتوں کو بھی قربان کر دیا ہے تو مجھے بے حد غصہ آیا۔

کالی ناتھ نے اس روز اسے دیوی منتر کا جاپ کرنے کیلئے تجریش کی کالی قبروں میں چھپایا ہوا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں اسی وقت وہاں جاؤں اور اسے کتے کی موت مار ڈالوں۔ رستم جیسے لوگ ہی مسلمانوں کو بدنام کر رہے ہیں۔ لوگوں کو نہیں معلوم کہ سفلی علوم سیکھنے کیلئے انسان کو بدی و گناہ کی کن کن ذلتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جو لوگ ذلتیں فخر کے ساتھ برداشت کرتے ہیں ان میں غیرت نام کو نہیں ہوتی۔ استاد مراد نے مجھے بتایا تھا کہ سفلی عاملوں کا عقیدہ ہے کہ جو عامل بھی کالی قبروں میں بیٹھ کر پچاس ہزار دفعہ جاپ کرتا ہے اسے شمشانک دیوی ایک خوشنما لباس عطا کرتی ہے۔ اس عمل کے لئے عامل برہنہ بیٹھ کر جاپ شروع کرتا ہے۔ جب وہ جاپ کے مخصوص الفاظ کی تعداد پوری کر لیتا ہے تو اپنے پاس رکھے شراب کے پیالے سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ اسی دوران دیوی حاضر ہوتی ہے اور اس بے لباس کو لباس پہنا کر اسے اپنی شکتی دیتی ہے۔

دھن کی تپسیا کا عمل

سفلی عاملوں کے لئے شراب تو عام پانی کی حیثیت رکھتی ہے۔اس دنیا میں تو اسے ایسے ایسے غلیظ سیال پینے پڑتے ہیں جن کا نام بھی لیا جائے تو قے آجاتی ہے۔ سفلی عامل جب جاپ کر رہے ہوتے ہیں عام طور پر وہ گلے میں بالوں کا بنایا ہوا ایک ہار بھی لپیٹتے ہیں۔ یہ بال ایک ایسی عورت کے ہوتے ہیں جو معاشرے میں غنی اور سخاوت کے حوالے سے مشہور ہو۔ سفلی علوم والے ایسی عورتوں کے مرنے پر اس کے گیسو حاصل کر کے انہیں مختلف چیزوں میں گوندھ کر ان کا ہار بناتے ہیں۔ جاپ کے دوران ان کے بدن پر سوائے اس ہار کے کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔البتہ جانوروں کی ہڈیوں کو جلا کر جو راکھ حاصل کی جاتی ہے کسی سفوف کی طرح ان کے بدل پر مل دی جاتی ہے۔ نو آموز عامل اپنے گرو کی زیر نگرانی عملیات کا جاپ کرنے کیلئے یا تو گرو کی مخصوص کردہ قبروں میں بیٹھتے ہیں یا پھر شمشان گھاٹوں' دریاؤں اور نہروں کے کناروں پر ڈیرے ڈالتے ہیں۔ بندر عباس میں مجھے ایسے عامل دیکھنے کا اتفاق ہوا جو صبح سویرے زرد کپڑے پہن کر سمندر کے کنارے پر جاپ کرتے نظر آتے۔ان کے سامنے پیپل کے درخت کے پتوں کا ڈھیر لگا ہوتا تھا۔ان کی تعداد ایک لاکھ تک ہوتی تھی۔ عامل پتوں پر باری باری ایک ایک منتر لکھ کر بہاتا جاتا تھا۔ایک روز میں نے ان میں سے کچھ پتے پکڑ لیے۔ پتے کی جس طرف فقرہ لکھا گیا تھا وہ پانی سے محفوظ تھی۔اس پر عجیب انداز میں لکھا تھا :

"اوم شیریں لہریں نمیں مہا لکشمی منتر کے"۔

میں نے استاد مراد کو پتے دکھائے تو وہ انہیں دیکھ کر کافی دیر تک ہنستا رہا۔ پھر بتانے لگا۔

"یہ خبیث' حرام خور عاملوں کے سدھائے ہوئے پاپی ہیں۔ سارا سارا دن سمندر کے ویران کنارے پر اس امید پر پتوں پر عمل کرتے رہتے ہیں کہ انہیں دھن دولت ملے گی"۔

"پتوں پر لکھنے سے انہیں دولت کیسے ملے گی؟"

میں نے استفسار کیا۔

"بابا! یہ ان کا عقیدہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس سے ان کا یہ جاپ پورا ہو گا لکشمی دیوی مہربان ہو جائے گی"۔

"دیوی کب آتی ہے؟"

"کہاں سے آئے گی دیوی۔ ہو گی تو آئے گی ناں۔" استاد مراد نے مضحکہ خیز انداز میں نہایت گہری بات کی۔"اگر منتروں سے دولت ملنے لگے تو عمال نوکریاں کیوں کریں۔ میری بات سمجھ میں آئی کہ نہیں۔ تمہارے ملک سے لے کر بھارت اور دنیا کے سب ملکوں میں پُراسرار طاقتوں کے یہ شعبدے ہو رہے ہیں۔ لیکن کسی عامل کو دنیا کا امیر ترین انسان ہوتے دیکھا ہے یا سنا ہے کہ فلاں شخص نے عملیات کے زور پر قارون کے خزانے حاصل کر لئے ہیں؟ بابا! یہ سب کھیل ہے' جو اس کھیل کا کھلاڑی ہو گا وہی میدان میں جم کر کھیلے گا۔ میری بات یاد رکھو جس طرح فٹ بال کا ایک کھلاڑی اپنے کھیل کے بعد معاوضہ حاصل کرتا ہے اسی طرح تجریش میں بیٹھے عامل بھی اپنا اپنا کھیل دکھانے کے بعد دھن دولت حاصل کرتے ہیں"۔

"استاد....."میں اس کی بات سمجھنے کے بعد بولا

"عامل پیپل کے اتنے سارے پتے کہاں سے اکٹھے کرتے ہیں"۔

"اچھا تو یہ بتا کہ تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟" استاد مراد نے الٹا مجھ سے دریافت کیا۔

"میں تو سندس سے".....

"نہیں..... تمہیں عملیات کے لئے کچھ سامان چاہیے تھا۔"

"اور یہ سامان کہاں سے ملنا تھا؟"

"فجیرہ سے۔ وہاں تمہارا دوست سورج مل رہتا ہے۔"

"ہاں اب سمجھے میری بھائی۔" استاد مراد کی طاغوتی آنکھوں میں چمک ابھری۔ "یہ سارا سامان بھی اُدھر ہی سے آتا ہے۔ یہ کاروبار ہے' میرے بھائی بزنس۔ سورج مل اور اس جیسے چھوٹے چھوٹے لوگ عاملوں کے لئے بڑی بڑی دور سے ایسا سامان لاتے ہیں۔"

معاً مجھے یاد آیا کہ میرے میاں جی کے آستانے پر بھی اس قماش کے لوگ آتے رہتے تھے جو عموماً عملیات کا سامان بیچتے تھے۔

بندر عباس میں ہمیں ایک روز اور رکنا پڑا تھا۔ لہذا میں اور استاد مراد اگلی صبح پھر سمندر کے اس ویران ساحل کی طرف چل دیئے۔ اس روز بھی سفلی علوم کے پجاری ساحل پر اپنی دکان سجائے بیٹھے تھے۔ ہم دونوں شمال کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ استاد مراد نے ایک پجاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ناگی اسے دیکھو"

میں نے اس جانب دیکھا۔ ایک عامل ماتھے پر چندن کا تلک لگائے' انجنی کی مالا گلے میں لٹکائے سر ڈھلکائے جا رہا تھا۔ اس کے سامنے گنیش جی کی مورتی تھی۔

"پتہ ہے یہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ یہ ہندو ہے اور گنیشن جی کو مہربان کرنے کا جاپ کر رہا ہے یہ بھی دھن تپسیا کر رہا ہے۔" استاد مراد نے بتایا۔

میں نے آنکھیں سکیڑ کر استاد مراد کی جانب دیکھا اور کہا "میں سمجھا نہیں۔"

"جب اس دلدل میں اترو گے تو سمجھ جاؤ گے۔" استاد مراد نے بے ساختہ کیا۔

"استاد..... جب تو جانتا ہے کہ عملیات کی دنیا دلدل ہے تو پھر تو مجھے اس میں غرق کرنا چاہتا ہے؟" میں نے شکوہ کیا۔

"اس کے سوا چارہ بھی نہیں' میرے یار۔" استاد مراد نے مجھے دلاسا دیا۔ یہ دلدل صرف ان کے لئے ثابت ہوتی ہے جنہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ان کے پیروں تلے پختہ مٹی ہے یا دلدل ہے۔ دلدل میں صرف وہی غرق ہوتے ہیں جو اس دنیائے ظلمات سے آشنا نہیں ہوتے۔ تو نے دیکھا نہیں کہ دلدلی علاقے میں رہنے والے انسانوں کے بچوں کو بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زمین کے کس چپے میں دلدل ہے اور کون سا خطہ ہموار اور پختہ ہے۔ کا کے' ہم کس لیے ہیں..... ہم ہیں نہ تمہاری رہنمائی کیلئے۔" استاد مراد نے یہ کہہ کر مجھے ایک بار پھر ہندو پجاری کی طرف متوجہ کیا اور کہا" یہ عامل اپنے حق میں جاپ کر رہا ہے۔ جب یہ پندرہ ہزار جاپ کرے گا تو اس کے عقیدے کے مطابق گنیش جی اسے درشن دینے آئیں گے۔ یہ عامل اس وقت گنیش جی کو پانچ پانیوں سے اشنان کرائے گا۔ اس کے بعد ایک مالا کا جاپ کرے گا۔ گنیش جی خوش ہو کر انعام دیں گے لہذا جب گنیش جی درشن دے دیں تو اس وقت عامل جس ضرورت کے تحت عمل کر رہا ہو گا وہ ان سے مانگے گا اور اس کی یہ خواہش پوری کریں گے"۔

"کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟" میں نے اچنبھے سے سوال کیا۔

"یار' یہ ان کا عقیدہ ہے۔ یہ یہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ دیکھ لینا گنیش جی آتے ہیں کہ نہیں....." وہ ہنسا اور بولا" یہ سب شیطانی کام ہیں۔ شیطان یعنی ابلیس نے اپنے پجاریوں کو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بانٹ رکھا ہے۔ دنیا میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو ابلیس کے عقائد کی نفی کرتا ہے۔ ابلیس نے کفر و شرک کے مذاہب اسلام کے خلاف قائم کئے ہیں۔ اپنے پجاریوں کو مطمئن کرنے کیلئے وہ انسانی ذہن میں وسوسے' اوہام اور سفلی علوم کے بیج بوتا رہتا ہے۔ ابلیس تو مومن اور عام مسلمانوں کے ساتھ بھی رہ کر انہیں بہکاتا رہتا ہے۔ وہ کسی پل انسان کو گمراہ کرنے سے باز نہیں آتا۔ یہ جو تم دیکھ رہے ہو یہ سب ابلیسی علوم کی دنیا کے مظاہر ہیں۔"

بندر عباس کا پراسرار سادھو

بندر عباس کی اس پراسرار سمندری پٹی کے کنارے عملیات سیکھتے ہوئے مجھے کئی دن گذر گئے تھے۔اچانک اس روز ایک چیچک زدہ میلا کچیلا سا سادھو میرے پاس آیا۔اس کے ہاتھ میں ایک کالی ڈوری تھی جس پر گرہیں لگی ہوئی تھیں۔وہ کوتاہ شخص تھا۔ مگر اس کے کریہہ چہرے پر سب سے خطرناک شئے اسکی بٹنوں جیسی آنکھیں تھیں جو اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔اسکی آنکھیں بندر سے مشابہہ تھیں۔شیر کے بعد بندر ایسا جانور ہے جس کی آنکھیں طاغوتی کشش رکھتی ہیں ان میں عجیب سی مستی اور سفاکی ہوتی ہے۔کالے علم کے گیانی سفلی علوم کے دوران بندر کی آنکھوں پر جادو کر کے نظر بندی کا علم سیکھ لیتے ہیں۔اس نے دھاگے کو یوں ایک سرے سے پکڑ کر لٹکایا ہوا تھا جیسے سانپ کو دم سے پکڑ کر الٹا لٹکا دیا جائے۔

اس نے کہا" بالکے میرے ساتھ اس پار چلے گا۔"اس نے دھاگے کو سانپ کی طرح لہراتے ہوئے سنسناتی ہوئی آواز میں پوچھا۔اسکی آواز نہایت باریک اور ارتعاش خیز تھی۔

میں عمل پورا کر چکا تھا لہذا میں نے چوکی کا سارا سامان اٹھایا اور کھڑا ہو گیا" کہاں لے جانا چاہتے ہو مجھے۔"میں نے پوچھا

"ادھر "اس نے سمندر سے اس پار دھندلے مناظر کی طرف نظر دوڑائی جدھر سورج پانی میں اتر رہا تھا۔

"مجھے وہاں کیا کرنا ہو گا۔"میں نے بلاوجہ اسکی ذات میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔

" بالکے تجھے گیان چاہیئے ناں۔میں تجھے شکتی دوں گا۔تجھے اپنے شکتی مان کے پاس لے جا رہا ہوں".وہ خواب ناک انداز میں بولا تو اسکی بٹنوں جیسی آنکھیں ہوس گیر انداز میں چمکنے لگیں۔

"یہ سب ادھر جانے کو ترستے ہیں بالکے مگر پربھو انہیں جانے نہیں دیتا۔تو تجریش پہنچنا چاہتا ہے تو تجھے وہاں جانا ہو گا۔ "

اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو میں نے چونک کر اسکی جانب دیکھا۔"تیری ساری اچھائیں پوری ہونے کا سمے آ گیا ہے۔آج سیاہ منگل کی رات ہے۔اپنے گرو کو بتا کر تو ادھر آ جانا۔میں تجھے ادھر لے جاؤں گا۔"وہ میری رضا مندی جانے بغیر مجھے یوں اپنا پابند کر کے لوٹنے لگا تھا جیسے اسکی ہدایات پر عمل کروں گا۔میں نے کندھے اچکائے اور بے نیازی سے کہا" میں نہیں آ سکوں گا۔" مجھے یاد آیا کہ مجھے آج رات سندس کو ایک دوسرے عمل سے گذارنا تھا۔میں سندس کو پسند کرنے لگا تھا۔مجھے ایک زود اثر وظیفہ کے ذریعہ اسکے دل میں اپنی محبت کے احساس کو بڑھانا تھا۔چند دنوں میں ہی میرے اندر کا شوریدہ سر نوجوان عشق و محبت کی مستیوں اور اس کے گداز کو محسوس کرنے لگا تھا۔میرے اندر جوانی کا آتش فشاں بھڑکنے لگا تھا۔ناجانے یکایک میرے نفس کی شورش کیوں بڑھنے لگی تھی اور میں سوچنے لگا تھا کہ میرے اندر سندس کی قربت کا جنون کیوں بڑھ رہا ہے۔سندس کا خیال آتے ہی میری کنپٹیوں پر نفسانی کیڑے رینگنے لگے اور آنکھوں میں جوش حیوانی ابھر آیا

"تو آئے گا اور تجھے تیرا گرو اور تیری وہ بھیجے گی۔"سادھو نے میری ہوس کے شعلے کو اپنی مٹھی میں پکڑ لیا تھا۔"اگر تو اس کے دل کو اپنی مٹھی میں قید کرنا چاہتا ہے تو ہمارے پرماتما سے گیان حاصل کرو۔دیکھ اگر تو نہ آیا تو میرا پربھو تجھے خود کھینچ لائے گا۔"

سادھو کا لے دھاگے کو لہراتا ہوا سمندر کے بپھرے پانیوں کی طرف بڑھ گیا۔اسکی شوریدہ سر لہریں ساحل کی جانب والہانہ انداز میں بڑھ رہی تھیں اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کوتاہ قامت سادھو سمندر کے اندر اترتا چلا گیا۔

میں ایک دم اس کو بچانے کے آگے بھاگا اور اسے آواز دیکر روکنا چاہا۔مگر وہ کوئی دیوانہ ہی تھا جو بے دھڑک سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں کے اندر اتر گیا اور پانی کی بھاری لہریں اسے اپنے اندر غرق کر کے سمندر میں لے گئیں۔میں کتنی ہی دیر تک ساحل پر کھڑا ہو کر دیکھتا رہا کہ شاید کوئی لہر اسے اٹھا کر سطح پر پھینک دے۔مگر ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک میں ناامید ہی رہا۔سمندر نے اس پراسرار سادھو کو باہر نہیں پھینکا۔میں نے سوچا کہ وہ مر کھپ چکا ہو گا۔

جوان بدن کی مہک

میں مکان میں واپس آ گیا تو استاد مراد کہیں گیا تھا۔ گھر میں سندس اکیلی تھی اس نے گھنے سیاہ بال پشت پر بکھیرے ہوئے تھے اور ان میں کنگھی کر رہی تھی۔ وہ نہا کر نکلی تھی اور سفید باریک قمیض اسکے گیلے بالوں کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ اس کا برقی ریشمی بدن کالے بالوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ کشیدہ پشت پر بالوں کو بکھرائے ہوئے وہ ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ وہ میری آمد سے بے نیاز تھی اور بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے اس کی کمر خفیف سا جھٹکا لے رہی تھی۔ میرے پاؤں اسکے دلفریب انداز نشست پر جم گئے اور میرے بدن میں لطیف سی حرارت بیدار ہونے لگی۔ میں سانس کو روکے اسکو بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ میری سانس بھی میرے سینے میں رک گئی تھی۔ شاید میں اس بت نازنین کو کتنی دیر تک دیکھتا رہتا کہ سندس نے جیسے اپنے علاوہ کسی دوسرے وجود کی بو سونگھ لی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر پلٹی تو اسکی آنکھوں میں خوف لہرانے لگا۔ وہ اپنا آپ سمیٹتے ہوئے ہڑبڑا گئی۔ اس نے چادر بھی نہیں لی ہوئی تھی۔ نیم دراز گریبان سے اسکا بانکپن چمک رہا تھا۔

"سندس یہ میں ہوں۔ ناگی۔" میں جیسے خواب آلود لہجے میں بولا۔ اس نے میری آنکھوں میں ہوس کے پھن پھیلائے ناگوں کو دیکھ لیا تھا۔

"آپ آپ" وہ بے حد خوف میں مبتلا تھی۔ میں بے اختیار آگے بڑا تو اسکے وجود سے اٹھنے والی نسوانی مہک نے مجھے سحر زدہ کر دیا۔ میں اسکے پاس اسکے قدموں میں بیٹھ گیا اور اسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ کہا۔

"سندس مجھ سے خوف زدہ ہو۔ ادھر دیکھو۔ یہ میں ہوں۔ میں۔ سندس مجھ سے خوف نہ کھاؤ۔"

میں نے اس کا لرزتا ہوا سرد ہاتھ تھام لیا۔ میرے تپتے ہوئے ہاتھ میں اس کا ہاتھ برف کی سل کی طرح تھا۔ اس نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ میرے وجود کی حرارت اسکے سرد بدن کو گرمانے لگی اور کچھ ہی لمحے بعد سندس کے اندر کی عورت زادی کا التفات ظاہر ہونے لگا۔ اسکی نظروں میں پیار کی جوت جاگنے لگی۔

"تم گنگنا رہی تھی۔ سندس،" میں نے خواب آلود لہجے میں کہا۔ "پھر سے گنگناؤ۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔"

وہ شرما گئی اسکی نظریں جھک کر اپنے کھلے گریبان میں اٹک گئیں۔ میری نظریں بھی اس کے تعاقب میں جھکیں تو ہاتھ چھڑا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گریبان چھپا لیا۔

یکایک جیسے مجھے کسی نے جھنجوڑ دیا ہو اور مجھ پر طاری نفسانی سحر زدگی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ میں جیسے اچھل پڑا اور پھر شرم کھا کر اندر بھاگ گیا۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہو گئی کہ میں نے اس پاکیزہ سی لڑکی سے کیا کہہ دیا تھا۔ مگر میں اسکی محبت کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا اور مجھے اسکی قربت کے لمس کی تشنگی بے قرار کر رہی تھی۔ جی چاہتا تھا اس کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اپنے سینے سے لگا لوں اور اسکے بعد دعا کروں کہ یہ سارے لمحات ساکت ہو جائیں۔

مگر مجھے اس طرح اپنی شرافت اور پاکیزگی کو برباد نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ میں سندس کی نظروں میں جیسے گر گیا تھا۔ میں سر تھام کر بیٹھ گیا اس لمحے مجھے استاد مراد کی بات یاد آ گئی کہ اگر میں نفس کی لذت میں پڑ گیا تو اب تک کے سیکھے ہوئے تمام روحانی علوم غارت ہو جائیں گے۔ روحانی عاملین پاپ نہیں کر سکتے۔ خاص طور پر وہ عامل جو ابھی طفل مکتب ہوں۔ اگر وہ پاپ یعنی زنا، شراب اور شرک کے مرتکب ہوں تو انکی روحانی قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں اور چلے کے دوران وہ روحانی قوتوں کے انتقام کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ یہ سب حقائق اپنی جگہ درست تھے۔ مگر میرے اندر ایک جواں مرد کی روح تھی۔ جو چلوں کی تپسیا اور آگ سے بھڑکتا رہتا تھا۔ اس کا نفس ہر وقت توانا اور باغی ہوتا ہے۔ ایسا نوجوان پل صراط پر چل رہا ہوتا ہے۔ ذرا سی لغزش اسے گناہوں اور گنہگاروں کی دلدل میں گرا دیتی ہے۔ میں شرم و ہیجان کی ملی جلی کیفیت سے رو دیا۔ اور کمرے کی کھڑکی کی سلاخیں پکڑ کر خلاؤں میں گھورنے لگا۔

شام صحن میں اتر رہی تھی جب سندس جواں کا مہکتا ہوا وجود میرے خیالات کو ایک بار پھر منتشر کرنے لگا۔ وہ اندر آئی اور اس نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے دھیرے سے کہا "آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے اسطرح صحن میں نہیں بیٹھنا چاہیئے تھا۔"

میں نظریں چرا کر اسکی جانب مڑا اور کہا "سندس مجھے معاف کر دو میں بھٹکنے لگا تھا۔" وہ روہانسی انداز میں بولی۔ "آپ۔۔۔ آپ نے مجھے چھو کر پاپ نہیں کیا۔ میں تو ایک مسلی ہوئی لڑکی ہوں۔ وہ لڑکی کیا حیادار ہو گی جسے اسکے باپ نے۔" ۔۔۔ وہ بولتے بولتے سسک پڑی اور بولی "آپ نے مجھے چھو لیا میرے بدن کو دیکھ لیا تو کیا ہوا۔"

"سندس سندس خدا کے لئے۔ یہ نہ کہو"۔ میں تڑپ اٹھا تو وہ میرے سینے سے لگ گئی اور مجھے اپنے نازک بازوؤں میں جکڑ کر اپنا چہرہ میرے سینے میں جذب کر کے ہچکیاں بھرنے لگی۔ وہ سہمی ہوئی، لٹی ہوئی عصمت والی لڑکی تھی ۔ مگر اس میں اس کا کیا دوش تھا۔ میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے کٹورے میں اٹھایا اور اسکے آنسو اپنی انگشت پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"سندس یہ بہت قیمتی ہیں۔ انہیں یوں نہ لٹاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ "سندس تم میری ہو۔ میری ہو۔ تم سے بڑھ کر حیادار کون ہو گا۔ تیرا وجود پاک ہے۔ تیری روح پاک ہے۔ آئندہ ایسا مت کہنا کہ تم، پاکیزہ نہیں ہو۔" وہ میرے سینے سے لگ کر بہت روئی تھی اسے آج ایک مددگار مل گیا تھا۔ جس کے ساتھ لگ کے وہ جی بھر کے روئی

صحن میں رات اتر چکی تھی اندر دو محبت کرنے والوں کی سچی محبت کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ میرے اندر کا شیطان انسان محبت کے پاکیزہ اور لطیف جذبوں سے سدھر گیا۔ ہم دونوں نے اس رات خاصی دیر تک باتیں کیں۔ میں نے سندس سے شادی کا تہیہ کر لیا۔

اس رات ہم دونوں کا دل سونے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں اپنے نفس کی طہارت اور سندس کی نظروں میں اپنا وقار قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اب مجھے سندس کی محبت حاصل کرنے کے لئے دوسری رات کا عمل کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ پہلی رات کے عمل نے ہی اس کے اندر التفات کی جوت جگا دی تھی

یہ سیاہ منگل کی رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دے رہا تھا۔ سمندر کی بپھری ہوئی لہروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں چارپائی پر لیٹ کر آسمان پر نظریں مرکوز کئے ہوئے سندس کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا اچانک مجھے تاریکی میں کسی وجود کا ہیولا نظر آیا۔

"بالکے۔ تم آئے کیوں نہیں۔" تاریکی کی چادر تلے سے اسی سادھو کی آواز سنائی دی جو ساحل پر ملا تھا۔ "یہ رات امنگوں والی ہے چلا آ۔ ورنہ پچھتاوے گا۔

۔" میں اٹھ پڑا اور کہا "آج میرا استاد یہاں نہیں ہے میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

۔" کھی کھی۔" وہ عجیب معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا "استاد کی فکر نہ کر بس تو اپنی فکر کر۔ اگر استاد کا انتظار کرتا رہا تو یہ سمے بیت جائے گا۔"

"کیسا سمے" میں نے کہا مگر میری بات کا جواب دینے کی بجائے وہ کھی کھی کرتا ہوا غائب ہو گیا۔ اور میں اپنی چارپائی کے گرد حصار قائم کر کے سو گیا ابھی مجھے سوئے کچھ دیر گذری ہو گی کہ نیچے سے سندس کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ میں جلدی سے ایک وظیفہ پڑھتا ہوا نیچے بھاگا۔ سندس کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی وہ چیختی ہوئی میری طرف بھاگی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے وظیفہ پڑھا ہوا تھا اس لئے آگ مجھ پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ میں نے جلدی سے اسے خود سے الگ کیا اور پانی کا کٹورہ لیکر اس پر دم کیا اور پانی سندس پر پھینک دیا۔ آگ فوراً بجھ گئی۔ حیرت انگیز طور پر سندس کا بال بھی نہیں جلا تھا۔ لیکن آگ کے خوف نے جیسے اسکی جان نکال لی تھی ۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ "آگ کیسے لگی تھی۔" میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے پوچھا۔

-"ایک کالی عورت میرے پاس آئی تھی۔اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر تم نے ناگی سے شادی کی تو میں تجھے جلا کر رکھ دوں گی۔میں نے جواباً سخت جواب دیا۔تو اس نے غصے میں آکر مجھے آگ لگادی۔-"

"کالی عورت کون ہوسکتی تھی"میں نے بہت ذہن دوڑایااور سوچا کہ عورت کون ہوسکتی ہے۔لیکن میری سمجھ میں نہ آیا۔

اگر میں اس وقت عملیات کا ماہر ہوتا تو یقیناً اس عورت کا پتہ چلالیتا مگر میری کم علمی کے باعث مجھ سے ایک اہم موقع ضائع ہوگیا۔اور میری اس کوتاہی کے نتیجے میں سندس مجھ سے بہت دور چلی گئی۔اتنی دور کہ میں تو کیا دنیا کے سارے عامل جادو گر مل کر بھی اس کو واپس نہیں لا سکتے تھے۔اگلی صبح استاد مراد آیا تو میں نے اسے رات کے واقعہ سے آگاہ کیا تو وہ بولا "وہ پدمنی ہوگی۔"

پدمنی کا نام سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی "استاد۔میری سندس کو اس حرام زادی کے قہر سے بچالو۔اس نے سندس کو دیکھ لیا ہے۔تو میری خوشیوں کی برباد کر ڈالے گی۔"

استاد مراد نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا "ناگی ایران کے حالات بدل رہے ہیں انقلاب آرہا ہے۔تجریش کی پہاڑیوں میں شاہ کے عاملوں پر موت کے پہرے لگ چکے ہیں۔شاہ کے خلاف خفیہ انقلاب کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔میرا علم بتاتا ہے کہ یہ انقلاب آئے گا اور سارے عاملوں کو یہاں سے بھاگنا ہوگا۔پچھلی رات تجریش میں دو ہندو عامل مار دیئے گئے ہیں۔شاہ ایران کی سفاک انٹیلی جنس ساوک کو شک ہے کہ ان کو انقلابیوں نے مار ڈالا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ میں خود شاہ ایران کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہوں۔اس لئے مجھے اب کچھ عرصہ کے لئے یہاں سے نکل جانا ہے۔کیونکہ جو عامل مارے گئے ہیں وہ میرے دشمن تھے۔فی الحال ساوک میں میرے دو چار مرید ایسے ہیں جنہوں نے مجھے مطلع کر دیا ہے کہ وہ اس کیس کی انکوائری کرنے پر مامور ہیں۔جب تک انکوائری مکمل نہیں ہو جاتی تم ایران سے چلے جاؤ۔لہذا ہمیں آج ہی یہاں سے فجیرہ جانا ہے۔سندس کو تیار کرو ہم فجیرہ کے جزیرے پر پدمنی کو قابو کریں گے۔"

میں اس افراتفری میں استاد مراد کو پراسرار سادھو کے بارے میں بتانا بھول گیا۔ہم تیار ہوئے اور شام ہوتے ہی ساحل پر پہنچ گئے۔استاد مراد کا ایک جاننے والا اسٹیمر لے آیا اور ہم اس میں سوار ہو کر فجیرہ کی طرف چل دیئے۔

شیطانوں کا استھان

اسٹیمر آہستہ آہستہ پانیوں میں چلتا رہا۔ تین چار گھنٹے گذر گئے مگر فجیرہ نہیں آیا تو استاد مراد نے اسٹیمر والے سے پوچھا کہ فجیرہ کیوں نہیں آرہا اس نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ لیکن استاد مراد کو فکر لگ گئی کہ فجیرہ اتنی دور نہیں ہے۔ یہ اسٹیمر والا ہمیں کسی اور طرف لے جارہا ہے۔ رات اندھیری تھی اس لئے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ ہمیں کہاں لے جارہا ہے۔ آدھی رات گذری تو پچھلی رات کا چاند طلوع ہو گیا تو سمندر پر روشنی پڑنے سے قدرے اجالا ہوا۔

"اوہ۔" استاد کے منہ سے نکلا۔ "حرامزادے تو ہمیں کہاں لے آیا ہے" استاد مراد گھبرا گیا اور کشتی بان کی طرف بڑھا اسٹیمر واپس موڑ" مگر اس نے استاد کی بات نہ سنی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا تو وہ استاد پر پل پڑے۔ میں اس اچانک افتاد کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ سندس گھبرا کر رونے لگی تو میں نے اسے دلاسہ دیا اور کہا "تم یہاں بیٹھی رہو۔ میں استاد کی مدد کرتا ہوں" میں نے کشتی میں رکھا ہوا ایک پتوار اٹھایا اور ان خلاصیوں پر حملہ کر دیا جو استاد کو پکڑ کر سمندر میں گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی کی کمر توڑ کر رکھ دی اور دوسرے کا سر کھول دیا۔ تیسرا ساتھی اسٹیمر چلا رہا تھا۔ اس نے دونوں ساتھیوں کی حالت دیکھی تو اسٹیمر کی رفتار تیز کر دی۔ آسمان خاصا روشن ہو چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی نما جزیرہ نظر آنے لگا اسٹیمر کا رخ اس جانب تھا۔ میں اسٹیمر والے کے سر پر پہنچا اور اس کو واپس مڑنے کے لئے کہنے والا تھا کہ عقب میں سندس نے دلدوز چیخ ماری ۔

میں نے پلٹ کر دیکھا وہی کوتاہ قامت سادھو اسکے سامنے کھڑا تھا اور اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "تو کہاں سے آگیا حرام زادے میرے منہ سے نکلا اور استاد مراد کو آواز دیکر اسکے وجود سے باخبر کر دیا۔ مگر استاد نے جیسے بات ہی نہیں سنی۔ وہ منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسٹیمر جزیرے پر پہنچ گیا تھا۔ اور اسی لمحے استاد نے عملیات پڑھ کر سادھو کی طرف پھونک ماری تھی مگر وہ حرام زادہ چھلاوے کی طرح جزیرے کی طرف اڑ گیا۔ "یہ حرامی فتنہ کہاں سے آگیا" یہ جزیرہ ان شیطانوں کی استھان ہے۔"

میں نے استاد کو اسکے بارے میں بتایا تو استاد کا چہرہ غصے سے بھر گیا۔ "تو نے بہت بڑی غلطی کی ہے ناگی۔ اگر مجھے اس سے باخبر کر دیتا تو میں اس کا اپائے کر کے چلتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ شیطان تجھ سے مل چکا ہے۔ تیری غفلت نے مجھے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شیطان ہی ہمارے اسٹیمر کو یہاں کھینچ لایا ہے تو اگر بتا دیتا کہ اس نے تمہیں اپنے پر بھو سے ملوانے کے لئے زور ڈالا تھا تو میں تمہیں بتا دیتا کہ اب ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

"کیا ہونے والا ہے" میں نے استاد سے پوچھا۔

"بھارت کے ہندو عامل اس جزیرے پر رہتے ہیں۔ جو بھی نیا عامل عملیات سیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اسے روحانیت سے گمراہ کر کے کالے جادو کی راہ پر لگا دیتے ہیں۔ اگر وہ نوخیز عامل ان کی ہدایت پر عمل نہ کرے تو یہ اس پر بندشیں لگا دیتے ہیں۔ یہ کالے علم کے پجاریوں کی آماجگاہ ہے۔ ان لوگوں نے اس جزیرے پر کئی معصوم لڑکیوں کی بلی چڑھائی ہے۔ اور" کچھ کہتے کہتے اچانک استاد مراد کی نظریں سندس پر پڑیں تو وہ خاموش ہو گیا۔ اسکی آنکھوں میں الجھن تھی۔

"ناگی۔ سندس کی حفاظت کے لئے ہمیں اپنی جان سے گذرنا ہو گا مگر فی الحال نہ اپنی جان قربان کر سکتا ہوں نہ تمہاری۔ سندس کی جان کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی"

"استاد کیسی بات کرتے ہو۔ کیا تم مذاق کر رہے ہو۔ سندس مجھے بہت عزیز ہے۔ تم جانتے ہو میں اس سے پیار کرنے لگا ہوں

" ناگی اپنا دماغ ٹھنڈا کر کے سوچو۔ آج بدھ وار کی رات ہے۔ اس سیاہ رات کو کالے عامل کالے عملیات سیکھنے کے لئے ایسی لڑکی کو قربان کرتے ہیں جو انکے دیوتاؤں اور طاغوتی قوتوں کو راس ہو۔ سندس ایک راس لڑکی ہے مجھے اب سمجھ آرہی ہے کہ ہمارے لئے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کر کے یہاں لایا گیا ہے۔ سادھو پہلے تمہیں بہلا پھسلا کر یہاں بلانا چاہتا تھا تاکہ بعد ازاں تم سندس کو یہاں لا سکتے۔ لیکن اب تو حالات مختلف ہیں ہم جال میں پھنس چکے ہیں۔ "

سادھو کو دیکھنے کے بعد سندس کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ میں نے اسکی طرف نظر دوڑائی اور پھر اپنے اندر پھوٹنے والی اس روشنی پر نظریں جمانے لگا جو اپنے مقدس جذبوں کے تحفظ کے لئے میری رگ رگ سے پھوٹ رہی تھی ۔ میں نے استاد سے کہہ دیا کہ میں سندس کو قربان نہیں ہونے دوں گا۔ مگر میرے یہ سب ارادے اور قوتیں ریت کی دیوار ثابت ہوئیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کالے جادو گروں کی اس سرزمین پر طاغوتی طاقتیں ہم پر غالب آجائیں گی اور میں سندس جیسی معصوم اور پاکیزہ لڑکی سے محروم ہو جاؤں گا۔ "

اسٹیمر رکتے ہی تین چار ہٹے کٹے سادھو اچانک نمودار ہوئے اور ہمیں پکڑ کر جزیرے پر لے گئے

استاد مراد بے قراری سے سادھوؤں کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں حیران تھا کہ استاد یہاں سے فرار حاصل کیوں کرنا چاہتا ہے۔ اس کا جواب مجھے بہت جلد مل گیا۔ سادھو ہم دونوں کو دھکیلتے ہوئے ایک پہاڑی کھوہ میں لے گئے جہاں صندل کی لکڑی کا آلاؤ جل رہا تھا۔ جبکہ سندس کو وہ نہایت عقیدت واحترام سے یوں تھام کر چل رہے تھے جیسے وہ کوئی عورت نہ ہو گاؤ ماتا یا کسی دیوی کا پرتو ہو۔

آلاؤ کے گرد دس بارہ کالے بھجنگ سادھو نیم عریاں ہو کر مورتیاں سجائے عمل پڑھنے میں مصروف تھے۔ ہماری آمد پر وہ اپنے عمل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر سفاکیاں تیر رہی تھیں۔ آلاؤ سے چند قدم دور ایک سادھو بیٹھا تھا۔ اس نے وہیں سے آواز لگائی "آگئے سبز واری۔ تو نے بڑا انتظار کرایا ہے۔ اچھا ہوا تم سب اکٹھے ہو گئے ہو۔ " یہ کہتا ہوا ہمارے قریب آیا تو مجھے لگا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

"کالی ناتھ شیرازی" استاد مراد اسے دیکھتے ہی دانت پیسنے لگا۔

" تیرا خواب پورا نہیں ہونے دوں گا۔ میں تجھے کتے کی موت ماروں گا "

جواب میں کالی ناتھ نے ایک بلند شگاف مکروہ قہقہہ لگایا تو پوری پہاڑی اسکے طاغوتی قہقہے سے گونج اٹھی۔

" تیرا سبز واری تو پاگل ہے۔ یہ جانتا ہے اس مرگھٹ اور استھان پر صرف کالی ناتھ کی حکومت ہے۔ یہاں سے کوئی واپس نہیں جا سکتا۔ پھر تم لوگ واپس کیسے جاؤں گے۔ اگر تم زندہ جانا چاہتے ہو تو ایک شرط ہے "

۔"میں تیری کوئی شرط پوری نہیں کروں گا۔" استاد مراد غرایا۔

" چلو نہ مانو۔ اچھا ہے تم نہ ہی مانو۔ " وہ مکروہ قہقہے لگاتا سندس کے پاس گیا اور سادھوؤں سے بھولا۔

" اس کنیا کی بلی چڑھانے کا انتظام کرو۔ سمے بس آنے والا ہے۔ آج میں کالی ماتا کو اس کنیا کے علاوہ ان پاپیوں کی بھینٹ چڑھا کر ان کے لہو سے دیوی کو اشنان کراؤں گا تو دیوتا ہمارے گیان میں اضافہ کرے گا۔ "

" جے پربھو کی۔ " سادھو ہاتھ جوڑ کر اس درندہ صفت خونی کالی ناتھ کی مالا جھپنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سادھوؤں نے ہمیں رسیوں میں باندھ دیا اور سندس کی بلی چڑھانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

" استاد ان کی شرط مان لینے میں کیا حرج ہے، " میں نے حالات کی سفاکی کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

۔"کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔"استاد غراہٹ کے انداز میں بولا "کالی ناتھ کو گمان ہے کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔ کاش ناگی تو نے کچھ علم سیکھے ہوتے تو آج ہم پر یہ قیامت نہ گذرتی میاں جی (میرے والد) کو اپنی مدد کے لئے بلانے لگا ہوں۔ کیونکہ میں اکیلا ان کے مقابلے پر کھڑا رہا تو سندس ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ تم اس دوران خود کو حصار کے اندر قید کر لو تمہارا علم کچا ہے۔ اس لئے تم اس کے وار سے نہ بچ سکو گے۔" استاد مراد نے مجھے یہ ساری باتیں پنجابی میں سمجھادی تھیں۔ سادھو فارسی اور ہندی ہی بول سکتے تھے۔ اس لئے وہ ہمارے منصوبہ کو نہ جان سکے۔

استاد مراد کی رسیوں کی بندش میں جھکڑے ہونے کے باوجود میاں جی سے مدد طلب کرنے لگا۔ اسے کافی دیر ہوگئی مگر اسکی مراد پوری نہ ہونے پائی تھی کہ مجھے سندس کی دلدوز چیخ سنائی دی۔ ظالم کالی ناتھ شیرازی نے پہاڑی کھوہ میں کالی ماتا کے بت کے چرنوں میں میری سندس کو قربان کر دیا اور اسکے بعد لہو سے پیالہ بھر کر اپنی خونی ماتا کو اشنان کرانے لگا۔ سندس کی ہلاکت کا منظر دیکھ کر میری جان نکل گئی۔ میری آنکھیں بے اختیار برسنے لگیں اور میں اس وقت کو کوسنے لگا جب میرے میاں جی اور استاد مراد سے عملیات اور وظائف کی طاقت سے مالامال کرنے کے لئے مجھے قائل کرتے رہتے تھے مگر میں ان کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ مجھ سے میری سندس چھن گئی تو میرے اندر شکستگی اور لاچارگی نے پنجے گاڑ لئے۔ استاد مراد اس خونی منظر کو دیکھ کر خاموش رہا اور متواتر عمل پڑھتا رہا۔

"استاد تیرے عمل اب کس کام کے" میں بلکتا ہوا کہنے لگا۔

"ظالموں نے میری سندس کو مار دیا ہے۔ استاد" میں بے جان سا ہو گیا۔

"ناگی سنبھلو میاں جی آرہے ہیں۔" استاد مراد ہذیانی انداز میں بولا اور اسی اثناء میں ایک سیاہ بھجنگ عورت سندس کا خون آلود سر اٹھائے میرے سامنے آئی اور بولی "ناگی میں پدمنی ہوں میں تیرے پرکھوں کا حساب تجھ سے لوں گی۔ اور تجھے ساری عمر کاٹتی رہوں گی۔" یہ کہہ کر اس خرافہ نے سندس کے کٹے ہوئے سر کو بالوں سے پکڑا اور اسکی قندیلوں جیسی روشن آنکھوں میں انگلیاں چبھو کر بولی "میں تیری زندگی میں اندھیرے بھر دوں گی۔"

اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی۔ ماحول میں یکدم سرد طوفان سا پیدا ہو گیا اور ایسا لگا جیسے بہت سی طاقتیں طوفان سیاہ لیکر آگئی ہیں۔ پدمنی نے چیخ ماری اور کالی ناتھ شیرازی کو پکارنے لگی۔

"ناتھ میاں جی آگئے ہیں۔ آتوم۔ طرطوش۔ ناتھ ہوشیار ہو جاؤ"

میں زندگی بھر ان پراسرار وجودوں سے بے خبر ہی رہتا اگر اس روز استاد مراد میاں جی کو اپنی مدد کے لئے نہ طلب کرتا۔ آتوم اور طرطوش ہمارے خاندان کے محافظ جنات تھے۔ استاد مراد نے وظائف کے ذریعے میاں جی سے رابطہ کر کے ان پراسرار ہستیوں کو بلایا تھا جنہوں نے آتے ہی پہاڑی جزیرے پر قیامت برپا کر دی۔ پدمنی اسی وقت فضا میں دھواں بن کر تحلیل ہو گئی

میاں جی کی پراسرار طاقتوں کی حفاظت میں اس خونی جزیرے سے نکلے تو راستے میں بہت سی انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں بکھری ہوئی نظر آئیں۔ یہ سارے وہ بے کس اور مظلوم تھے جو شاہ ایران کے ہندو عاملوں کے عملیات کی بھینٹ چڑھے تھے۔ استاد مراد نے فجیرہ پہنچ کر وہاں کی پولیس کو اس جزیرے کی حقیقت سے آگاہ کیا تو پولیس نے اسی روز پورے جزیرے کو گھیرے میں لے کر بے وارثوں کی لاشیں قبضہ میں لے کر انہیں دفن کر دیا اور پھر کئی روز تک کالا علم کرنے والے پجاریوں کی پکڑ دھکڑ ہوتی رہی۔

ان دونوں میری حالت غیر ہوگئی تھی۔ میری نظروں میں بار بار پدمنی ہاتھوں میں لہراتا ہوا سندس کا خون میں تربتر کٹا ہوا سر نظر آتا اور میں ہذیانی انداز میں چیخیں مارنے لگتا۔ استاد مراد نے میری بگڑی ہوئی حالت کے پیش نظر آئت الکرسی کا نقش میرے گلے میں ڈال دیا اور پھر کچھ وظائف پڑھ کر پانی پر دم کر کے مجھے پلایا۔ استاد مراد مجھے واپس لاہور لے آیا۔ میں گم صم رہنے لگا۔ کسی سے نہ بولتا بس سندس کے خیالوں میں بھٹکتا رہتا۔

شاید اسی حالت میں مجنوں ہو جاتا کہ میاں جی نے میرا روحانی علاج کر کے میری ذہنی حالت بدل دی۔ ایران سے آنے کے بعد ایک فائدہ ہوا کہ میں میاں جی کی پراسرار طاقتوں کا مطیع ہو گیا۔ مگر ایک قلق رہا کہ میاں جی کی یہ طاقتیں میری سندس کو نہ بچا سکیں۔ میں نے اس دوران چند عملیات سیکھ لئے اور ساتھ ہی فارسی زبان بھی سیکھ لی۔ میں نے دوبارہ سے پڑھائی شروع کر دی تھی اور سارا سارا دن پڑھنے میں لگا رہتا تھا۔ میاں جی اور میری والدہ نے میری حالت دیکھ کر میری شادی چچا افضل کی بیٹی سے کر دی۔ میری بیوی میرے لئے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئی وہ میرے غم کی کیفیت جانتی تھی لہذا اس نے کامل توجہ اور محبت کے ساتھ مجھے بدل دیا مگر وہ بھی مجھے عملیات

کی دنیا کی طرف کھینچ لانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ میں نے بی اے کر لیا اور اس دوران اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بیٹی اور بیٹا عطا کیا۔ میں نے بیٹے کا نام عمران رکھا۔ استاد مراد واپس ایران جا چکا تھا۔ اور میں اپنے کاموں میں مگن ہو گیا تھا۔ اس بار استاد مراد تین سال کے بعد لاہور آیا تو بہت خوش تھا کہنے لگا کہ ایران میں شاہ ایران کے خلاف بغاوت کامیاب ہو رہی ہے۔ انشاءاللہ مطلق العنان حکمران اپنے انجام کو پہنچے گا۔ میں لاہور میں رہتے رہتے بور ہو گیا تھا اور میری افتاد طبع کو بے قراری ہونے لگی۔ میں نے استاد مراد سے کہا کہ میں ایران واپس جانا چاہتا ہوں۔ استاد مراد نے حامی بھر لی اور کہا میں تمہیں تہران کے کالج میں انگلش فارسی مترجم کے طور پر رکھوا سکتا ہوں۔ فارسی اور انگریزی پر مجھے عبور تھا۔ میں نے بیوی سے کہا تو وہ رضامند ہو گئی۔ لیکن میاں جی نے سنا تو وہ جلال میں آ گئے۔ کہنے لگے

"ناگی تو برباد ہو جائے گا۔ اگر ایران گیا تو میں نے پدمنی کو تجھ سے دور کر دیا ہے۔ لیکن میں تیری حفاظت ایران میں نہ کر سکوں گا۔ وہ تجھے اور تیرے بچوں کی خوشیاں چھین لے گی" میں نے میاں جی کو حوصلہ دیا اور کہا میں ایران جاتے ہی عملیات سیکھ لوں گا۔ لہذا مجھے پدمنی کا کوئی خوف نہیں ہے۔ افسوس کہ میں میاں جی کی دور رس نظروں کو نہ پہچان سکا اور ایران چلا گیا۔ میاں جی میری اس حرکت پر بہت سخت ناراض ہوئے تھے اور انہوں نے مجھے بدعائیں بھی دیں۔

استاد مراد نے تہران میں میرے لئے بہت سی سہولیات پیدا کر دی تھیں۔ میں اسکے ساتھ تجریش اور دوسرے علاقوں میں عملیات سیکھنے جاتا تھا۔ مگر کالج کے علمی ماحول کی وجہ سے عملیات سے کنارہ کر لیا۔ دن یونہی گزر رہے تھے۔ شاہ ایران کے خلاف اسلامی انقلاب کی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ سڑکوں پر ساواک کے درندے دندناتے ہوئے پھرتے تھے۔ ہر اس مرد عورت اور بچے کو بے دردی سے قتل کر دیتے تھے جو شاہ ایران کے خلاف زبان کھولتا تھا۔ یونہی چند سال گذر گئے۔ پدمنی ایک واہمہ کی صورت اختیار کر گئی اور پھر میری مصروفیات کے باعث ذہن سے ہی نکل گئی۔

☆☆☆

زمستان شروع ہو چکا تھا۔ غالباً جنوری کا مہینہ تھا برفباری زوروں پر تھی۔ ہماری رہائش کے قریب پانی کا برساتی نالہ تھا جس کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد ایک نان فروش کی دوکان تھی جہاں سے میری بیٹی پولی جو اس وقت تقریباً چھ سال کی تھی روٹیاں لینے جاتی تھی۔ اندھیری منگل کا روز تھا لیکن موسم کی وجہ سے سہ پہر کی وجہ سے ہی رات کا سا معلوم ہوتا تھا۔ اس روز میری بیٹی اس نالے کے قریب سے گزری تو آناً فاناً ایک کالی عورت نے اسے اٹھا کر نالے میں پھینک دیا۔ قریب سے گزرنے والے لوگوں نے اسے باہر نکالا اور گھر اطلاع دی۔ نالہ میں گرنے کی وجہ سے بچی کے ناک اور منہ سے خون بہنے لگا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ میں کالج میں تھا کہ مجھے کالج کے سپریٹنڈنٹ آقای دوست محمدی نے بتایا کہ میری بچی کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا ہے۔ جب میں ہسپتال پہنچا تو میری بیوی زار و قطار رو رہی تھی۔ بچی بے ہوش پڑی تھی ڈاکٹروں نے بتایا کہ سر پر بری طرح چوٹ لگنے کی وجہ سے بچی کی آنکھیں متاثر ہوئی ہیں اور نظر ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہے۔ یہ سن کر میرے ذہن پر بجلی سی گری۔ استاد مراد بھی بچی کو دیکھنے کے لئے ہسپتال آیا اور بچی کے پاس بیٹھ کر ایک عمل کرنے لگا۔ اس نے اپنے مؤکل کے ذریعے معلوم کیا کہ پدمنی نے اس کو مارنے کی غرض سے نالے میں پھینکا تھا۔ پدمنی کا نام سنتے ہی میری بیوی گھبرا گئی اور خود میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔

استاد مراد نے مجھے کہا کہ پدمنی اب تمہارے بچوں کے پیچھے پڑ گئی ہے اس لئے تم عملیات باقاعدگی سے سیکھنا شروع کر لو۔ مگر میں نے استاد کو ٹال دیا۔ سات دن گذرے تھے کہ اگلی منگل کو میرے دو سالہ بیٹے عمران ناگی کے ساتھ ایسا ہی حادثہ پیش آ گیا۔ اس روز بھی میں کالج میں تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ پدمنی نے اسے اندھا کر دیا ہے۔ میں اطلاع ملتے ہی بیمارستان ہسپتال پہنچا میری بیوی نے بتایا کہ میرے سامنے ہی پدمنی نے عمران ناگی کی آنکھوں میں جو سلور کھلونا نما پستول سے کھیل رہا تھا اس کی سپرنگ نکال کر آنکھوں میں دے ماری تھی پدمنی نے جاتے جاتے مجھے زوردار دھکا دیا اور کہا کہ اب تیری باری ہے پدمنی نے چند ہی روز میں میری دنیا تاریک کر دی میرے دونوں معصوم بچے اندھے ہو گئے تھے۔ مجھے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں بالآخر اس دنیا کی طرف نکل جاؤں جس کی طرف جانے سے میں ہمیشہ کتراتا تھا۔ اس روز میں نے لاہور فون پر اپنے میاں جی سے بات کی اور انہیں اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ میاں جی نے مجھے کہا کہ اب بھی وقت ہے واپس آ جاؤ اور آ کر خاندانی گدی سنبھال لو کیونکہ پدمنی کے انتقام سے بچ نکلنے کا یہی ایک راستہ ہے

ان حالات میں میں نے استاد مراد سے کہا کہ اب میں اسکے ساتھ چلہ کشی کے لئے تجریش کی پہاڑیوں میں ضرور جاؤں گا۔

مغرب کے بعد استاد مراد نے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تجریش کی پہاڑیاں نظام آباد سے کچھ فاصلے پر تھیں۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ اور ہر طرف برف کی سفید چادر اوڑے سڑکیں اور راستے ویران نظر آ رہے تھے کبھی کبھار کوئی گاڑی جس نے ٹائروں میں لوہے کے سنگل باندھے ہوئے تھے برف سے لدی ہوئے راستوں کا سینہ چیرتے ہوئے پاس سے گزرتی تو ماحول میں ایک عجب سا شور برپا ہوتا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ استاد مراد نے مجھے بتایا کہ چلہ کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ اب ہمیں عمل شروع کرنے چاہئیں۔ استاد مراد نے بتایا کہ ناگی بیٹا۔ ہمارے عملیات عشاء کی اذان سے فجر کی اذان ہونے سے پہلے تک ہی ہو سکتے ہیں۔ آج کام ذرا زیادہ ہے اس لئے حوصلہ قائم رکھنا۔

پہاڑیوں کے درمیان میں ایک غار تھا وہاں استاد مراد کا مددگار آقای مصطفی پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس نے کوئلوں کی انگھیٹی سلگا رکھی تھی۔ جس کی وجہ سے غار کے اندر خاصی گرمی تھی عملیات کا سارا سامان استاد نے صبح ہی منگوا لیا تھا۔ استاد نے مجھے الو منتر اور دیوی راس کا کالا علم سکھانے کے لئے خصوصی انتظام کئے تھے۔ وہ رات میں نے استاد مراد کے ساتھ عملیات کرتے ہوئے گزاری اور پھر میرا معمول بن گیا اور جب مجھے استاد مراد کے ساتھ جاتے ہوئے سات دن مکمل ہو گئے تو استاد مراد نے پدمنی کو میرے سامنے حاضر کیا اور اس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی انتقام بھری باتوں سے میں وقتی طور پر خوف زدہ ہو گیا لیکن استاد مراد کا لہجہ بہت زیادہ سخت اور کرخت تھا۔ استاد مراد پدمنی کو زیر نہیں کر سکا تھا۔ جب اس نے بہت سی باتوں کا انکشاف کیا تو میں نے دوسرے دن لاہور اپنے والد صاحب میاں جی سے رابطہ کیا انہوں نے سختی سے کہا کہ اب بھی وقت ہے کہ بچوں کو واپس لاہور لے آ اور اپنا جدی پشتی کام سنبھال لے۔ میری زندگی کا شاید یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی باتیں میرے ذہن میں جم گئیں۔ اور نہ چاہتے ہوئی بھی میرا دل چاہا کہ میں اسی لمحے اپنے والد کے پاس پہنچ جاؤں اور ان سے معافی مانگ لوں۔ تاہم ان کی باتوں سے مجھے حوصلہ ہوا۔ استاد مراد نے بھی اپنی زبان میں میاں جی سے عملیات کے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔ پدمنی کے بارے میں انکشافات کئے جنھیں سن کر میرے رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔ میرے دل میں پدمنی کو نیست و نابود کرنے کا جوش پیدا ہو گیا اور میں سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے پدمنی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان دنوں ایران کے سیاسی حالات انقلاب ایران کی وجہ سے بہت زیادہ خراب تھے کرفیو اور فوج کی سختیوں کی وجہ سے کہیں آنے جانے اور بیرون ملک سفر پر مشکلات کا سامنا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں اور جلسے جلوسوں کی وجہ سے کالج بھی بند تھے اور لوگ انقلاب ایران کی تیاریوں میں مصروف تھے میں نے انقلاب ایران اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے شاہ ایران کو جان بچا کر ملک سے بھاگتے ہوئے امام خمینی کی ملک آمد پر پوری ایرانی قوم کا ان کو خوش آمدید کہنا جگہ جگہ لوگ بکرے ذبح کر رہے تھے پھول نچھاور کر رہے تھے بلکہ ایرانی کرنسی جس پر شاہ ایران رضا شاہ کی تصاویر تھیں ان کو پھولوں کی جگہ سڑکوں پر پھینک رہے تھے اور لوگ اوپر سے گزر رہے تھے۔

انقلاب ایران کے تقریباً دو ماہ بعد میں نے والد صاحب کے اسرار اور اپنے دونوں بچوں کے تاریک مستقبل کو دیکھتے ہوئے واپسی کا پروگرام بنا لیا اور تقریباً ایک ہفتے کے اندر میں والد صاحب کے پاس لاہور میں تھا۔ یہاں آ کر چھ ماہ ادھر ادھر بھٹکتا رہا کبھی میاں جی کے استانے پر چلا جاتا اور کبھی استاد مراد کے ساتھ راوی کے کنارے پر چلا جاتا۔ لیکن دل ایک جگہ ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔

ان دنوں میں والد صاحب کے شاگرد افضل کے پاس رہنے کے لئے گاہے بگاہے سے گھر آنے لگے۔ اسی دوران میری تیسری بچی کی ولادت ہوئی۔ افضل کے ساتھ میرا کچھ دل لگ گیا تھا۔ لیکن کام میں دلچسپی وہی رہی جو استاد مراد کے ساتھ تھی کوئی خاص لگاؤ پیدا نہ کر سکا چھوٹی بچی تقریباً چھ ماہ کی ہو چکی تھی۔ میں ملتان میں افضل کے پاس مجھے اطلاع ملی کہ تمہاری چھوٹی بیٹی چھت سے گر کر فوت ہو گئی ہے۔ میں حیران ہوا کہ اتنی چھوٹی بچی کس طرح چھت سے گر گئی ہے۔ فوراً ہی لاہور واپس آیا بیوی نے بتایا کہ میں چھت پر کھڑی تھی کہ وہی عورت پدمنی جس نے ایران میں میرے بیٹے کے ہاتھ سے پستول چھین کر اسکا سپرنگ اسکی آنکھوں میں دے مارا تھا میرے ہاتھ سے میری بچی کو چھین کر نیچے صحن میں پھینک دیا۔ اتنی چھوٹی بچی کو جب ایک منزل سے نیچے پھینکا گیا تو اس کے دماغ اور جسم کی تمام ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ صحن اور دیواریں خون کے چھینٹوں سے بھر گئیں اور بچی نے موقعہ پر ہی دم توڑ دیا۔

اس ناقابل برداشت واقعہ نے میرے دل اور ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور مجھے اس بات کا پوری طرح یقین ہو گیا کہ ہمارے خاندان کی دشمن پدمنی نے میرے تینوں بچوں کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا ہے ہو سکتا ہے اس کا اگلا وار میری بیوی پر ہو۔ یہ سوچ کر خوف کی ایک لہر میرے سارے بدن میں سرایت کر گئی۔ لیکن میں نے دل میں پدمنی کو نیست و نابود کرنے کا پکا ارادہ کر لیا اور اپنے اس ارادے کے متعلق میاں جی کو آگاہ کر دیا۔ میاں جی میرے کام میں دلچسپی اور توجہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ استاد مراد بھی کچھ مہینوں بعد ایران سے واپس لاہور آ گیا اور اس طرح میاں جی کے ساتھ ساتھ استاد مراد کے ساتھ میرا چلوں اور عملیات کے لئے راوی کے کنارے، قبرستانوں اور ویران جگہوں پر جانا معمول بن گیا۔ میں سارا سارا دن رات آنے کا انتظار کرتا رہتا۔ مغرب کے بعد فوراً میں چلہ کشی کا تھیلا اٹھا کر دیکھتا کہ اس میں کسی چیز کی کمی تو نہیں ہے۔ اور عشاء ہونے سے پہلے ہی اپنی منزل کا رخ کرتا اکثر چلے اور عملیات میں میں نے اپنے والد میاں محمد اشرف کے ساتھ کئے لیکن بعض بہت خطرناک اور ناقابل واقعات استاد مراد کی موجودگی میں میرے ساتھ پیش آئے۔ میرے والد استاد مراد سے اکثر اوقات میری دلچسپی اور کامیابی کے بارے میں پوچھتے رہتے اور میری دلچسپی اور شوق کو دیکھ کر خوش ہوتے۔

آخر میری زندگی میں وہ وقت آہی گیا جب میں نے پدمنی کو پہلی بار پکڑنے کے لئے میانی صاحب میں چلہ کاٹا مگر وہ دغا دے گئی۔ لیکن چند روز بعد میں نے ملتان کی ایک درگاہ میں جا کر چلہ کاٹا اور اسے اپنے بزرگوں کی عطا کردہ روحانی قوتوں کے ذریعے پکڑ لیا۔ میں نے پدمنی کو اذیت ناک موت مارا اور اسکی صدیوں بھٹکتی آتما کا کریا کرم کر کے اسکی راکھ اسی درگاہ کے ایک کونے میں دبا دی۔ پدمنی کی ہلاکت کے بعد میرے خاندان نے سکھ کا سانس لیا اور پھر میں نے پراسرار قوتوں کی حقیقت اور طاقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس پیشہ کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا میں نے زندگی میں لوگوں کو پدمنی جیسی بہت سی بدروحوں کے وبال سے بچایا۔

عمران اور پومی ذرا بڑے ہوئے تو ان کی تعلیم کے بارے میں فکر لاحق ہوئی۔ راوی روڈ پر سن شائن سکول فار بلائنڈ تھا۔ ان دنوں لڑکے لڑکیاں اسی سکول میں اکھٹے پڑھتے تھے۔ نابینا افراد کے لئے الگ سکول لاہور میں نہیں تھا۔ بچوں کو تعلیم کے حصول کے لئے میں نے اس سکول میں داخل کروا دیا۔ بچوں کی رہائش کا بندوبست بھی سکول ہوسٹل میں ہی تھا۔ دونوں بچے وہاں ہی رہنے لگے۔ بچوں کی جدائی ماں سے برداشت نہ ہو سکی تو وہ بیٹی کی یاد میں دن رات رونے لگی۔ میری بیٹی تو اپنے آپ کو اس ماحول میں ایڈجسٹ نہ کر پائی اور تھوڑے عرصے کے بعد گھر آ گئی لیکن عمران کو وہاں کا ماحول راس آ گیا۔ ویسے تو اس سکول کے سارے استاد ہی بہت اچھے اور خوش اخلاق تھے لیکن عمران کے دو استاد ارشد صاحب اور فرخ صاحب کی عمران سے خاص شفقت نے اس کو کامیابی کے بہت قریب پہنچا دیا۔ دونوں استاد موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ پیانو، ہارمونیم، اور ڈھولک کے ماہر تھے۔ گلوکاری میں اپنا نام رکھتے تھے۔ عمران نے میٹرک کے ساتھ ساتھ فن موسیقی اور گلوکاری میں بھی مہارت حاصل کی۔ میٹرک کے بعد میاں جی نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر عمران کو علم نجوم کے ساتھ ساتھ حکمت کی تعلیم بھی دی جائے تو یہ بہت زیادہ نام کمائے گا۔ اپنی اس خواہش کا اظہار کرنے کے بعد میاں جی تو دنیا میں نہ رہے لیکن میں نے انکی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے طبیہ کالج لاہور میں داخلہ لے دیا جہاں چار سالہ کورس کے بعد اس نے شاندار کامیابی حاصل کی اور اول درجہ کی سند سے افروز ہو گیا۔

اس بات کو کئی سال بیت چکے ہیں۔ عمران ناگی اب ایک کامیاب حکیم اور نجومی بن کر خدمت خلق میں مصروف ہے۔ اسکی مرض شناسی کا عالم یہ ہے کہ بغیر کچھ بتائے صرف نبض چیک کرتے ہوئے ہی مریض کو ایسی ایسی باتیں بتا دیتا ہے جو ڈاکٹر میڈیکل ٹیسٹوں کے بعد کنفرم کرتے ہیں۔ علم نجوم اور عملیات میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ حکمت میں بھی کامیابی کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں ہمارے جنات آتوم اور طرطوش کا بھی ہاتھ ہے۔ اور میاں جی نے حکمت میں دلچسپی شاید اسی بنا پر ظاہر کی تھی۔ لیکن ایک بات کا دکھ ضرور ہے کہ میاں جی اس دنیا میں ہوتے تو آج اپنے بیٹے اور پوتے کی کامیابی دیکھ کر خوش ضرور ہوتے اور میں انہیں بتاتا کہ آپ کے بیٹے اور پوتے نے آپکی کوشش کو نہ صرف جاری رکھا ہے بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا عرفان ناگی ایران سے واپس آنے کے دو سال بعد پیدا ہوا تھا۔ اسکو بھی میں نے میاں جی کی خواہش کے مطابق ہومیوپیتھک کا کورس کروایا ہے اور وہ بھی دوا اور دعا سے دکھی انسانیت کی خدمت میں مشغول ہے۔ ڈاکٹر عرفان ناگی شروع ہی سے علوم نجوم دست شناسی اور روحانی و مخفی علوم میں دلچسپی رکھتا تھا جب کبھی سکول سے چھٹی ہوتی تو میرے ساتھ آستانہ پر چلا آتا اور مجھ سے ان علوم کے بارے میں مختلف سوالات کرتا رہتا تھا جبکہ میرا تیسرا بیٹا فیضان ناگی جو آجکل میٹرک میں پڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ علوم مخفی اور روحانیت کے بارے میں بھی درس سنتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے بابا کی طرح خدمت انسانی کا کام کرنا ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھ جیسے باغی کو تابعدار اور ذہین اولاد دی ہے جو اپنے باپ کی علمی وراثت کو لے کر آگے چل رہی ہے۔ اگر مجھے ذاتی تجربات سے واسطہ نہ پڑتا تو شاید ناخلف اولاد کی طرح اپنے بزرگوں کے فیض کو ترستا رہتا۔

قرآنی وظائف

وظائف، عملیات کی دنیامیں میں داخل ہوتے ہی میاں جی نے جو پہلا کیس میرے سپرد کیاوہ بذات خود میرے لئے امتحان کادرجہ رکھتا تھا۔ یہ سینچر کا روز تھا۔ میاں جی نے مجھے آستانے پر بلایااور کہا کہ ایک کیس آیا ہے جس میں دوافراد کے درمیان عداوت ڈالنی ہے۔ میری نظر میں یہ منفی کام تھا۔ میں نے عہد کیا تھا کہ میں کبھی ایسا کیس نہیں پکڑوں گا جس میں محبوب آپ کے قدموں میں، طلاق دلوانا، عورتوں کو بدکاری پر مجبور کرنا، کسی کو بیمار کرنا یا جان سے ماردینا۔ میری نظر میں دوانسانوں کے درمیان عدوات پیدا کرنا بھی ایک جرم تھا۔ میاں جی مجھے قائل کرتے رہے مگر میں نے انکار ہی کیا۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ جس عورت نے مجھے یہ کیس دیا ہے تم خود اس سے مل لو۔ وہ عورت شام کو آستانے پر آئی۔ اسکی عمر پچیس سال تھی۔ رنگ گوراور سرخ تھا۔ دیکھنے میں پٹھانی لگتی تھی مگر وہ پنجابی کشمیرن تھی۔ نہایت بااخلاق اور سلجھی ہوئی عورت تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ کسی بغض کی وجہ سے یہ کام نہیں کرانا چاہتی۔ در حقیقت اس کا شوہر اپنے ایک دوست کے ساتھ اتنی محبت کرتا تھا کہ اپنے دوست پر خون کے رشتے بھی قربان کر دیتا تھااور تواور اسکا دوست اس بے چاری کو بھی غلیظ نظروں سے دیکھتا تھااور اسے بدکاری پر مجبور کرتا۔ وہ کہتا کہ اگر اس نے اسکی سفلی خواہش پوری نہ کی تو وہ اسکے شوہر یعنی اپنے دوست (عورت کے شوہر) کو اس سے متنفر کر کے طلاق دلوادے گا۔ عورت عفت مآب تھی۔ اس نے اپنی سہیلی سے یہ مسئلہ بیان کیا جو میاں جی کو جانتی تھی۔ وہی اسے لیکر آستانے پر آئی تھی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر التجا کرتی رہی کہ خدا کے لئے میرے شوہر کو ایک بدکار دوست سے چھڑایا جائے۔ کیونکہ اس نے اپنے دوست پر گھر کا سکون اور ساری دولت بھی قربان کر دی تھی۔ اسکی دلگداز داستان سن کر میرا دل پسیج گیااور میں نے اس کے شوہر اور اسکے دوست کے درمیان عدوات پیدا کرنے کے لئے ایک وظیفہ پڑھا۔ یہ وظیفے دو طرح کے تھے۔ ایک وظیفہ برائے دشمنی عداوت اور دوسرا حب باہمی۔

نوری علم کا یہ وظیفہ اس مقصد کے لئے زوراثر قوت رکھتا ہے۔ لہذا میں نے اس عورت کے شوہر اور اسکے دوست کی ابلیسی قوتوں کو قابو میں کرنے کے لئے 3 روز تک وظیفہ کیا۔ میں نے سورۃ تبت تین روز تک دو قبروں کے درمیان بیٹھ کر 72 مرتبہ پڑھی اور پھر سات ایسے مقامات کی مٹی حاصل کی جہاں ابلیسی اور جناتی طاقتوں کا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ اس دوران میں نے عورت سے اسکے شوہر اور اسکے بدکار دوست کے کوائف لیکر زائچہ بنا لیا تھا۔ اور اسکے سیاروں کی پوزیشنیں دیکھ کر انکے حب ومال پر بندش لگادی تھی۔ میں نے جن سات مقامات کی مٹی حاصل کی وہ یہ تھے۔

۔۱ گدھالوٹ جس جگہ پر گدھااور خچر لیٹتے ہیں

۔۲ پنجہء چیل چیل کے گھونسلے کے آس پاس کی جگہ جہاں وہ بیٹھ کر مردار کھاتی ہے

۔۳ قبر

۔۴ ویران مسجد

۔۵ ویران کنواں

۔۶ چوراہا

۔۷ مرگھٹ

چلہ پورا کر کے ساتوں مقامات کی مٹی پر دم کیااور پھر اس بدکار شخص کے مکان میں پھینک دی جو عورت کے شوہر کو گمراہ کرتااور اسے بدکاری پر اکساتا تھا۔

اس کے بعد میں نے عورت سے اسکے شوہر کی کھانے کی پسندیدہ شے پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ روزانہ رات کو دودھ جلیبیاں کھاتا ہے۔ میں اگلے جمعہ وار تک ایک وظیفہ پڑھ کر جلیبیاں دیتا رہا۔ وہ وظیفہ یہ تھا۔

یا طھموتا

اس وظیفہ کی خصوصیت یہ ہے کہ جس کو بھی ستر بار کھانے کی شے پر دم کر کے کھلایا جائے اسکی محبت اور توجہ حاصل ہو جاتی ہے۔اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ایک ہفتہ بعد اثرات ظاہر ہونے لگے اور میرے اس عمل سے عورت کی گھریلو زندگی بچ گئی

میاں جی نے مجھے چند ایسے وظائف بتائے تھے جو نسل در نسل مجھ تک پہنچے تھے۔میں نے کبھی ان وظائف کو سینہ میں دبا کر نہیں رکھا بلکہ مفاد عامہ کے تحت ان کا پرچار کرتا رہا ہوں۔ان میں سے چند ایک مسائل کے لئے وظائف تحریر کر رہا ہوں۔تاکہ قارئین اگر خود استفادہ کرنا چاہیں تو انہیں کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے۔

ہر طرح کی مصیبت اور بیماری سے نجات

مصیبت اور بیماری ہر مسلمان کے لئے آزمائش ہوتی ہے۔اس لئے دواؤں کے ذریعے علاج کے علاوہ اگر صرف اس وظیفہ و دعا کی وساطت سے اللہ تعالی سے عاجزی سے شفا و نجات مانگی جائے تو رب رحمن کریم اپنے فضل سے مصیبت زدہ اور بیمار شخص اور گھرانے کی آزمائش کی گھڑی کو ختم فرمائے گا۔

یہ قرآن پاک کی آیت ہے۔جس کا ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ ختم پڑھنا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔اَمن یجیب المضطر اذا دعاہ و یکشف السوء

ختم شریف پڑھنے کے لئے پانچ سات نو اور گیارہ لوگ ہونے چاہئیں۔ختم شریف کے بعد حسب توفیق شیرینی پر فاتحہ پڑھنے کے بعد بچوں میں تقسیم کر دی جائے اور اسکے بعد مصیبت زدہ یا بیمار انسان کے سر پر ہاتھ رکھ کر سات یا نو مرتبہ مذکورہ آیت مبارکہ پڑھ کر دم کرے تو انشاءاللہ مراد پوری ہو گی۔اس وظیفہ کا عمل تین مرتبہ سے زیادہ نہیں کرنا چاہیئے۔

☆☆☆☆ختم شُد☆☆☆☆